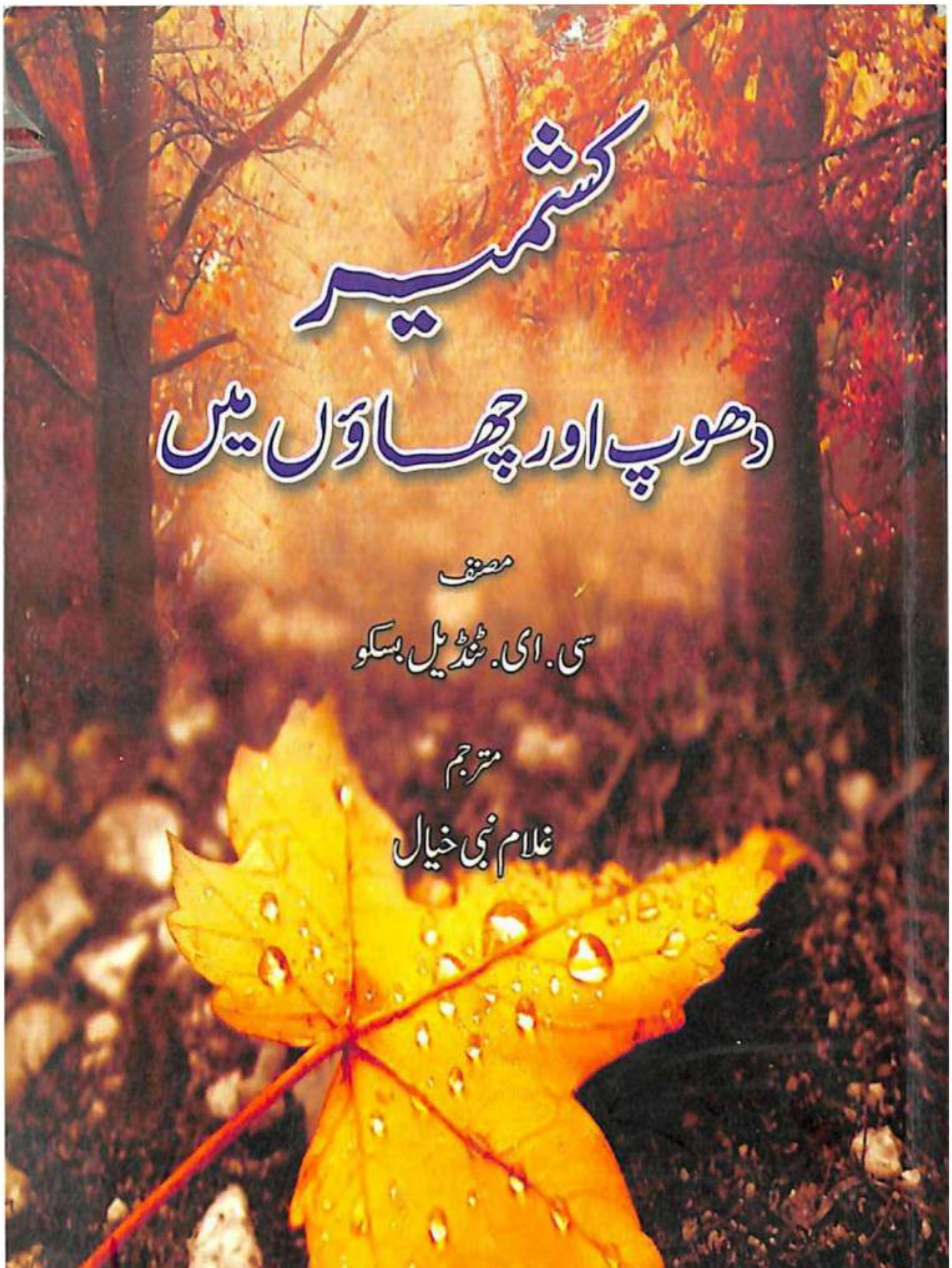
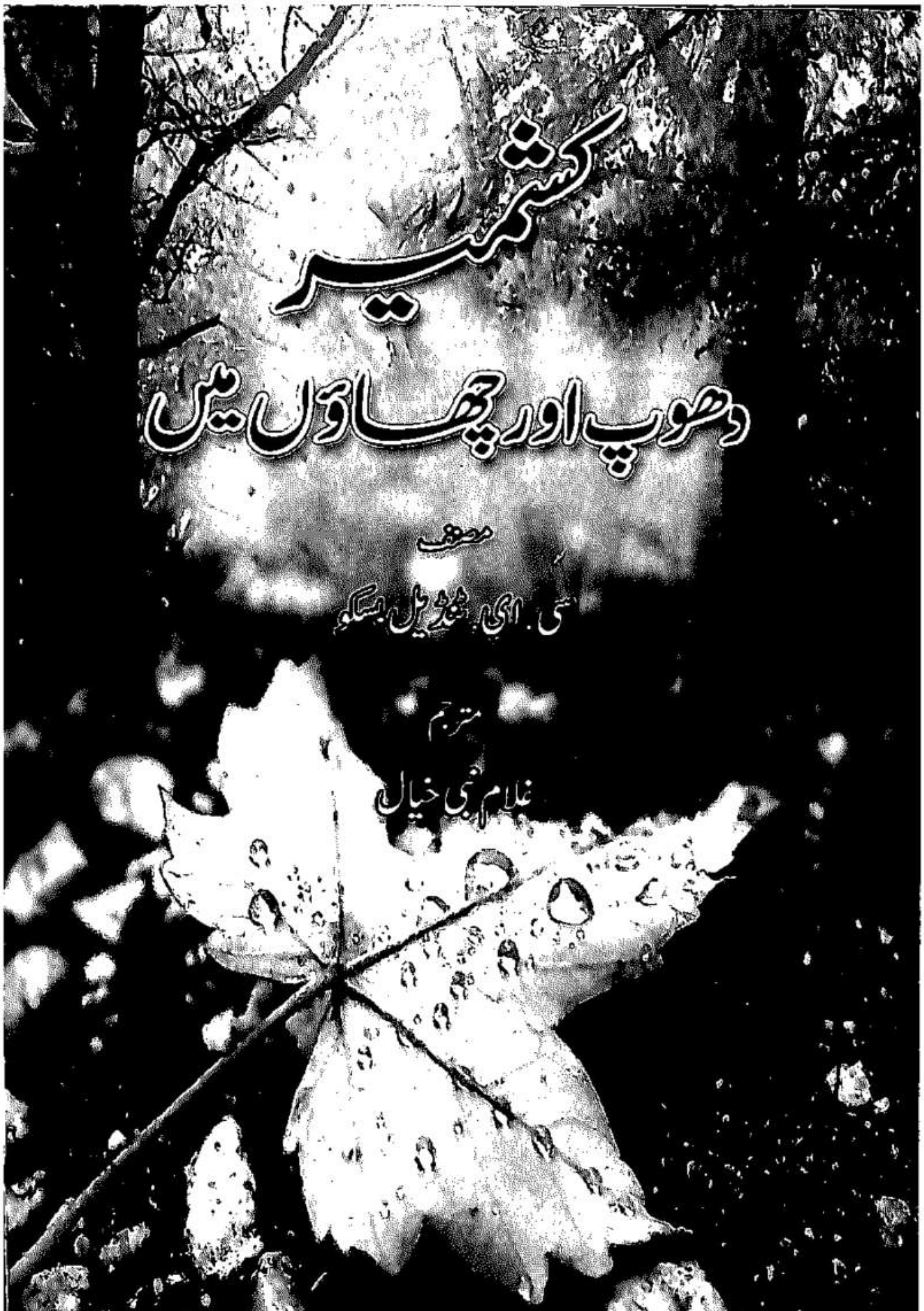

کشمیر
دھوپ اور چھاؤں میں
مصنف
سی. ای. ٹنڈیل بسکو
مترجم
غلام نبی خیال


کشمیر
دھوپ اور چھاؤں میں
مصنف
سی. ای. ٹنڈیل بسکو
مترجم
غلام نبی خیال

کشمیر

دھوپ اور چھاؤں میں

مصنف

سی. ای. ٹنڈیل بسکو

مترجم

غلام نبی خیال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت : 2015
تعداد : 550
قیمت : -/132روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1859

Kashmir Dhoop Aur Chhaon Mein
(Kashmir in Sunlight & Shade)
Author: Cecil Earle Tyndale Biscoe
Translated by: Ghulam Nabi Khayal

ISBN :978-93-5160-091-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

پیش نامہ

دُنیائے مغرب سے خاص کر انیسویں صدی عیسوی میں جو مستشرقین، سیاح، تاریخ دان، آثارِ قدیمہ کے ماہرین، عیسائیت کے مبلغ اور اہلِ دانش و بینش وقتاً فوقتاً وارِدِ کشمیر ہوئے، اُن میں سے اکثر و بیشتر نے اپنے رشحاتِ قلم، سفر ناموں، یادداشتوں اور تاریخ کی تصانیف میں اس خطۂ ارضی کے حسنِ فطرت، قدیم تاریخ، انسانی خصائل و کردار، سیاسی کوائف، سماجی رسوم و رواج اور شخصی راج کے تحت اہلِ کشمیر کی نکبت و افلاس کی درد بھری داستانیں واضح طور پر بیان کی ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے بارے میں ان تحریروں کی عالمی سطح پر خاصی پذیرائی ہوئی ہے اور انھیں بے لاگ اور بہترین اظہارِ خیال کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں مصنفین نے انتہائی غیر جانبداری اور ذاتی مشاہدے کے پیشِ نظر وہ حالات و محسوسات صفحۂ قرطاس پر درج کیے ہیں جو بعض اوقات کشمیری قوم کے لیے باعثِ اضطراب بھی بنے ہیں لیکن ان اہالیانِ قلم نے اپنی حق بیانی میں کسی مصلحت یا ذاتی تعصب کا اظہار نہیں کیا ہے جیسا کہ تاریخِ کشمیر کے حوالے سے گزشتہ چھ سات دہائیوں میں سارے برصغیر میں حقائق کو مسخ کرنے اور اہلِ کشمیر کو ہر طرح ہدفِ تنقید بنانے کا ایک کشمیر دشمن سلسلہ جاری رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی تاریخ

میں سیاسیات، سماجیات، اخلاقیات، ادبیات، تہذیب اور ثقافت کے کئی حقائق ابھی تک حقیقت بیانی اور صحیح تحقیق وتلاش کے نتیجے میں واضح نہیں ہو سکے ہیں۔

ان درجنوں مغربی اہالیان قلم میں جنھیں سب سے زیادہ شہرت کشمیر میں نصیب ہوئی وہ ''کشمیر کی وادی'' کے مصنف سر والٹر لارنس اور زیر نظر کتاب کا قلم کار مسٹر ٹنڈیل بسکو ہیں۔ مقامی طور پر اسی مقبولیت کے نتیجے میں انھیں لارنس صاحب اور بسکو صاحب کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔

اس کی خاص وجوہات یہ ہیں کی جہاں لارنس نے کشمیریوں کی زبوں حالی اور ان کی پس ماندہ زندگیوں کا حال مفصل طور پر بیان کیا وہاں بسکو نے ایک پادری کی حیثیت میں کشمیر آ کر یہاں تعلیم کے شعبے میں ایک انقلاب بپا کیا۔ جس کی تفصیلات اس نے خود اس کتاب میں بیان کی ہیں۔ اس مقدس مشن کو آگے بڑھانے میں بسکو نے لاتعداد مصائب اور مشکلات خاص کر توہم پرست اور جاہل کشمیری برہموں (پنڈتوں) کے ہاتھوں جھیلیں۔ پھر بھی اس کے صبر و استقلال میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اس حوالے سے وہ بیان کرتا ہے: ''یہ برہمن لڑکے اُن سرکاری کارندوں کے بیٹے یا پوتے تھے جنھوں نے سالہا سال تک کشمیری کاشتکاروں کو گذشتہ برسوں میں اپنے استبداد اور ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ شہر میں ان استحصالی عناصر کے بڑے بڑے مکانات اور بے حساب دولت اس بات کی صاف گواہ تھی کہ انھوں نے کس طرح لوٹ مار سے یہ سب کچھ حاصل کیا تھا کیونکہ جو تنخواہیں انھیں سرکار سے ملتیں وہ اس ٹھاٹھ باٹھ کے لیے بہت کم تھیں۔ ان کے والدین نے انھیں اسی غرض سے اسکول بھیجا تھا کہ وہ بھی سرکاری ملازمتیں حاصل کریں اور اپنے بڑوں کی طرح رشوت ستانی کا بازار گرم کریں۔ انگریزی زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے آباواجداد سے بھی زیادہ مرتبہ پا سکتے تھے۔

''اب اس بے ہودگی پر کیسے قابو پایا جا سکتا تھا؟

''یہ صرف اسی طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ انھیں غلط سے نفرت اور صحیح سے محبت کرنا، زور زبردستی کی مخالفت اور کمزوروں سے پیار کرنا سکھایا جائے۔ یعنی اس کے سراسر برعکس زندگی

گزارنے کی ترغیب دی جائے جواُن کے بزرگوں نے بسر کی تھی''۔

مزید برآں بسکو نے اپنے مشن کے تحت چلائے جانے والی تمام درس گاہوں میں نصابی تعلیم کے علاوہ مہم جوئی، کھیل کود، سڑکوں کی صفائی، سیلاب زدگان اور وبائی بیماریوں کے شکار لوگوں کی امداد اور کشتی رانی کی سرگرمیوں کو بھی بڑھاوا دیا اور اپنے عملے کے افراد اور طلبا کو مشکل ترین مہمات اور دریائی کھیلوں اور دوڑ کے مقابلوں میں پے در پے شامل کر کے مقامی تعلیم یافتگان کو بھرپور زندگی جینے کا بھی درس دیا۔ وہ اسی تصنیف میں 'مُہمات'' کے باب میں کہتا ہے: ''اپنی ساری مہمات کے دوران ہم ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ ہم ہر دن کا بھرپور استفادہ کریں اور نئی نئی باتوں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ مقصد یہی تھا کہ ہمارے طلبا کی آئندہ نسلیں شجاعت اور ہمت کی مالک بن سکیں۔ اس سے قبل کسی طالب علم کے باپ ۔ نے ایسی مہم بازی نہیں کی تھی لہٰذا ہماری خواہش کے مطابق نئی نئی باتوں کو وجود میں لاتا تھا''۔

اس دور میں خاص کر کشمیری برہمن طبقہ دریا میں کشتی رانی کو ایک حقیر کام تصور کر کے اس سے ہمیشہ کنی کترانے کے لیے بہانے بناتا تھا۔ بسکو نے اس فرسودہ نظریے کو رد کرنے کی غرض سے اور طلبا میں حرارت اور عمل سے بھرپور زندگی کا جذبہ ابھارنے کے لیے کشتی رانی کو متحرک طرزِ حیات کا ایک لازمی جز قرار دیا۔ باوجود اس کے کہ اس کوشش میں اس کی راہ میں بار بار روڑے اٹکائے گئے مگر اپنی دھن کا پکا یہ مغربی ماہرِ تعلیم مشنری اپنے ہر اس عمل میں آخرکار کامیابی سے ہمکنار ہوا جس کا بنیادی مدعا کشمیری طالب علموں اور اساتذہ کے دلوں پر دوسروں کے تئیں ہمدردی، کمزوروں کے ساتھ رحم دلی اور حیوانوں تک کی حفاظت کے محسوسات کو ثبت کرنا تھا۔ اس کی نظروں میں یہ سب اسی وقت ہو سکتا تھا جب اس کے عملے اور مدارس کے طلبا جسمانی طور پر تندرست اور چوکنے ہوں۔

سیسل ایرلی ٹنڈیل بسکو 9 فروری 1863 کو انگلستان میں پیدا ہوا۔ 1890 میں وہ کشمیر آیا اور آتے ہی یہاں سے۔ ہنٹن نوولز سے مشن اسکولوں کی نگہداشت کا فریضہ سنبھالا۔ پادری بسکو یکم اگست 1949 کو انتقال کر گیا۔ اس کی موت روڈیشیا افریقہ میں واقع ہوئی۔ سری نگر میں فتح کدل کے مقام پر جس جگہ مشن اسکول کا کچھ حصہ راستے کی کشادگی کی وجہ سے منہدم کیا

گیا تو اُس جگہ ایک نیا پل تعمیر کیا گیا جس کے افتتاح کی تقریب پر شیخ محمد عبداللہ نے اسے بسکو پل کا نام دیا۔ وہاں پر ایک کتبہ بھی نصب کیا گیا جس پر یہ تحریر کندہ تھی:

''عزت مآب پادری سی۔ ای۔ ٹنڈیل بسکو، کشمیر میں تعلیم کا ایک عظیم معمار''۔

بسکو کے وارد کشمیر ہونے کے بعد اس کی مساعی سے سارے کشمیر میں تعلیم کو لوگوں نے ایک نصب العین کی طرح اپنایا اور اس کی سب سے زیادہ توجہ اس بات کی طرف مرکوز ہوئی کہ خاص کر اُن طبقوں کو علم و آگہی کی ودیعت ہو جو مختلف بہانے بنا بنا کر اس ابدی نور سے محروم ہی رہنا چاہتے تھے، اس سعی جمیلہ کا نتیجہ اہل کشمیر نے دیکھا جب ہر فرقے کے نوجوان اس میدان میں آگے بڑھنے کی تگ و دو میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جد و جہد کرنے لگے۔

بسکو کے وقت میں یا اس کے بعد سری نگر میں تین اسکول سب سے زیادہ مقبول عام ہوئے۔ کشمیری مسلمانوں کے لیے خاص طور پر قدیم شہر میں 1866 میں اسلامیہ ہائی اسکول کی شروعات ہوئی تھیں جس کی بنیاد مولوی غلام رسول شاہ نے ڈالی تھی۔ اس کے بعد نیشنل ہائی اسکول شہر کے وسط میں کرن نگر کے علاقے میں 1932 میں شروع ہوا جہاں زیادہ تر کشمیری پنڈت لڑکے زیر تعلیم تھے۔ بسکو نے جو مشن اسکول قائم کیا، اول الذکر دونوں درس گاہوں کے مقابلے میں اس کی شان اور بان برابر قائم ہے۔ اسلامیہ اسکول بہت حد تک غیر تعلیمی سرگرمیوں اور ناقص تدریسی نظام کی وجہ سے ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکا اور 1990 میں کشمیر میں حالات کے بگڑ جانے کے ساتھ ہی کشمیری پنڈتوں نے یہاں سے ہجرت کی اور نیشنل اسکول بھی اس غیر متوقع صورت حال سے متاثر ہو کر وقت کے ہاتھوں اپنی ساخت کھو بیٹھا۔

سی۔ ایم۔ ایس کا پہلا اسکول دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر فتح کدل میں غریبوں کے علاقے میں ''کشمیری لوک کہانیاں'' نامی کتاب کے مصنف پادری جے۔ ہنٹن۔ نوولز نے قائم کیا۔ اس مرکزی مدرسے کے ساتھ اس سے ملحق اسکول رعناواری، نوا کدل، حبہ کدل اور امیرا کدل میں اور ایک ہائی اسکول اننت ناگ میں قائم ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک بسکو نے چھ اسکول قائم کیے تھے جن میں طلبا کی تعداد ایک ہزار آٹھ سو تک پہنچ چکی تھی۔ 1912 میں اسے قیصر ہند کا تمغہ دیا گیا۔

کشمیر میں ستاون سال تک بے لوث اور بے لاگ خدمات انجام دینے کے بعد بسکو 19 اکتوبر 1947 کو سری نگر سے چلا گیا۔ اس وقت سارے ملک کشمیر میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اسکول کے عملے کے تیس اشخاص نے اس کی گاڑی کو شیخ باغ سے لے کر امیرا کدل کے بس اڈے تک ہاتھوں سے کھینچا۔ اس کے آگے آگے اسکول کا باجا بج رہا تھا۔ اس راستے پر لڑکوں اور سابقہ اساتذہ نے دورویہ قطار باندھ کر اپنے اس محبوب رہبر تعلیم کو الوداع کہا۔ اس کے بعد جب روڈیشیا میں اس کا انتقال ہوا تو اس سے پہلے وہ بار بار یہ دعا پڑھتا رہتا:

اگر خدا میرا امر ہے تو مجھے کس سے ڈرنا ہے؟
انسانیت کی خدمت اصل عبادت ہے
تم جس طرح اپنے آپ سے پیار کرتے ہو
اُسی طرح اپنے ہمسائے سے بھی محبت کرو
ایک مچھلی ہمیشہ لہروں کے مقابل تیرتی ہے
ہتھیلی سہلانے کے لیے اور مکہ لڑنے کے لیے ہیں۔

بسکو کی بیوی کا اس سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ جب بستر مرگ پر تھا تو اس کی بہن اس کی سانس کو درست کرنے کے لیے نزدیک آئی۔ بسکو نے اس سے کہا: "اب میں ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔ آپ براہ کرم جا سکتی ہیں"۔ یہ بسکو کے آخری الفاظ تھے۔

یہ وہ شہر آشوب دن تھے جب برصغیر ہند دو ممالک میں تقسیم ہوا تھا اور بنگال سے لے کر پنجاب تک ہندو اور مسلمان وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے تھے۔ بسکو نے دہلی میں اپنی آنکھوں سے ایک ہزار لوگوں کو قتل ہوتے دیکھا جن میں مختلف مذاہب کے مرد وزن، بچے، بوڑھے، ناتوان، بیمار، بے سہارا اور بے کس غریب اور خواتین شامل تھیں۔ بسکو نے غالباً اسی خوں ریزی کے دہشت ناک ماحول سے دور ہونے کی خاطر دہلی کو فوراً خیر باد کہا اور پھر پاکستان سے ہوتے ہوئے واپس چلا گیا۔ اگر بسکو کچھ اور دن اس خون آشام ملک میں ٹھہرتا تو وہ غالباً ایک اور کتاب تحریر کرتا جس کے صفحات پر انسانی خون کے دھبے جلی حروف کی شکل میں نظر آجاتے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں کشمیر ایک شاہی ریاست تھی جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اس پر مہاراجہ اور اس کی ہندو اقلیت راج کر رہی تھی۔ مہاراجہ نے کئی معاملوں میں مقامی طور پر مطلوبہ اہل کاروں کی عدم موجودگی کی وجہ سے برطانوی اور یورپی ماہروں کی خدمات حاصل کیں۔ جب بسکو نے بھی یہاں کے ناگفتہ بہ حالات میں ذات پات کی لعنت کو شعبۂ حیات پر حاوی دیکھا تو اس نے اپنے عیسائی خیالات کے سہارے کشمیری عوام کی حالت سدھارنے کی شروعات کیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ستائش ہے کہ اس نے اپنے دوسرے ہم مذہبوں کی طرح یہاں کے لوگوں پر عیسائی مذہب قبول کرنے کے لیے کوئی زور زبردستی نہیں کی۔

رابرٹ تھورپ کی طرح بسکو بھی مظلوم کشمیریوں کی حیوانی زندگی کے جان کاہ مناظر دیکھ کر بے حال ہوتا تھا۔ اس ضمن میں وہ شخصی راج کے بے رحم حکمرانوں اور ان کے مقامی برہمن کارندوں کی بہیمانہ کارروائیوں اور مسلم غربا پر ان کے تابڑتوڑ مظالم پر نوحہ خوان تھا۔ تھورپ کو اسی لیے اُس نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

''شہر کے اولین پل امیرا کدل کے پاس شیخ باغ میں عیسائیوں کا قبرستان ہے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں تو رابرٹ تھورپ کے احترام میں اپنی ٹوپی اتارتا ہوں جس نے کشمیریوں کے لیے اپنی جان قربان کی''۔

ایک سرکردہ ماہر تعلیم امرناتھ مٹو نے بسکو کی طرف سے تعلیم کو ایک نئی اور جدید جہت دینے کے بارے میں لکھا ہے: ''آج کل کے تعلیمی اداروں میں طلبا کی کارگزاری کی رپورٹیں اصل میں مسٹر بسکو کی مرہون منت ہیں، جنھوں نے پہلی بار کشمیر میں ''کریکٹر فارم سسٹم'' کو متعارف کرایا جو ہر طالب علم کو سال میں دو بار دیا جاتا تھا یہ کاغذ کا ایک لمبا ورق ہوتا تھا جس میں مختلف اندراجات سے 'جسم، روح اور دماغ' کے عنوانات کے تحت نمبر دیے جاتے تھے۔ مسٹر بسکو بہ نفس نفیس یہ فارم طلبا کو ان کے فارم ماسٹروں کی موجودگی میں دیتے تھے اور پوچھتے تھے کہ کیا یہ نمبرات صحیح ہیں؟''

اس نئی طرح کے امتحانی تجربے سے بسکو کی مراد یہ تھی کہ طلبا میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور طبعی دنیا کے اندرون میں جھانک کر ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے نکھارا جائے اور انھیں بہتر سے بہترین بنایا جائے۔

والٹر لارنس کی طرح مغرب کے کئی اور کشمیر شناسوں نے بھی اس خطے کے ہر فرقے یا طبقے کے لوگوں کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے ساتھ مختلف آراء جوڑی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کے بیانات کو بہر حال ان کی اپنی صوابدید اور حقائق شناسی پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس تناظر میں ان کی نیت پر شک کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ ہو سکتا ہے کشمیری الاصل نہ ہونے کی بنا پر انھوں نے کہیں کہیں ایسی باتیں بھی کہیں ہوں گی۔ جو واقعاتی طور پر درست نہ ہوں جیسا کہ ہم نے اس کتاب میں بھی ایسی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے لیکن اس سے ان کی مراد کسی عقیدے یا مذہب پرستی کی تنقید کرنا مقصود نہیں ہے۔ البتہ ان کی ذاتی آراء کو ان کے اپنے خیالات تک ہی محدود رکھنا برمحل ہوگا۔ مثلاً لارنس کے بقول گوجر طبقہ اپنی زندگی کے سفر میں اپنی بھینسوں کی طرح سست ہے۔ اب کوئی گوجر اس سے شاید خفا بھی ہو سکتا ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے جس کا مظاہرہ کشمیر کے اس طبقے کی طرز حیات سے قدم قدم پر واضح ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مقامی عادات واطوار سے پوری شناسائی حاصل کرنے کے بعد ہی بسکو کشمیر کے مسلمانوں میں چغل خوری اور غیبت کی بری عادتوں کا ذکر کرتا ہے یا جب وہ کشمیری ہندوؤں کی توہم پرستی اور ان کی فرسودہ سوچ کو ہدف تنقید بناتا ہے تو اس کا یہی ایک مدعا مقصد ہوتا ہے کہ اس قدامت پرست اور زمانے کے نئے تقاضوں سے نا آشنا طبقے کی ظلمات سے روشنی کی طرف رہنمائی کی جائے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ بسکو کی یہ خواہش بہت حد تک پوری ہو چکی ہے کیونکہ کشمیری پنڈت طبقہ اب یہاں کا ایک تعلیم یافتہ اور مہذب فرقہ کہلایا جاتا ہے۔

کشمیری برہمنوں کے حوالے سے ہی یہاں پر اس بات کا اعادہ کرنا مناسب ہوگا کہ جہاں ان میں سے کچھ نکتہ دان یہ شکایت کرتے ہیں کہ بسکو نے خاص طور پر ان کی سماجی زندگی پر انگلیاں اٹھائی ہیں وہاں یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس طبقے کے تاریخ نویسوں نے اکثریتی فرقے کے بارے میں حقیقت بیانی سے کام نہیں لیا ہے۔۔ اس سلسلے میں خاص طور پر سید علی ہمدانی کی طرف سے مبینہ طور پر برہمنوں کو بہ زور بازو اسلام قبول کروانے کا افسانہ دوہرایا گیا ہے۔ جو محض ایک مفروضہ ہے جبکہ پریم ناتھ بزاز اور پرتھوی ناتھ کول بامزئی جیسے حقیقت بیان ہندو مورخوں نے بھی اسے واضح الفاظ میں رد کیا ہے اور اس اصل بات کو دوہرایا ہے کہ چودھویں صدی

عیسوی میں جب حضرت ہمدانی کشمیر آئے تو مقامی ہندؤوں نے اپنی مرضی سے اس بنا پر مسلمان ہونا قبول کیا کہ وہ اور خاص کر ان کی نچلی ذاتوں کے لوگ برہمن پنڈتوں کے ہاتھوں نا قابل بیان جور و جبر اور ظلم و ستم کے مستقل شکار تھے۔ اسلام میں چونکہ ذات پات یا تفرقات کی کوئی گنجائش نہیں ہے لہٰذا کشمیری ہندؤوں نے اس مذہب کو گلے لگایا اور حضرت ہمدانی نے اعلان کیا کہ تبدیلیِ مذہب کے بعد ان لوگوں کو اپنے رتبے کے لحاظ سے اعلیٰ ذات کے برہمنوں کا درجہ حاصل ہوگا۔

نصف صدی سے زیادہ عرصے تک کشمیر میں اپنے قیام کے دوران بسکو نے محسوس کیا کہ مقامی طور پر بالخصوص مسلمان طبقہ نا خواندہ اور پس ماندہ ہے۔ مدارس میں طلبا کی سب سے زیادہ اکثریت برہمن لڑکوں کی تھی جنھیں والدین تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے لیے پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض تھے کیونکہ ان عہدوں پر پہلے سے ہی ان کے قرابت دار یا جان پہچان والے قبضہ جما چکے تھے اور خواندہ مسلمانوں کو نوکریوں سے محروم ہی رکھا جاتا تھا۔ اس تناظر میں بسکو نے مسلمانوں کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور انھیں طرح طرح سے تعلیم کی طرف راغب کیا۔ ساتھ ہی اُس نے اس فرقے میں موجود برائیوں اور مختلف عیوب کو دور کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا۔

بسکو کی بے لاگ محنت کے نتیجے میں جو بسکو اسکول اور مشن ہسپتال قائم کیے گئے وہ آج بھی کشمیر کی علمی اور سماجی دنیا میں روشن میناروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت میں بسکو ہی کو کشمیر میں باضابطہ تعلیم و تدریس کا ایک نابغۂ عہد بانی کہلایا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سرزمینِ کشمیر کے سنسکرت، عربی، فارسی اور کشمیریات سے متعلق کلاسیکی اور مغربی تخلیقات کو اردو میں منتقل کرنے کا جو مستحسن سلسلہ شروع کیا ہے اس کی بدولت سارا ملک بلکہ ساری دنیا کشمیر کی عظیم تاریخ، میراث، تہذیب و ثقافت اور ادبیات کے گونا گوں گوشوں سے بہت حد تک آگاہی حاصل کر سکتی ہے۔ اس کارآمد اور مفید سلسلے کے لیے کونسل تعریف و تحسین کی مستحق ہے۔

ترجمے کے دوران چند ایک عبارات میں اسلامی عقائد اور ہندؤوں کی رسومات کی توضیح طلب اصطلاحوں کی صحیح تشریح کے سلسلے میں پروفیسر غلام رسول ملک اور ڈاکٹر ٹی۔ این۔ گنجو نے

میری رہنمائی کی جس طرح بسکو نے بھی ایسے مذہبی امور کی صحیح جانکاری کے لیے اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر شنکر پنڈت کی ہر قدم پر رہنمائی سے استفادہ کیا ہے، میں ملک صاحب اور گنجو صاحب کا بھی اسی طرح ممنون کرم ہوں۔

غلام نبی خیال
15۔راولپورہ ہاوسنگ کالونی
سری نگر۔کشمیر۔انڈیا

پہلا باب

1890 میں کشمیر کا میرا پہلا سفر

کراچی سے، جو ہمارے لیے ساحل پر اترنے کی پہلی بندرگاہ تھی، پچھلے تیس گھنٹوں میں ایک ڈاک گاڑی میں جھٹکے کھا کھا کر ہمارے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے تھے ۔اب ہم راولپنڈی کے قریب خطۂ نمک سے گزر رہے تھے۔ریل کا انجن دھونکتا ہوا فراٹے بھر رہا تھا۔اس سے دھویں کے بادل اور چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔ یہ ریل گاڑی اپنے اوپر لدے ہوئے بھاری بھر کم بوجھ کو اُن ٹیڑھے ترچھے راستوں سے پٹڑی پر آگے کی طرف کھسک رہی تھی جو بلند سے بلند تر ہوتے ہوئے ننگی اور ناہموار سرخ پہاڑیوں کے بیچوں بیچ گزر رہے تھے۔

یہ علاقہ نہایت ہی جاذب نظر برُج نما شکلوں میں تقسیم ہوا تھا اور غروبِ آفتاب کے وقت ایسا لگتا تھا کہ آپ کسی غیر آباد اور بمبار شدہ شہر سے گزر رہے ہیں۔ گہرے نالے اور گھاٹیاں جس تراش خراش سے وجود میں آئی تھیں وہ گویا برسات کی تیز بارشوں سے رگڑ کھا کھا کر بن گئی تھیں۔ بالآخر جب ہم ایک پیچ دار موڑ پر گھومے تو ہماری توجہ ایک دلفریب نقرئی لکیر کی طرف مبذول ہوئی جو جگہ جگہ مختلف رنگ بکھیر رہی تھی۔ یہ رنگ ایسے تھے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ ہم نے جب اس راز سے پردہ اٹھانا چاہا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم لافانی ہمالیائی برف پر

طلوعِ خورشید کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ ہم اس نظارے سے بے حد محظوظ ہوئے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور جب بھی قدرت کے اس آفاقی نظارے کو دیکھتے ہیں تو ہماری رگ و پے میں ایک حرارت سی دوڑ جاتی ہے۔

اب دن کی روشنی ہولے ہولے پھیل رہی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہم سفر اپنا بوریا بستر باندھ رہے ہیں۔ (ہندوستان میں مسافر اپنا بستر ساتھ رکھتے ہیں) اور وہ انھیں رسیوں سے صحیح طریقے پر کس رہے ہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم راولپنڈی کے نزدیک پہنچ چکے ہیں جہاں ہموار چھتوں والے سفید مکان نظر آ رہے ہیں۔ اسی طرح سفید گنبد والی مسجدیں اور ہندوؤں کے مندر بھی دکھائی دے رہے ہیں جن کے مینار چمک رہے ہیں۔

ریل کی دوسری طرف ہمیں سفید خیمے اور بارکیں نظر آ رہی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم شمالی ہندوستان کے ایک بہت بڑے فوجی اسٹیشن کے پاس پہنچے ہیں۔ قصبہ کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ (راولپنڈی) اساطیری مخلوق کا علاقہ ہے۔ پنڈ کے معنی گاؤں اور راول کے معنی نیم انسان اور نیم حیوان ہیں۔

جب ریل معمول کے جھٹکوں اور چیخ پکار کے ساتھ ایک لمبے پلیٹ فارم کی طرف چل پڑتی ہے تو ہم نیم عریاں مردوں کو آس پاس چلتے ہوئے دیکھتے ہیں جو ادھر اُدھر وحشیانہ طور پر اشارے کر رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ مسافر نہیں ہیں جو پچھلی رات سے اسٹیشن پر اس لیے منتظر ہیں کہ وہ مویشیوں کے ڈبے یا تیسرے درجے کی بگھیوں میں تھوڑی سی جگہ حاصل کر سکیں؟ ریل کے کمپارٹمنٹ لوہے کی سلاخوں سے تقسیم کیے گئے ہیں اور کھڑکیوں پر شیشے بالکل موجود نہیں ہیں۔

ان میں سے اکثر لوگوں نے اپنے گھروں کا ساز و سامان اپنے سروں پر اٹھائے اور بغلوں میں دبائے رکھا تھا۔ پہلے وہ اپنے ایک یا دو بچوں کو ان بگھیوں کے اندر دھکیل کر انھیں اندر جگہ دلوانے کی کوشش کرتے لیکن ان کے اندر گھسنے سے پہلے ہی اندر بیٹھے مسافر انھیں دھکے دے دے کر باہر پھینک دیتے۔ یہ ایک دلچسپ منظر تھا۔

پولیس والے جو نیلے کوٹ اور خاکی پتلون پہنے ہوئے تھے اس گہما گہمی اور تفریحی منظر میں اضافہ کرتے جب وہ اپنی صوابدید کے مطابق نئے مسافروں کو دھکیلنے یا باہر پھینکنے کا کام کرتے۔

ان میں سے چند ایک تو اس دھکم پیل میں اپنی جیبیں گرم کرتے ہوئے بھی دیکھے گئے۔

ایک رات میں امرتسر کے اسٹیشن پر انتظار کر رہا تھا اور میری پوری توجہ پہلی پشت والے لوگوں کی طرف مرکوز تھی۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنے دھینگا مشتی والے کرتبوں سے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ جیسا کہ مشرق کے باسی خواہ مخواہ کوئی کام نہیں کرتے۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ اب اپنی مزدوری سے فارغ ہو کر مچھلیوں سے لدی ایک بیل گاڑی کا سہارا لے کر سستا رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا لیکن اُس کا دوسرا ہاتھ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں پلیٹ فارم پر خاموشی سے چہل قدمی کر رہا تھا۔ یہ بیل گاڑی قریب ہی تھی اور جلد ہی اس لہو ولعب کا پتہ چل گیا۔ یہ جاٹ مسافر یعنی سکھ کاشتکار وہ لوگ تھے جو اپنی پگڑیوں کی گرہیں ڈھیلی کر کے اُن میں سے سپاہی کو رشوت دینے کے لیے سکے نکال رہے تھے۔ پھر یہ سکے نکلنا بند ہو گئے اور جب سپاہی نے دانت بھینچ کر یہ آواز دی کہ جلدی کرو تو سکوں کا بہاؤ ایک ندی کی طرح پھر جاری ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ یہ شخص غالباً یہ دیکھنا پسند کرے کہ یہ کھیل کوئی اور بھی کھیل سکتا ہے۔ میں خاموشی سے اُس کے پاس پہنچا اور میں نے بیل گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائی۔ پھر میں نے بھی اسی طرح مونچھوں کو بائیں ہاتھ سے مروڑنا شروع کیا اور میرا کھلا دایاں ہاتھ اندر کی طرف چلا گیا۔ میرا یہ کرتب دیکھ کر اوروں کو حیرانی ہوئی۔ ایک شخص نے مجھے سورج کی روشنی سے بچنے کی ٹوپی سے لے کر جوتوں تک غور سے دیکھا اور وہ مونچھوں کو دونوں ہاتھوں سے رگڑتا ہوا چلا گیا۔ جب وہ بھیڑ کے اندر پہنچا تو اُس نے اس عجیب وغریب نظارے کو دیکھا کہ ایک انگریز صاحب بھی غریب مزدوروں کو لوٹ رہا ہے۔

میں نے اگرچہ اسے کوئی اہمیت نہیں دی لیکن میں نے ہندوستانی سپاہی کا رول ادا کیا۔ پھر میں نے خاموشی سے ہاتھ کھینچ لیا اور وصول کردہ رقم کو جیب میں اسی طرح ڈال دیا جیسا کہ اُس نے کیا تھا۔ اس کے بعد میں مخالف سمت میں چلا گیا اور مڑ کے بیل گاڑی کے پاس آیا۔ وہاں پر میں نے جاٹوں کے پیسے اُنھیں واپس کر دیے اور اُن کا شکریہ ادا کیا کہ وہ مہربان لوگ ہیں۔ وہ

سبھی حیران و ششدر تھے۔ غالباً وہ اس نوع کی پہلی سرگرمی کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے۔ میں اُن کو سلام کر کے مسکرایا۔ اُنھوں نے بھی اسے ایک مذاق سمجھا اور وہ بھی ہنسنے لگے۔ اس دوران وہ لال، نیلی اور پیلی وردی والے سپاہی کو تاکتے رہے، جو وہاں سے کھسک کر بھاگ چکا تھا۔

میں آپ کو ایسے ہی لاتعداد قصے سنا سکتا ہوں لیکن میں نے صرف یہ ایک واقعہ اس لیے بیان کیا تاکہ میں یہ باور کرا سکوں کہ مقامی باشندے موقع ملتے ہی کس طرح ایک دوسرے کو پچھاڑتے ہیں۔ اور یہ کہ ایک انگریز سپاہی ہندوستان میں انصاف کی بالا دستی کے لیے کس قدر مشکل ترین مرحلوں سے گزرتا ہے۔

اس ملک میں سیاست دانوں کا ایک مخصوص طبقہ موجود ہے جو برطانوی افسروں کی کارکردگی کو حقیر بتاتے ہیں اور وہ اس طرح سے انتظامیہ کو بدنام کرتے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ پولیس برے کام کرتی ہے لیکن جو لوگ ہندوستان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ عمل دراصل اس لیے سرانجام دیا جاتا ہے تاکہ ایک ہندوستانی بھائی اپنے ہی بھائی کو بیوقوف بنانے سے باز رہے۔ انگریزوں میں خامیاں ضرور موجود ہیں لیکن یہ اُن کے فرائض منصبی میں شامل نہیں کہ وہ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو بیوقوف بنائیں اور غریبوں اور نہتے لوگوں پر ظلم ڈھائیں۔ خدا کا شکر ہے۔

خیر، اب ہم یہاں پنڈی کے اسٹیشن پر پہنچے ہیں۔ مسافر قلیوں کو آوازیں دے رہے ہیں تاکہ وہ اُن کا بوجھ اٹھائیں۔ یہاں قلیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جو کم سے کم بوجھ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ بخشش حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کم سے کم وزن کا بوجھ اپنے سر پر اُٹھاتا یا اپنے کسی ساتھی سے مدد کرنے کے لیے کہتا۔ ایک انجانے شخص کے لیے یہ سارا کچھ تفریح اور حیرانی کا باعث ہے۔ اُسے اپنے بوجھ کا خیال بھول جاتا ہے اور وہ اپنے پاس ہونے والے اس مزاحیہ ڈرامے کو دیکھتا رہتا ہے۔

میرے کمپارٹمنٹ میں ایک سیاسی افسر ہے جو اپنے مشرقی بھائی یعنی قلی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اُسے ایک کے برعکس کئی قلیوں کی خدمات حاصل ہوتی ہیں۔ دوسرے مسافر جب قلیوں کو یہ کہہ کر بلاتے ہیں کہ ''قلی ادھر آؤ'' تو اُس کی یہ درخواست بیکار جاتی ہے لیکن اس کے برعکس جب

یہ افسر غصّے سے چلاتا ہے ''ادھر آ بدمعاش۔ اِدھر آ کالی مخلوق!'' اور وہ اپنی آنکھ جھپکاتا ہوا اُن کی پیٹھ پر ایک ٹھوکا رسید کرتا ہے تو اُس کے پاس قلیوں کی مطلوبہ تعداد فوراً حاضر ہو جاتی ہے۔ میں اس افسر کا ہمیشہ ممنون رہا ہوں جس نے مجھے یہ گُر سکھایا جس سے مجھے اس عجیب و غریب اور پُر لطف ملک میں سفر کے دوران بہت سہولت پہنچی ہے۔

ہماری مشرقی سرحد فطری طور پر اعتدال پسند اور تن آسانوں کی جگہ ہے جو زندہ دلانہ سلوک پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ نے اُنھیں برا بھلا کہا تو وہ نہ صرف یہ کہ آپ کو مطلوبہ خدمت فراہم نہیں کریں گے بلکہ آپ کو کسی مصیبت کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ ہندوستانیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو آپ جان جائیں گے کہ آپ کو اُن سے بہتر خادم اور قابلِ اعتماد دوست کہیں نہیں ملیں گے۔

جب میں ان نئے تجربات سے محظوظ ہو رہا تھا اور دوڑ دھوپ اور بڑبڑاہٹ کے زندہ نظاروں کا لطف لے رہا تھا تو ایک خوش پوش شخص بھیڑ کو چیرتا ہوا میرے پاس آیا اور اس نے ایک خط میرے ہاتھ میں تھمادیا۔ یہ خط راولپنڈی میں فوج کے ایک بااختیار افسر کی طرف سے آیا تھا جس میں اینگلو انڈین خاطر داری کے پسِ منظر میں مجھے اُس کے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی گئی تھی تاکہ میں جتنی مدت کے لیے چاہوں اُس کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھوں اور اپنے آپ کو اور سامان کو اُس کے نوکر کی نگہداشت میں دینے کا بھروسہ کروں۔

اُس دوران قلیوں نے فوراً میرا سامان اپنے سروں پر لاد کر اٹھایا اور پھر ہم سب ایک سرکاری شان سے اسٹیشن سے باہر کی طرف جانے لگے جہاں ہم نے ہر قسم کی سواریوں کی گاڑیاں منتظر دیکھیں جن میں دو گھوڑوں سے کھینچی جانے والی بہترین گھوڑا گاڑی بھی شامل تھی جسے 'فٹن گاڑی' کا نام دیا گیا تھا۔ اس گاڑی کا کرایہ ایک روپیہ فی گھنٹہ تھا اور دو پہیوں والی بانس کی گاڑی ایک گھنٹے کے لیے تین آنے کا کرایہ لیتی تھی۔ میں نے ایک چار پہیوں والی گاڑی کا انتخاب کیا جسے 'ٹکا گاڑی' کہتے تھے جو شکل و صورت میں لندن کی چرچراہٹ والی گاڑی سے مشابہت رکھتی تھی لیکن اسے دو مریل اور ناتواں ٹٹو کھینچ رہے تھے۔ یہ لندن کی چار پہیوں والی گاڑی کی طرح ہلتی یا جھٹکے نہیں کھاتی تھی۔

سورج نکل چکا ہے۔ گاڑی جنگل کے بیچوں بیچ چلتی ہوئی جیسے ہچکولے کھا رہی ہے اور اس میں دو افراد کا ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو جاری رکھنا ناممکن بن گیا تھا۔

سامان کو جلد ہی چھت پر لادا گیا ہے اور اب مزدوروں کی مزدوری کی ادائیگی کا وقت آ چکا ہے۔ ہر نو وارد کی طرح میں نے قلیوں کو زیادہ اُجرت دی ہے جس سے پریشانی یا بشاشت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ قلی میرے دیے ہوئے سکوں کو دیکھ کر سوال کرتے ہیں اور لندن کے ٹیکسی ڈرائیور کی طرح پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ میرے اردگرد جمع شدہ بھیڑ مجھ سے زیادہ پیسوں کا تقاضا کرتی ہے۔ فوجی افسر کا خادم میرے بچاؤ کے لیے آ جاتا ہے اور ان قلیوں کو بھگا دیتا ہے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اور منہ بسورتے ہوئے اندر سے خوش ہی خوش ہو رہے ہیں کہ اُنھوں نے ایک غیر ملکی کو لوٹا ہے۔

ہمارے کوچوان نے نہایت تیزی کے ساتھ گاڑی چلانا شروع کیا اور وہ اپنے گھوڑوں کو چابک اور زبان کے آزادانہ استعمال سے دوڑاتا رہا۔ پادری صاحب کے بنگلے کے پاس مجھ جیسے ایک بیگانہ شخص کا اس طرح خیر مقدم کیا گیا گویا میں اُن کا ایک پرانا دوست تھا۔ اس سواگت میں کماحقہٗ مہربانی شامل تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں نہا کر تازہ دم ہو جاؤں۔ یہاں ہر شبستان کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی منسلک تھا۔ جونہی میں نے چمڑے سے بنے ہوئے اُس مشکیزہ سے نکلے ہوئے پانی سے نہایا، جس کے مالک کو بہشتی یا بندۂ فردوس کہتے ہیں، تو میں تازہ دم ہوا اور میرے میزبان نے کہا کہ غالباً میں وہاں لمبی مدت کے قیام کے لیے آیا ہوں۔ میں بھی اس مرحلے پر وہاں سے کھسکنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ کشمیر تک کا راستہ پسیاں گرنے کی وجہ سے جگہ جگہ ناقابلِ آمد و رفت بن چکا تھا۔ لہٰذا میں نے مزید ایک دو دن یہیں پر رکنے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن بعد دوپہر کیا ہوا کہ ٹڈی دل نے ایک تند و تیز آندھی کی طرح ہم پر دھاوا بولا اور ہمیں لان ٹینس کے اُس میدان سے اپنے کمروں میں فوراً گھس جانے پر مجبور کیا جہاں ہم کھیل رہے تھے۔

اگلی صبح ہم نے دیکھا کہ ٹڈی دل نے کھیتوں، جھاڑیوں اور درختوں کو گویا چٹ کر کے سارے اردگرد کو اپنے بدنما پیازی رنگ میں بدل کر چھوڑ دیا تھا۔ کوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد ان تخریبی کیڑوں کو کھانے کے لیے سیکڑوں کی تعداد میں اوپر منڈلا رہی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ

ریلوں کی آمد ورفت موَخر کردی گئی ہے کیونکہ مری ہوئی ہزاروں ٹڈیوں نے پٹری کو زبردست پھسلن سے آلودہ کیا تھااوراس خطۂ نمک میں اس کے ٹیڑھے میڑھے راستے غلاظت کے اس انبار سے دھندلے پڑ چکے تھے۔ٹڈی دل کا یہ حملہ اس قدر شدید ثابت ہوا کہ سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس بلا کو آگے بڑھنے سے روک کر فصلوں کو حتیٰ الامکان برباد ہونے سے بچائیں۔سپاہیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ ٹڈی دل کے متوقع راستے پر کئی میل تک گہری خندقیں کھود لیں اوران کے اوپر ہرطرف آگ جلائی جائے تاکہ اگر ٹڈیاں اس طرف رخ کریں توسپاہی انھیں اسی آگ میں جلتا ہوا دیکھ کران کی آخری رسومات ادا کریں۔لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ لاتعداد ٹڈیاں اس کی پروا کیے بغیر انہی خندقوں کی طرف اڑتی رہیں اوراس دہکتی آگ کو پوری طرح بجھا دیا۔اس کے بعد یہ ٦
سامنے آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کر کے شمال کی طرف گئیں جہاں یخ بستہ برف تلے ان کا قبرستان بن گیا۔

بہر حال،جیسا کہ کہا گیا ہے اچھا وقت بھی آخر گزر ہی جاتا ہے۔اسی طرح میرے مہربان میز بانوں پادری گرِفث اوراُس کی بیوی کا ساتھ بھی اپنے منطقی اختتام کو پہنچا۔اب پہاڑی راستوں سے ہوتا ہوا کشمیر کی راجدھانی سری نگر تک کے دوسو میل کے سفر کے لیے تانگہ دروازے پر کھڑا ہے۔

ایک طرف نوکر تانگے پر سامان لاد رہے ہیں دوسری طرف بابو مجھ سے پیسے وصول کر کے رسید لکھ رہا ہے۔اب چلیے ذرا اپنی اس تانگہ گاڑی کا جائزہ لیں۔یہ ایک دو پہیوں والی زمین سے تھوڑی سی اونچی مگر مضبوط اسپرنگ والی سواری ہے۔اس میں عام طور پر چار سواریاں بیٹھتی ہیں اور کوچوان نشست سے باہر لوہے کی رکاب پر کھڑے ہوکر اپنی میلی کچیلی قمیض کی بد بو پھیلاتے ہوئے گھوڑے کو ہانکتا ہے۔تانگے کی چھت کو کینوس سے ڈھانپا گیا ہے جس پر رسیوں سے بندھا ہوا مسافروں کا سامان رکھا گیا ہے۔مسافروں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کا سامان اچھی طرح سے باندھا گیا ہے تاکہ وہ تانگہ بان کی غفلت سے راستے میں ہی گر نہ جائے۔میری دانست میں ایسا سامان کئی بار راستے کی ہی نذر ہو چکا ہے اوراسے کبھی دوبارہ نہیں دیکھا گیا۔تانگہ ایک پہاڑی راستے کے لیے واقعی کارآمد اورآرام دہ گاڑی ہے۔

اپنے میز بانوں کو آخری بار رسمی طور پر الوداع کہنے کے بعد ہم پوری رفتار کے ساتھ باہری دروازے کی طرف بڑھے اور وہاں مردوں کی طرح پڑے ہوئے افراد کو جگایا۔ جب کہ دروازے کا چوکیدار تھوڑی سی پی کریم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا گیا۔ ہم بہر طور گرد و غبار کے بادلوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہمارا افغان کوچوان ٹٹوؤں کو کوستا دوران پر کوڑے برساتا رہا۔ یہ سلوک اس نے اُن سبھی کوچوانوں اور گاڑیوں کے ساتھ کیا جو اس سے آگے نکل چکی تھیں۔

اس طرح تیز رفتار سے بھاگنے کے مارے کچھ ٹٹوؤں کے منہ سے جھاگ نکلتا رہا اور وہ ہانپتے رہے۔ اس کے بعد بگل بجنے کی پرشور آوازیں آنے لگیں تا کہ بیل گاڑیوں، اونٹوں اور گدھوں پر سوار لوگوں کو راستے کے بیچ سے ہٹنے کو کہا جائے۔ جو پکی سڑک کے بیچوں بیچ چل کر دوسروں کے راستے میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ وہ اپنی اس عادت سے مجبور تھے اور پھر ان کو صرف ایک تنومند ڈرائیور ہی چابک مار مار کر راستہ صاف کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ یہ ڈرائیور ان سست رفتاروں کو ماں بہن کی گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ سفر کے دوران جب ہمیں پل دو پل ستانے کا موقعہ مل جاتا تو ٹٹوؤں کو تبدیل کیا جاتا اور آپ باہر آ کر اپنی ٹانگیں پھیلا سکتے تھے۔ اس دوران کوچوان برلبِ سڑک حقے کے کش لگا کر خبروں پر تبصرہ کرتا اور اس کے ساتھی اس سے یہ دریافت کرتے کہ وہ اپنی سواریوں سے کتنے پیسے اینٹھ سکتا ہے۔

ہمارا کوچوان حقے سے نکلا ہوا دھواں نگلتا ہے تو ہماری نظر ایک کنویں پر پڑتی ہے جس میں گر کر ایک قیمتی گھوڑا مر گیا تھا۔ اس کنویں میں اُترنے کے لیے ایک تنگ زینہ ہے جس سے نیچے جا کر پیاسے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ یہ گھوڑا بھی جو سخت پیاسا تھا، بھٹکتے بھٹکتے اس میں آن گرا اور پھر واپسی کا راستہ تنگ پا کر وہیں پر دم توڑ بیٹھا۔

تانگے کا ہارن مجھے بتاتا ہے کہ سواری چلنے کے لیے تیار ہے۔ پھر اس گاڑی کو کھینچنے والے دو تھکے ماندے ٹٹو پوری رفتار سے چلتے ہیں اور گرد و غبار ہمارے چہروں کو ڈھانپ لیتا ہے۔

راستے میں ہم ٹوٹے ہوئے سینگوں والے اور پسینے میں نہائے ہوئے بیلوں اور ان کی گاڑیوں کو دیکھتے ہیں۔ اب مرّی کی چڑھائی شروع ہوتی ہے جو 8000 فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور پھر 2000 فٹ نیچے کوہالہ ہے جب رات کے سائے ہم پر چھانے لگے ہیں۔ مجھے یہ جان

کرمسرت ہورہی ہے کہ میں پنڈی سے 62 میل دور ایک پرامن ڈاک بنگلے میں پہنچا ہوں۔

کوہالہ برطانوی سڑک پر آخری آرام گاہ ہے۔ ہمارے سامنے گرجتے ہوئے دریائے جہلم کے اُس پار کشمیر واقع ہے۔ اِس دریا پر ایک جھولا پل تعمیر کیا گیا ہے۔

راستے میں اونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے آیئے ہم اُن دنوں پر بھی ایک نظر ڈالیں جب کشمیر موجودہ حکمرانوں کے زیر قبضہ آ گیا۔

چونکہ کشمیر ایک خوبصورت ترین ملک ہے لہٰذا یہ ان سب کی ایک چاہت بن گیا جو یہاں آئے اور اس طرح غریب کشمیری کئی خاندانوں کی نوکری اور غلامی کرتا رہا۔

1750 میں کشمیر سب سے زیادہ ظالم اور بدترین حکمرانوں یعنی افغانوں کے قبضے میں آ گیا۔ اُس دور میں جو ہندو اپنا دھرم ترک کر کے مسلمان نہیں بنتا اُسے قتل کیا جاتا۔ اس طرح ہزاروں زندہ انسان بوریوں میں بند کر کے دریاؤں میں غرق آب کیے گئے۔

1819 میں کشمیریوں نے سکھوں سے مدد طلب کی جنھوں نے اگرچہ افغانوں کو باہر تو نکال دیا لیکن وہ بھی افغانوں ہی کی طرح بے رحم اور ظالم ثابت ہوئے۔

پھر 1846 میں یہ ملک راجپوتوں کے تسلط میں آ گیا کیونکہ جب برطانوی افواج نے سکھوں کو شکست فاش دی تو یہ ملک گلاب سنگھ کو بیچا گیا جو جموں کے ہمسایہ ملک کا مالک تھا۔ یہ سودا تین چوتھائی ملین پونڈ (75 لاکھ روپے) کی حقیر رقم کے عوض کیا گیا جس سے ملک کشمیر اُس کی اور اُس کے ورثا کی ملکیت بن گیا۔ اس کے عوض گلاب سنگھ کو ہر سال برطانوی سرکار کو ایک گھوڑا، اصلی پشم والی بارہ بکریاں اور تین جوڑے شال ادا کرنے تھے۔ مزید برآں گلاب سنگھ پر لازم قرار پایا وہ اپنی فوج سرحدوں کی حفاظت کے وقت برطانیہ کی تحویل میں دے گا۔

جب گلاب سنگھ مر گیا تو اس کا بیٹا رنبیر سنگھ مہاراجہ بن گیا اور اس کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا پرتاپ سنگھ تخت نشین ہوا جسے اب سر پرتاپ سنگھ جی سی ایس آئی کہتے ہیں۔ اس کی تخت نشینی کا سال 1885 تھا۔ وہ اپنی سرکار اُن افسروں کی ایک تشکیل شدہ ریاستی کونسل سے چلاتا ہے جو مقامی نہیں بلکہ ہندوستان سے آئے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جنھیں ہند سرکار نے مختلف محکموں یعنی تعمیرات عامہ، مال وغیرہ کے لیے مستعار لیا تھا۔

ایک برطانوی سیاسی افسر ہمیشہ موسم گرما میں سری نگر میں قیام پذیر رہتا ہے۔ وہ سردیوں کے دوران جموں منتقل ہوتا ہے۔ یہ افسر ہز ہائی نیس کے لیے ایک مشیر کا کام کرتا ہے۔

یہ بیانیہ تحریر کرتے وقت کرنل بیرے نسبت ملک میں قابل قدر خدمات سرانجام دینے کے بعد ریٹائر ہو رہا تھا اور پھر کرنل پریوڈیکس نے ریزیڈنسی میں اس کی جگہ سنبھالی تھی۔

مشرق میں ہر شخص مرغ کی بانگ کے ساتھ ہی علی الصباح جاگتا ہے۔ اس ملک میں گرجا یا گھنٹہ گھر موجود نہیں ہیں لہٰذا نیند میں ہی دھیمے لہجے میں خانساماں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ''صاحب! صاحب!! صاحب!! چھوٹی حاضری یعنی ناشتہ تیار ہے۔'' اور اس کے چند لمحے بعد بگل کی کرخت آواز سنائی دیتی ہے۔ ہمارا کوچوان کوچ کرنے کے لیے بیتاب ہے کیونکہ اس نے سنا ہے کہ پسیاں گر آنے کی وجہ سے سڑک جگہ جگہ ٹوٹ چکی ہے جس سے ہمارے سفر میں بعد میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہم پھر تیار ہو کر اور دربان کو ٹیکس ادا کرنے کے بعد جھولا پل پر خود جھول رہے ہیں چند سال بعد جب میں اسی پل پر سائیکل چلا رہا تھا تو ٹیکس لینے والے نے مجھے روکا اور مجھ سے ٹیکس طلب کیا۔ جب میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟'' تو وہ بولا تم اپنی گاڑی کے لیے ٹیکس ادا کرو۔ ''لیکن یہ گاڑی نہیں ہے،'' میں نے کہا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں تھمائی ہوئی ایک فہرست پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''لیکن یہ تو گھوڑا ہے۔'' میں نے کہا کہ وہ پھر غلط بات کر رہا ہے۔ اب وہ کچھ تذبذب میں پڑ گیا۔ پھر اس کے چہرے پر ہلکی سی چمک آ گئی جب اس نے سائیکل پر کندہ لفظ ''بچوں کی گاڑی'' پڑھا۔ میں نے پھر احتجاج کیا۔ آخر کار وہ بولا ''چلو مان لیا۔ مگر آپ تو اس پل پر چل رہے ہیں؟'' میں نے کہا ''یہ بھی غلط، کیونکہ میرے پاؤں نے اس پل کو چھوا تک نہیں'' اور میں چل پڑا۔

مگر افسوس! کچھ عرصہ بعد جب میں اسی پل پر سے گزر رہا تھا تو وہ مسکراتے ہوئے چلایا۔ ''رک جاؤ'' پھر اس نے ایک اور فہرست نکالی اور زور سے بولا۔ ''بائیسکل، دو آنے!۔'' اب کی بار میں بچ نہیں سکا۔

پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ جب میں نے ایک ٹٹو کو سہلانا شروع کیا تو مجھے لگا کہ وہ بری طرح عذاب میں مبتلا تھا۔ اس کے سینے کے نچلے حصے کی کھال تقریباً اکھڑ چکی تھی لہٰذا میں

نے سائیس سے کہا کہ وہ اس کی جگہ دوسرا ٹٹو لائے۔ لیکن وہ مجھ پر ہنستا رہا البتہ جب میں نے بھی اُس کی ایک نہیں مانی تو وہ بادل ناخواستہ دوسرا ٹٹو لانے گیا۔ پھر مجھے گویا حقارت سے دیکھتے ہوئے حقہ پینے لگا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ تانگہ جوں کا توں وہیں پر جما رہے گا۔ میں نے بھی اسے اسی کے تیر سے مارنے کا عمل کیا اور آرام سے اپنی پائپ نکال کر پیتا رہا۔

میرا خیال ہے کہ اسے میرے پکے ارادے کا پتہ چل گیا اور یہ بھی کہ اُس افغان ڈرائیور کو بھی وہ سبق یاد آیا ہوگا جو میں نے اُسے کل ہی سکھایا تھا جب وہ ایک ٹٹو کو بڑی بے رحمی سے پیٹ رہا تھا۔ بالآخر وہ ایک تگڑے ٹٹو کو لاکر خاموش ہوگیا۔

ان ٹٹوؤں میں کئی ایسے ناتوان اور مریل تھے کہ وہ تب تک آگے بڑھنے کا نام بھی نہیں لیتے جب تک کہ ان کے نیچے گھاس پھوس سے آگ نہیں جلائی جاتی۔ میں نے کم از کم ایک بار کوچوانوں کو یہ وحشیانہ حرکت کرتے دیکھا۔

زخموں سے پیدا شدہ ورم کئی بار ان بے زبان حیوانوں کو اس حد تک جنونی بنا دیتا کہ وہ آگے پیچھے دیکھے بغیر اپنے کو مزید جسمانی تکلیف سے بچانے کی خاطر سرپٹ دوڑتے اور اپنے آپ کو پہاڑوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر اپنی جانیں دیتے۔

میرا ایک دوست مرّی کی پہاڑی سے گزر رہا تھا کہ ایک ٹٹو بے قابو ہوا اور بے تحاشا دوڑتا ہوا ایک دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس میں سوار تین یورپی باہر چھلانگیں لگا کر اپنے کو بچانے میں کامیاب تو ہوئے۔ پھر یہ تانگہ ایک بھاری بھرکم چٹان سے ٹکرایا اور صرف سائیس ہی بچ سکا جو یہ کہانی بیان کرنے کے لیے زندہ بچا۔

اس سڑک کے بارے میں ہونے والے واقعات پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ خوف ناک اموات، بال بال بچنے کے لیے موت سے فرار۔ اس قسم کے واقعات ہوتے ہی رہیں گے جب تک کہ حیوانوں کی صحیح طرح نگہداشت نہ کی جائے، پھسلن والی جگہوں کو محفوظ نہ بنایا جائے اور تانگوں کی جگہ موٹر گاڑیاں نہ لیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اب ایسا ہونے لگا ہے۔

اب نئے ٹٹوؤں کو سہلایا گیا ہے اور ہم پوری رفتار سے چل کر آخرکار دومیل کی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں کشن گنگا دریا کا صاف وشفاف پانی جہلم کے گدلے اور کیچڑ والے پانی سے جا ملتا

ہے۔ہم ایک تنگ و تاریک ڈاک بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر ٹفن کا انتظار کر رہے ہیں۔ دریں اثنامیں آپ کو اس شاندار پہاڑی سڑک کے بارے میں کچھ بتاؤں گا۔

1888 میں وائسرائے نے برطانوی ریزیڈنٹ کے پاس ایک اچھے افسر کرنل پیرے نسبت کو بھیجا تا کہ وہ کشمیر میں کئی مطلوبہ اصلاحات کو ہاتھ میں لے۔اس کام میں یہ بھی شامل تھا کہ ہندوستان سے سری نگر تک بیل گاڑی سڑک نکالی جائے جو کشمیر کا دارالخلافہ ہے اور جو راولپنڈی سے تقریباً 200 میل کے فاصلے پر ہے۔

اُن دنوں روس ہندوکش میں ہماری سرحد کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے پر تول رہا تھا اور اب یہ ضروری بن گیا تھا کہ ہمیں اپنی فوج کے لیے ایک اچھی سڑک چاہیے تا کہ ممکنہ صورت میں اگر وہاں سے حملہ ہوا تو اُس کی مزاحمت کی جا سکے۔

یہ ایک نہایت اہم مسئلہ تھا لہٰذا کرنل پیری نسبت نے ریاست کشمیر کے اُن انجینئروں کو بلایا جو اُس وقت کوہالہ سے دو میل کی جگہ تک سڑک کا 21 میل کے فاصلے کا پہلا مرحلہ مکمل کر رہے تھے۔ کرنل نے ان سے پوچھا وہ بتائیں کہ وہ بارہمولہ تک 78 میل لمبا راستہ کتنے عرصے میں تیار کریں گے جہاں سے وادی شروع ہوتی ہے اور جہاں دریائی سفر کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ پہلا پڑاؤ تیار کرنے میں انھیں پانچ سال لگ گئے اور یہ نئی سڑک کم سے کم بارہ سال میں مکمل ہو جائے گی۔

کرنل نے جواباً کہا کہ وہ اس سے ہرگز اتفاق نہیں کرتا۔ سڑک صرف دو سال کے اندر اندر تیار کی جانی چاہیے۔ کشمیری انجینئروں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ پھر اس نے ان سے کہا کہ وہ بہر حال دو سال کے اندر گاڑی میں بیٹھ کر بارہمولہ تک جائے گا۔ چونکہ کشمیر کی سرکار اس منصوبے کو بروئے کار لانے کی اہل نہیں تھی، اُس نے ایک ٹھیکیدار مسٹر اسپیڈنگ کی خدمات حاصل کیں جو اپنے ساتھ قابل انجینئروں کی ایک جماعت، کئی سو پٹھان اور دیگر قلی لایا اور فوراً کام شروع کیا۔ اگر چہ اسے بھی کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا پھر بھی وہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں کامیاب رہا۔ اس طرح کرنل نسبت نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ صرف دو سال کے اندر وہ ایک گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ افغان قلیوں کی کثیر فوج کو سنبھالنا کوئی معمولی بات نہیں تھی کیونکہ ان میں سے کئی برطانوی فوج

کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کئی ایسے تھے جو قتل کر کے قانون کی نظروں سے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ اوران میں کئی ایسے مجرم بھی تھے جنھوں نے اپنے ہی خاندانوں میں ناموس کے نام پر قتل کیے تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظران جیسے بدمعاشوں سے بہتر اہل کاروں کا حصول مشکل تھا۔

اس دوران چند دلچسپ باتیں بھی پیش آئیں۔ کیمبرج سے فارغ التحصیل ایک نوجوان انگریز انجینئر کو افغان قلیوں کی ایک ٹکڑی کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اس نے ایک قلی کو کوئی کام کرنے کو کہا جس سے قلی نے نہ صرف یہ کہ انکار کیا بلکہ وہ ہاتھ میں لوہے کی ایک سری پکڑ کر انجینئر کی طرف لپکا تا کہ اس کی ضرب سے اس کے سر کو پاش پاش کرے لیکن ہوشیار انجینئر نے خطرے کی بوسونگھتے ہی لپک کر افغان کے چہرے پر ایسا فولادی گھونسہ رسید کیا کہ وہ منہ کے بل نیچے گر گیا اور زمین کی گرد چاٹتا ہوا اپنے لہولہان چہرے کو سہلاتا رہا۔

ان پٹھانوں میں چند خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ مزاج کے اچھے ہیں اور ہمت اور شجاعت کے قدردان ہیں۔

اب میں ایک اور واقعہ بیان کروں گا جس سے اپنے افسروں کے لیے پٹھانوں کی عزت و تکریم ظاہر ہوتی ہے۔ ہر ہفتے جب قلیوں کے چودھریوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ قلیوں کو سات دن کی محنت کی ادائیگی کریں تو معلوم ہوا کہ وہ مزدوروں کو پوری اجرت نہیں دے رہے ہیں لہٰذا انجینئروں نے فیصلہ کیا کہ یہ ادائیگی لوگوں کی موجودگی میں کی جائے تا کہ قلیوں کو اطمینان ہو جائے کہ انھیں اپنی محنت کا پورا صلہ مل رہا ہے۔ اب روپیوں کا ایک انبار ایک میز پر رکھا گیا اور چودھریوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے گروپ کے قلیوں میں یہ روپے تقسیم کریں۔ اس عمل میں چودھری لوگ جب میز سے اپنے قلیوں کے حصے کی رقم ایک ہاتھ سے سمیٹ رہے تھے تو وہ اپنا دوسرا ہاتھ میز کی دوسری طرف نیچے چھپا کر اس میں بھی ایک یا دو روپے ڈال کر جیب میں ڈال دیتے۔ اس طرح وہ ایک اوچھے پن کا مظاہرہ کرتے تھے کہ قلیوں کو کم معاوضہ انھوں نے نہیں بلکہ خود انگریز صاحب نے دیا ہے۔ جب انجینئروں نے یہ چال بھی بھانپ لی تو ان میں سے ایک شخص میز کے ساتھ ہی اس طرف بیٹھ گیا جس طرف سکے اس کے ہاتھوں میں ڈالے جاتے تھے۔ اس اقدام سے چودھری اپنی خیانت کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قلیوں کے دلوں میں

انگریزوں کا اعتبار بڑھ گیا اور پھر انھوں نے حیران کُن اور معجزاتی طور پر یہ سڑک مکمل کر لی۔

دیکھیے اب ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ دوپہر ڈھل چکی ہے اور ہمارے سامنے کئی میلوں کا سفر باقی ہے ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سڑک خستہ بھی ہو چکی ہو۔ بگل کی کرخت آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارا کوچوان چلنے کو تیار ہے۔ ٹٹو اپنی ٹانگیں اچھالتے اور لاتیں مارتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان میں سے کئی بے چارے زخمی ہو چکے ہیں۔ کوچوان چابک مارتا ہے اور تانگہ ایک نوکیلی چٹان سے جا ٹکراتا ہے۔ ڈرائیور طیش میں آ کر ٹٹوؤں کو گالیاں دیتا ہے اور اُن کی اُن ماداؤں کی ماں بہن کو بھی نہیں چھوڑتا جن کی طرف کسی وقت نر ٹٹوؤں کا خیال جا سکتا ہے۔ سائیس اب ٹٹوؤں کو خاموش کرنے میں لگا ہے لیکن وہ آگے بڑھنے کا نام بھی نہیں لیتے۔ وہ اُن پر تابڑ توڑ لاتیں رسید کرتا ہے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پھر وہ ایک رسی لا کر اسے اُن میں سے ایک کے کان کے ساتھ باندھ لیتا ہے اور اسے پوری طاقت سے کھینچنے لگتا ہے۔ میں اُسے ایسا کرنے سے باز رکھتا ہوں بلکہ میں کہتا ہوں کہ ہم تانگے کو سنبھالیں گے اور اس کے پہیے حرکت میں لانے کی خاطر خود مدد کریں گے۔ ہم میں یہ تبدیلی دیکھ کر ٹٹو اطمینان سے آگے بڑھتے ہیں پھر ڈرائیور بھی انھیں قابو میں کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم بوجھ سے لدے اونٹوں کے ایک کارواں کا سامنا کرتے ہیں۔ اونٹوں کے سائیس جو گویا نیند میں چلنے سے ڈھیلے پڑ گئے تھے کوچوان کے چابک کی مار سے جاگ پڑتے ہیں۔ وہ اونٹوں کو ایک طرف کر دیتا ہے پھر ہم پوری رفتار سے قدم بڑھا رہے ہیں۔ البتہ ہم جلد ہی ایک زوردار جھٹکا کھا کر ہل جاتے ہیں جب ایک پہیہ سڑک میں پڑے ایک بہت بڑے پتھر سے ٹکرا جاتا ہے۔ ہم تینوں ہمت کر کے تانگے کے لیے راستہ صاف کر لیتے ہیں اور پھر آگے کا سفر جاری رہتا ہے۔ اس قسم کی رکاوٹیں سامنے آتی ہی رہتی ہیں مگر ہم خوش قسمت ہیں کہ چند قلیوں کو قریب ہی دیکھتے ہیں جو بخشش کے لالچ میں ہمارا راستہ سفر کے قابل بنا دیتے ہیں۔

یہ قلی سیبوں کی فصل راولپنڈی لے جا رہے ہیں۔ یہ حیرت ناک بات ہے کہ یہ کتنا بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں؟ ہم نے دیکھا کہ ان کی پیٹھ پر دو سے تین من سیبوں کا بوجھ لدا تھا۔ ہر قلی کے پاس ایک موٹی سی چھڑی تھی۔ کچھ دور چل کر وہ اسی چھڑی کے سہارے اپنے بوجھ کو نیچے اتارتے

اور تھوڑی دیر ستا کر پھر کم از کم پچاس گز تک چلتے۔ اس طرح وہ بارہ دن کے اندر دو سو میل تک دو سے تین من میوہ اٹھا کر لے جاتے تھے۔

قلی مشکل سے دوسروں کے لیے کام کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے سفر کے دوران دیکھا ہوگا کہ اگر ایک مزدور کچھ کام کر رہا ہے تو کم از کم چار قلی اس کا تماشہ دیکھتے ہوں گے اور اگر اسے بیلچے سے سڑک کو ٹھیک کرنا ہوگا تو دوسرا قلی ایک رسی بیلچے کے اگلے حصے سے باندھ کر اس کی مدد کرتا ہے۔ جس طرح انگلستان میں دو دو آدمی باغ کے سبزہ کو ہموار کرنے کے لیے گھاس کاٹنے کی مشین سے کام لیتے ہیں۔

اس راستے میں ایک مسافر کو طرح طرح کے مناظر نظر آتے ہیں۔ کہیں پر بیل گاڑیوں کے کوچوان جنھیں اپنے بیلوں کی حفاظت کرنی ہوتی ہے خود گہری نیند میں مست نظر آتے ہیں اور پھر میرا ڈرائیور انھیں چابک مار مار کر جگا دیتا ہے کیونکہ انھوں نے سارا راستہ بند کیا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک کشمیری بنیا، دکاندار، اپنے ٹٹو پر ہر قسم کی کھانے پینے کی اشیا سے لدے سامان کو لے کر خراماں خراماں چلتا ہے تو اس کا تانگہ کسی جگہ سڑک کے کنارے سے لڑھک کر کھسک جاتا ہے اور اس کے سارے تھیلے اس شاہی سڑک پر بکھر جاتے ہیں اور وہ انھیں دوبارہ جمع کرنے میں لگ جاتا ہے۔

اب ہمارا راستہ بھی اس طرح مسدود ہوا ہے کہ اسے کان کے پردے پھاڑنے والے بگل بھی نہیں کھول سکتے۔ دراصل ہمارے سامنے کی سڑک کا وہ حال ہوا ہے کہ اسے سڑک کہا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ اس کا بہت سارا حصہ ایک پسی کی زد میں آ کر نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

میں کوچوان اور سائیس سے کہتا ہوں کہ ہم اپنے پاؤں اور ہاتھوں سے ملبہ ہٹا کر اور اسے دائیں بائیں دھکیل کر راستہ صاف کریں لیکن ان کی نظروں میں یہ سب بے کار ہے۔ اُن کے بقول یہ اللہ کی مرضی ہے اور ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ لیکن وہ بہر حال کام پر لگ جاتے ہیں اور پتھروں اور چھوٹی چھوٹی چٹانوں کو نیچے کھڈ میں دھکیلتے ہیں۔ ہم اس کام میں آدھ گھنٹے سے لگے ہیں کہ ہم چند انگریز سیاحوں کو دیکھتے ہیں جن کے ساتھ تیس قلی ہیں۔ وہ فوراً اُن سے کہتے ہیں کہ وہ ہماری مدد کریں۔ وہ ٹٹوؤں کو نیچے کی طرف لے جاتے ہیں۔ سامان کو تانگے سے نیچے اتارا جاتا ہے

اور پھر وہ خالی تانگے کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اسے سڑک کے اُس پار پسی کی دوسری جانب ہموار سڑک پر لے جاتے ہیں۔

مجھے اس عذاب سے نکل کر اتنی بشاشت ہوئی کہ میں نے دل کھول کر ان قلیوں کو انعام دیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قلی جواب تک نہایت خاموشی اور متانت سے کام کر رہے تھے یکا یک مجھ سے مزید پیسوں کا تقاضا کرنے لگے اور اس طرح وہ بے ہودہ قسم کے لوگ ثابت ہوئے۔ دریں اثنا میرا ڈرائیور چابک لہراتا ہوا اور انھیں کوستا ہوا آ جاتا ہے اور یہ گھٹیا لوگ احمقوں کی طرح نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ ہم پھر آگے بڑھتے ہیں اور راستے میں حیوانوں اور انسانوں کو ایک طرف ہٹانے کا کام بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ ہم ہٹی بنگلے پر پہنچ جاتے ہیں جو کب کا نذرِ آتش ہو چکا ہے۔ یہاں میں نے ایک کتے کا استقبال کیا۔ اگرچہ وہ ایک کشمیری کتا تھا مگر اُن انسانوں کے برعکس انگریزی زبان اس کی سمجھ میں آتی تھی جو میرے ساتھ تھے۔ اس نے میرے کھانے میں بھی حصہ لیا۔

اگلی صبح جب ابھی سحر ہی ہو رہی تھی میرے خانساماں نے دروازے کے سوراخ سے دھیمی آواز میں کہا، "صاحب! صاحب!!" اس کے معنی یہ تھے کہ چائے اور ٹوسٹ تیار ہیں۔ چند منٹوں میں میں نے پھر بگل کی کرخت آواز سنی اور میں تانگے پر افغان کوچوان کے پیچھے بیٹھ کر اس سے کہتا ہوں کہ میں جلد از جلد بارہمولہ پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس سفر میں ہم نے دریائے جہلم پر کئی جگہوں پر رسیوں کے پُل دیکھے جو دن رات چیں چیں کرتے ہوئے شور مچاتے اور کسی بھی طرح خاموش نہیں رہ سکتے۔

یہ پل تین قسم کی رسیوں سے بنے ہیں جو شاہ بلوط اور دیگر درختوں کی شاخوں سے بنی تھیں اور جنھیں مضبوط کھمبوں سے لٹکایا گیا تھا۔ ایک رسی پر پل پار کرنے والا اپنے پاؤں رکھتا تھا اور دائیں بائیں رسیاں اس کے ہاتھوں کو سہارا دیتی تھیں۔ یہ پل اگرچہ نہایت کمزور دکھائی دیتے ہیں مگر ان کی مضبوطی کا جواب نہیں۔ اب اندازہ کریں کہ جب زور کی ہوا چل رہی ہو تو یہ لوگ اسی طرح اس پل پر جھولتے دکھائی دیتے ہیں جس طرح آندھی سے ہلتے ہوئے مکڑی کے جالے میں مکڑی ایک طرف سے دوسری جانب جھولتی رہتی ہے۔ عورتیں عام طور پر یہ پل مردوں کی پیٹھ پر سوار ہو کر ہی پار کر لیتی ہیں اور اس سے پہلے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی جاتی ہیں تا کہ وہ نیچے

گرجتے ہوئے دریا کی طرف دیکھ کر ڈر نہ جائیں۔ مقامی لوگوں نے چمڑے کے کچھ ایسے پل بھی بنائے ہیں جو انگریزی حرف وی(V) کی الٹی شکل میں بنائے گیے ہیں۔ ان پلوں پر چلتے وقت لوگ ایک ہاتھ سے اوپر کی رسی پکڑ کر اپنی بکریوں کو دریا پار کرواتے ہیں۔ اس عمل سے قبل ان جانوروں کی ٹانگیں بھی باندھی جاتی ہیں لیکن پھر بھی جب وہ بوکھلاہٹ میں تملاتے ہیں تو ان میں سے کئی نیچے دریا میں گر جاتے ہیں جہاں ان کے جسم آبی چٹانوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ان عارضی اور کمزور پلوں پر جب پانچ پانچ چھ چھ لوگ بیک وقت چلتے ہیں تو ان کے ٹوٹ کر گر جانے سے وہ بھی دریا برد ہو جاتے ہیں۔

ہم سفر میں ہیں اور اب بارہ بج چکے ہیں۔ میرا کوچوان جو ایک کٹر مسلمان ہے نماز ادا کرنے کے لیے ٹھہر جاتا ہے۔ جب وہ نماز کے دوران قیام، رکوع، سجدہ اور سلام کے عمل میں مصروف ہوتا ہے تو اس کی شخصیت نہایت پُر کشش لگتی ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ وہ جتنا مذہب پرست ہے کاش وہ اُتنا ہی نرم مزاج ہوتا۔ اس طرح ہمارا سفر باعث اطمینان بھی ہوتا اور وہ جانور اپنی ہڈیاں سلامت رکھ سکتے جنھیں اس کی گاڑی کے پہیے توڑ کے رکھ دیتے ہیں۔

چند لمحے پہلے سورج اونچے پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو چکا ہے اور اندھیرا وادی کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ ہم اب بھی بارہمولہ سے کئی میل کی دوری پر ہیں۔ کوچوان مجھ سے کہتا ہے کہ ہم راتوں رات بارہمولہ نہیں پہنچ سکتے لیکن میں اصرار کرتا ہوں کہ مجھے بہر حال وہاں پہنچنا ہے۔ وہ تھوڑی دور تک چلنے کے بعد اپنے ٹٹوؤں کو کھول دیتا ہے اور انھیں دوبارہ تانگے کے ساتھ باندھنے سے انکار کرتا ہے۔ میں پھر اس سے کہتا ہوں۔ ''دیکھو! مجھے ہر صورت میں وہاں پہنچنا ہے۔'' اور پھر میں خود ہی پیدل چلنا شروع کرتا ہوں۔ جلد ہی میں تانگے کے پہیوں کی آواز سنتا ہوں اور مجھے اس پر بیٹھنا نصیب ہوتا ہے۔ بیل گاڑیوں نے سڑک کو تہس نہس کر کے چھوڑا ہے اور اس پر بکھری چٹانوں اور پتھروں سے ٹکرا کر ہمیں جھٹکوں پر جھٹکے لگتے ہیں۔ پھر تانگہ ایک دھماکے جیسی آواز کے ساتھ نیچے کی طرف لڑھکتا ہے اور ہم رک جاتے ہیں۔ ٹٹو اپنی طرف سارے زور لڑا کر گاڑی کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم گپ اندھیرے میں نیچے اتر کر پہیوں کو سیدھا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ہم مایوسی کے اسی عالم میں دیکھتے ہیں کہ دو

آدمی ہماری مدد کو آ رہے ہیں اور انہی کی کوشش سے ہم اس مصیبت سے نکل کر آگے چلتے ہیں۔ ہم کئی لوگوں کا ایک ہجوم دیکھتے ہیں جو مشعلیں اٹھائے ہیں اور بالآخر کوچوان کہتا ہے۔ ''یہ ہے بارہمولہ''۔ وہ ٹٹوؤں کی لگام انہی کی پیٹھ پر پھینک کر نیچے اتر جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ گویا مجھے شور مچانے والے ان لوگوں نے گھیر رکھا ہے جو عام طور پر پنجاب کے ریلوے اسٹیشنوں پر دیکھے جاتے ہیں۔ اس وقت سارا ماحول اندھیرے میں ڈوب چکا تھا اور ان لوگوں کے ہاتھوں میں مشعلیں اسے پُراسرار طور پر اور بھی تاریک بنا رہی تھیں۔

اب یہ لوگ میرے سامان پر جھپٹ پڑے اور اسے لے کر دوڑنے لگے۔ مجھے لگا کہ میں چوروں کے ہتھے چڑھ گیا ہوں مگر فوراً ہی مجھے میرا سارا سامان واپس مل گیا۔ اس کام کے لیے کوچوان اپنے چابک کو ادھر سے اُدھر لہراتا ہوا دیکھا گیا۔ وہ کشمیریوں کو قابلِ حقارت سمجھتا تھا۔ دریں اثنا میں نے ایک شخص کو میلا کچیلا شاہانہ لباس پہن کر دیکھا جس نے میرے ہاتھ میں ایک خط تھما دیا۔ جونہی میں اس سے وہ خط لینے کو تھا، میرے کوچوان نے اسے جھپٹ کر چھین لیا اور اس کی پیٹھ پر اس نے ایک زور کا گھونسہ مارا۔ اب میں نے کوچوان سے کہا کہ وہ میرا خط مجھے دے دے۔ جو مجھے میرے ایک ساتھی مشنری نے لکھا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس نے ایک کشتی مجھے دریا کے ذریعہ تقریباً 60 میل دور سری نگر تک لے جانے کے لیے بھیج دی ہے۔ کوچوان نے اس لیے اس ایلچی کو مارا تھا کہ اس نے ایک اور شخص کے ساتھ مجھے سری نگر لے جانے کی بات طے کی تھی جس میں ظاہر ہے کہ اس نے پیسے بھی وصول کیے ہوں گے۔

مشعلوں کی روشنی میں اپنی ساری چیزیں جمع کرنے کے بعد میں انجینئر کے بنگلے کی طرف چل پڑا جسے ازراہِ کرم میرے لیے وقف رکھا گیا تھا کیونکہ وہاں کوئی ڈاک بنگلہ نہیں تھا۔ یہاں میں اپنے افغان کوچوان سے رخصت ہوتا ہوں جس نے مجھے تفننِ طبع کے ساتھ پریشانیوں سے بھی نوازا تھا البتہ یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ ان میں سے کون سی چیز غالب تھی۔ یہ شخص واقعی ایک خوش مزاج اور نرم دل بدمعاش تھا مجھے اگرچہ کئی کوچوانوں سے واسطہ پڑا مگر جو ان میں سے مجھے سب سے پہلے ملا تھا میں نے اُس جیسا اور کوئی نہیں پایا۔ میں نے دوبارہ اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالباً وہ بھی اُن مہلوکین میں شامل ہوا ہوگا جو اپنی گاڑیوں کو موت کے منہ میں دھکیلتے ہیں۔

وہ بھی قسمت میں یقین محکم رکھتا تھا۔

دسمبر کے مہینے کے آغاز میں یہ اتوار کا دن تھا جسے میں نے خاموشی کے ساتھ گزارا۔ پیر کی صبح میں ڈونگے میں سوار ہوا جس کے ملاحوں میں دو مرد اور ایک عورت شامل تھی۔ ہم لہروں سے لڑتے ہوئے ولر جھیل کے پاس سوپور پہنچے جو پندرہ میل دور تھا اور اُس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔

اس مقام پر ملاح رک گئے اور انھوں نے آگے بڑھنے سے انکار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ طوفانی خطرے کے پیش نظر معذور ہیں۔ میرے خیال میں یہ محض ایک عذر لنگ تھا لہٰذا میں نے سخت لہجے میں انھیں آگے چلنے کا حکم دیا۔ اس موقعے پر اسٹیٹ اسکول کا ہیڈ ماسٹر، ایک کشمیری پنڈت، میری مدد کے لیے آیا۔ وہ سری نگر میں مشن اسکول میں ایک طالب علم تھا۔ اُس کے بقول سڑک کے راستے سری نگر صرف تیرہ میل دور تھا لہٰذا میں نے کشتی کو چھوڑنے اور سڑک کے راستے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اس کے لیے مجھے ایک ٹٹو فراہم کیا۔

جب کشتی والوں کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے پچھتاوے کے بعد مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ آندھی اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے مجھے شہر لے جائیں گے۔ مگر میں سوچنے لگا کہ اگر وہ طوفان کی نذر ہو گئے تو ان کا خون میری گردن پر ہوگا۔ بہر حال میں نے یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لی اور ہم چل پڑے۔ میں نے ٹٹو کو اس لیے بھی چھوڑ دیا کیونکہ شہر تک کا فاصلہ 26 میل تھا اور ہیڈ ماسٹر نے دراصل ایک کوس کو ایک میل بتایا تھا۔ جبکہ ایک کوس دو میلوں کے برابر ہوتا ہے۔

ہم نے اندھیرا ہونے سے پہلے ہی جھیل کو بحفاظت پار کر لیا اور پھر باقی سفر میں دو دن لگ گئے۔ اگر چہ برف باری ہو رہی تھی اور کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں کشتی میں باورچی خانے سے آنے والے دھوئیں سے تنگ آ چکا تھا تو جب مجھے سری نگر دکھائی دیا تو میں نے ایک راحت سی محسوس کی۔ اس کے بعد مجھے ایک گرم جوشی سے بھرا استقبال نصیب ہوا جو میرے ہم کار مشنریوں اور سری نگر والوں نے کیا۔

دوسرا باب

ایک خوبصورت اور خاموش وادی

ابھی تک ہم وسطی کشمیر کی وسیع و عریض وادی کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ تین دلکش جھیلیں جڑی ہیں۔ جوں جوں آپ دریا کے اوپری حصے کی طرف جاتے ہیں تو آپ کو بغل والی وادیاں ایک مرکزی وادی میں ہر طرف سے ضم ہوتی دکھائی دیں گی۔ ان کے پیچھے برف سے نہلائی ہوئی ندیاں بڑے دریا جہلم میں جذب ہو رہی تھیں۔ ان ہی دلکش اور الگ تھلگ وادیوں میں سیاح خانہ بدوشوں کی طرح خیموں میں قیام کرتے ہیں۔ جن پر ایک بہت بڑا اخروٹ کا درخت اور اُس سے بھی اونچائی پر 7,000 فٹ سے 10,000 تک صنوبر کے درخت سایہ کرتے ہیں۔ پھر 12,000 فٹ سے بھوج پتر کے درخت نظر آتے ہیں۔ اور اس سے بھی اونچائی پر ساگوان کے وہ درخت قطار در قطار نظر آتے ہیں جن سے تیل نکالا جاتا ہے اور پھر صرف گھاس اور ننگے پہاڑ 12,000 فٹ یا اس سے بھی زیادہ بلندی پر ساکن و ساکت دکھائی دیتے ہیں جو اپنی فلک بوس اونچائیوں پر برف کی چادر میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ صنوبر کے ان جنگلاتی خطوں میں آپ کو گھاس سے بھرے میدان ملیں گے جنھیں ''مرگ'' کہا جاتا ہے۔ ان مرگوں میں چرواہے اپنی بھیڑوں اور بکریوں کو ہری بھری گھاس کھلاتے ہیں۔

ان میں سے ایک خاص مرگ پہاڑی سیاحت گاہ بنائی گئی ہے جہاں سرکار اور مقامی لوگوں نے لکڑی کے بنگلے تعمیر کیے ہیں۔ گلمرگ سطح سمندر سے 8,000 فٹ کی بلندی پر ہے اور یہ راجدھانی سری نگر سے اٹھائیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسے بیل گاڑیوں کی ایک اچھی سڑک سے جوڑا گیا ہے۔ لیکن اس میں اونچائی کے آخری تین میل زبردست چڑھائی کے ہیں جنھیں ٹٹو یا ڈانڈی پر یا پیدل ہی طے کیا جا سکتا ہے۔

گلمرگ اب ایک روایتی مقام کو ہی بن گیا ہے۔ جہاں کلب اور جمخانہ بھی ہیں جن میں ٹینس کورٹ، کرکٹ کا میدان، پولو گراؤنڈ اور دو گالف کورس ہیں جن میں ایک مردوں کے لیے اور دوسرا خواتین کے لیے ہیں اور یہ گالف کورس غالباً ہندوستان بھر میں بہترین ہیں۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب یورپی باشندوں کے قیام کے لیے یہاں صرف چند معمولی رہائش گاہیں موجود تھیں۔

ایک رات گھنگھور بارش ہونے لگی اور گرجے میں ایک کونا بھی خشک نہیں رہا۔ پادری کی بیوی نے برساتی اور کئی چھتریاں جمع کر کے اپنے اوپر لپیٹ لیں مگر بچوں کو اس نے پلنگ کے نیچے سلا دیا جو بس ایک ہی ایسی جگہ تھی جہاں بارشوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ گرجا گھر سردیوں میں چرواہوں کی طرف سے گاؤ خانے کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ ریزیڈنسی کے علاوہ یہ ایک ہی قابل استعمال جگہ تھی۔ اس کے علاوہ دوسری جگہ بھی تھی جسے ٹھوس بنیادوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ ایک ویران سی عمارت تھی جس کی چھت کو مضبوط شہتیروں سے ایستادہ رکھا گیا تھا۔ اس تعمیر کی ہر موسم بہار میں مرمت کی جاتی تھی۔

گلمرگ پچھلے دنوں کے مقابلے میں بہت حد تک پھیل چکا ہے۔ یہاں کئی سنگی عمارتوں نے جھونپڑیوں کی جگہ لی ہے۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کی عمارتوں کی دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ اب گرجے کی کھڑکیوں میں پادری ڈیلی مِگل کی بدولت نئے منقش شیشے لگے ہیں جو کشمیر میں یورپ کا قدیم ترین رہائش کنندہ ہے۔

یہاں نیڈوز اینڈ سنز کا ایک بہت بڑا ہوٹل ہے جس میں ایک سو افراد کے ٹھہرنے کی گنجائش ہے۔ اس کے آس پاس خیمے بھی نصب کیے گئے ہیں۔ گلمرگ میں صنوبر کے درختوں کی قطاروں

میں چہل قدمی کرنے کے کئی راستے ہیں جن سے آپ 3,000 فٹ نیچے واقع وادی کا ایک دیدہ زیب نظارہ کر سکتے ہیں جہاں دریا اور جھیلیں آفتاب کی روشنی میں نہا رہی ہیں۔ پھر دور لا فانی پہاڑیاں نظر آجاتی ہیں جن میں شاندار ننگا پربت بھی شامل ہے جس کے معنی برہنہ پہاڑ کے ہیں۔ یہ پہاڑ 26,700 فٹ کی اونچائی پر ہے اور اس کے نیچے کم بلندی کے کئی کوہ برف کی چادر اوڑھے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

گلمرگ کے معنی پھولوں کی چراگاہ ہے۔ لیکن اب یہ پھول کم وبیش ناپید ہو چکے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گالف کورس کو وسعت دینے کی غرض سے کھدائی کا کام ہوا ہے پھر بھی ابھی ایسی مرگیں موجود ہیں جنھیں انسانی ہاتھوں نے چھوا نہیں، جہاں پھولوں کے قالین بچھے ہیں جو عاشقانِ گلشن کے لیے جنت کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں مرگوں پر لاتعداد ٹٹو، گائیں، بھینسیں اور بھیڑ بکریاں بلاخوف ٹہلتی رہتی ہیں۔ مسلمانوں سے میں نے بھینس کے بدصورت ہونے کی یہ کہانی سنی ہے کہ جب آدم اللہ کو حیوانوں کو وجود بخشتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو یہ کام اُس کے لیے اتنا دلچسپ ثابت ہوا کہ اس نے اللہ سے درخواست کی کہ وہ بھی ایک جانور اپنے ہاتھوں سے بنائے گا۔ اللہ نے اجازت دی، پھر اُس نے جو جاندار شے بنائی وہ ایک بھدی شکل وصورت والی بھینس تھی۔

ایک انسان کو اُس وقت نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے جب وہ کسی گائے یا بھینس کو اپنے بچھڑوں کے ہمراہ چلتے ہوئے دیکھے کیونکہ یہ حیوان پیدل چلتے انسانوں پر حملہ کرنے حتیٰ کہ انھیں ہلاک کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مجھ پر اور میرے ایک دوست پر اسی نوعیت کا اچانک حملہ ہوا۔ ہم دن بھر اونچائیوں پر چڑھنے کے بعد کیمپ کی طرف آرہے تھے اور ہمارے پاؤں تھکے اور بوجھل لگ رہے تھے کہ ہم نے ایک مادہ بھینس کو پوری رفتار سے ہم پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ ہم بتوں کی طرح ساکت کھڑے رہے۔ ہم نے سوچا کہ ہمارا مضبوط ارادہ اور انسانی نگاہیں اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کریں گی۔ لیکن ہمارا یہ خیال کھوکھلا ثابت ہوا اور ہم نے اپنی پوری رفتار سے بھاگنا شروع کیا۔ بدقسمتی یہ کہ بھینس نے مجھی کو مارنے کے لیے چن لیا، غالباً میرے دوست کو اس منظر سے خوشی ہوئی ہوگی۔ جب مجھے یقین ہوا کہ بھینس مجھے نہیں چھوڑے گی تو میں نے ایک جھاڑی کے پیچھے چھپنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔ وہ سیدھے اسی جھاڑی پر لپکی مگر عجیب بات یہ

ہوئی کہ یہ جھاڑی ایک گہری کھائی کے اوپر تھی، بھینس اپنے بھاری بھرکم بوجھ کو سنبھال نہ سکی اور سیدھے نیچے کی طرف لڑھک گئی۔ اس دوران میں نے دوسری جھاڑی میں پناہ لی اور سمجھا کہ میں اُسے چکما دینے میں کامیاب ہوا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے پھر مجھے دیکھا۔ اس بار میں نے سوچا کہ وہ اب میرے دوست کا انتخاب کرے گی۔ یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔ دریں اثنا بھینسوں کی ایک بہت بڑی تعداد آن پڑی اور پھر ان کے ساتھ جا کر ہمارے حملہ آور نے ہماری جان چھوڑی۔ ہم کیمپ کی طرف چلے گئے کیونکہ ہمیں چائے پانی کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

چرواہے، جنھیں عام طور پر گوجر کہا جاتا ہے، انسانی شور شرابے سے دور جنگلی درختوں کے تنوں پر کھڑی کی گئی جھونپڑیوں میں سیدھی سادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں کئی جھونپڑیاں بھوج پتر کے درختوں کی چھال سے محفوظ رکھی گئی ہیں۔ ان گوجروں کے پاس لوگ اکثر دودھ حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں مگر وہ شاذ ہی دودھ فراہم کرنے کی رضامندی ظاہر کرتے ہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ آس پاس کی چراگاہوں میں اپنی بھینسوں کو خوب کھلاتے ہیں لیکن دودھ دینے سے انکاری ہیں۔ اس کی غالباً یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ کئی بار ان سے مقامی سرکاری اہل کاروں نے اچھی خاصی مقدار میں دودھ اور مکھن لے کر انھیں پیسے نہیں دیے۔ مزید یہ کہ وہ اپنا دودھ زیادہ تر مکھن بنانے کے لیے ہی وقف رکھتے ہیں جس سے بعد میں وہ گھی نکالتے ہیں۔ سوداگر لوگ ہر موسم خزاں میں ان گوجروں کے پاس جا کر اُن سے گھی خریدتے ہیں جسے بعد میں بکریوں کی کھالوں میں بند کر کے پنجاب برآمد کیا جاتا ہے۔ یہ گوجر لوگ ہمیشہ خونخوار کتے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان سے وہ ریچھوں اور تینڈؤوں سے اپنے مال مویشی کی حفاظت کا کام لیتے ہیں جو ہمیشہ ان کے شکار کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔

اہل کشمیر کے برعکس گوجر لوگ اپنی جائیداد کی حفاظت کے لیے بے مثال مزاحمت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو کسی بھی لڑائی میں حصہ لینے کی غرض سے چاق و چوبند رکھنے کی خاطر وہ بھاری بھرکم وزن اٹھاتے رہتے ہیں۔ آپ اُن کی جھونپڑیوں کے باہر جنگلی درختوں کے تنوں سے بنے وزنی مگدر دیکھیں گے جن کا وزن پچاس سے ایک سو پونڈ تک ہوتا ہے۔ ان مگدروں کو سختی سے پکڑنے کے لیے وہ ان کے سروں پر گول دستے لگاتے ہیں اور پھر انھیں دونوں ہاتھوں سے اوپر

نیچے کر کے اپنے پٹھوں کو مضبوط بنا لیتے ہیں۔ جب کوئی ریچھ یا تیندوا اُن کے ریوڑ پر دھاوا بولتا ہے وہ پہلے اپنے کتے ان پر چھوڑتے ہیں۔ جب درندے کتوں کے ساتھ لڑنے میں مصروف ہوتے ہیں تو گوجر بھی ان پر کلہاڑیوں اور اُسی رسی سے حملہ کرتے ہیں جس کے پھندے میں وہ حملہ آوروں کو پھنساتے ہیں۔

کشمیر میں ریچھوں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ سیاہ اور بھورا جسے سرخ ریچھ بھی کہتے ہیں۔ سرخ ریچھ قدرے بڑا ہوتا ہے۔ وہ اونچی مرگوں پر رہتا ہے مگر وہ کالے ریچھ کی طرح خونخوار نہیں ہے جو جنگلوں کے نزدیک گھومتا رہتا ہے اور آدمیوں کی رہائشی جگہوں کے عقب میں رہتا ہے۔ وہ عام طور پر میوے اور مکئی کھاتا ہے جسے وہ بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ اگر سرخ ریچھ کو اس کے بچپن میں پکڑا جائے تو وہ ایک دلچسپ پالتو جانور بن جاتا ہے۔ میرے ایک دوست کے ساتھ ایک ایسا ہی ریچھ برسوں تک رہا جو ایک کتے کی طرح اس کی ورزشی دوڑ میں ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ البتہ وہ اُس وقت راہ گیروں سے الجھتا تھا جب اُس کا مالک اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ اپنا پہلا تعارف یاد ہے۔ ایک صبح میں اپنے ایک دوست کو فون کر رہا تھا۔ میں ابھی ابھی باغ میں آیا تھا کہ ایک لحیم و شحیم ریچھ جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور میری طرف لپکا۔ مجھ سے کسی نے کہا تھا کہ انسانی آنکھ سے کوئی بھی حیوان خوف کھا سکتا ہے۔ لہٰذا میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مگر افسوس! وہ غالبًا مجھے اچھی طرح سے نہیں دیکھ پایا اور سیدھے میری طرف بڑھنے لگا۔ میں یہ بھی تصور کرنے لگا کہ وہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آئے گا اور میں کر بھی کیا سکتا؟ پیچھے پلٹ کر بھاگنا ایک برطانوی شہری کے لیے اچھی بات نہیں ہو سکتی۔ اب وہ اتنا قریب آ چکا تھا کہ میں اس کی سانس محسوس کر رہا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ حیوانات اپنے سروں کو کھجانا پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا میں بھی اُس سے اس طرح مخاطب ہوا۔ ''میرے پیارے ریچھ!'' پھر میں اس کے جسم کے ایک حصے کو سہلانے لگا جو اس کی ناک تھی۔ لیکن میں نے اس کے خطرناک پنجوں اور طاقتور ٹانگوں پر نظریں جمائی رکھیں جو مجھے کسی بھی لمحے زیر کر سکتی تھیں۔ میں نے بہر حال اسے یہ باس نہیں دی کہ اس کے ساتھ میری یہ ملاقات میرے لیے سوہانِ روح بن گئی ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس

کی ناک کھجانے کا عمل اب ختم بھی ہوگا کیونکہ ہر بات کی ایک حد بھی ہوتی ہے۔اس طرح نا معلوم وجوہات کی بدولت میری گلوخلاصی ہوگئی۔

ایک اور بار اس ریچھ کو اس کے مالک کے خیمے کے باہر ایک درخت سے باندھا گیا تھا۔ مالک کو کان پھاڑنے والی چیخوں نے جگا دیا۔جب وہ یہ ماجرا دیکھنے کے لیے باہر آیا تو اس نے ایک کشمیری کو زمین پر خوف سے چلاتے ہوئے دیکھا جو زور زور سے کہہ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔اس طرح کا اظہار وہ عام طور پر اُس وقت کرتے ہیں جب وہ ڈر کے مارے بوکھلائے ہوتے ہیں۔اس بے چارے نے بھی خیمے کے پاس سے گزرتے ہوئے ریچھ کو دیکھا تھا اور یہ دیکھے بغیر کہ وہ بندھا ہوا تھا وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا اور اسے یقین ہوا کہ اس کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ریچھ دراصل اسے کوئی زک نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔کالا ریچھ بہت حد تک ایک ناپسندیدہ جانور مانا جاتا ہے۔اسی لیے ہسپتالوں کے وارڈوں میں ان کی کھالیں لٹکتی نظر آئیں گی۔یہ ریچھ جب کسی مرد یا عورت کو دبوچ لیتے ہیں تو انھیں ان کا چہرہ مسخ کرنے میں مزہ آجاتا ہے۔

کبھی کبھی وقتاً فوقتاً ان لوگوں سے دلچسپ واقعات سننے کو ملتے ہیں جو ان سے جان چھڑا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے ہوں۔ریچھ سیدھے ایک انسان کے منہ پر جھپٹتا ہے اور ایک ہی وار سے اس کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔کبھی کبھی وہ اس کی ایک آنکھ بھی باہر نکال پھینکتا ہے۔پھر وہ نیچے گرے ہوئے شکار کے نزدیک جا کر دیکھتا ہے کہ کیا وہ زندہ ہے یا نہیں؟ اگر اسے اندازہ ہو کہ شکار بے حس وحرکت ہے تو وہ اس کے جسم کے کسی حصے کو کاٹتا ہے پھر دور جا کر ایک قبر سی کھودتا ہے تا کہ وقت آنے پر اس زخمی شخص کو دفن کیا جاسکے۔میں نے چونکہ خود ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا ہے لہٰذا میں اس کے صحیح یا غلط ہونے پر بات نہیں کرسکتا۔

ریچھ اپنی عادات میں عام طور پر بہت ہی انسان پسند ہوتے ہیں۔اگر اُن کے جسم کے کسی حصے پر گولی لگی ہو تو وہ اُسی طرح زمین پر لڑھک لڑھک کر اپنے زخم کو سہلاتے ہیں جس طرح میں نے کشمیری قلیوں کو بھی یہی عمل کرتے دیکھا ہے جب اُن کے زخم سے خون رس رہا ہو۔

سیاہ ریچھ گوشت خور ہوتے ہیں۔کچھ سال قبل میرے لڑکے اپنی آیا کے ساتھ ہماری قیام گاہ کے قریب چہل قدمی کر رہے تھے جب انھوں نے ایک کالے ریچھ کو دیکھا جس نے

ابھی ابھی ایک بیل کو زخمی کر کے گرادیا تھا۔ بیل اگرچہ زندہ تھا لیکن ریچھ اس کی پیٹھ پر چڑھ کر اُس کے کوہان کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ دریں اثنا کچھ دیہاتی آ گئے تاکہ حیوان کو بھگایا جائے مگر وہ اپنے شکار کو مزے سے کھاتے ہوئے سبھی کو آنکھیں دکھاتا رہا۔

میں نے ایک سیاہ ریچھ اور ایک ہمالیائی بندر کو کچھ عرصے کے لیے پالا تھا۔ میں ان دونوں کو ساتھ ساتھ کھیلتے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ کبھی بندر ریچھ کی پیٹھ پر سوار ہوتا اور کبھی ریچھ بندر کا ہاتھ پکڑ کر گھومتا نظر آتا اور بندر کے منہ کو چاٹتا۔ اس کے عوض بندر ریچھ کو اس کے بن بلائے افراد سے بچالیتا۔ پھر بھی یہ ریچھ اب تند مزاج بن گیا تھا اور وہ بچوں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے مار کر اس کی کھال ہی کو فرش بنا کر رکھ لیں۔

چند سال پہلے ایک دیہاتی ترکھان میرے لیے ایک چارپائی بنا رہا تھا جس کے لیے اس نے جنگل سے ایک بڑے درخت کو کاٹ لیا تھا۔ میں یہ دیکھتا رہا کہ ایک کالا ریچھ آ کر کئی دنوں تک نجار کے پاس ہی لیٹ جاتا جو چارپائی بنانے میں مگن تھا۔

مجھے یہ نجار بھی جسمانی لحاظ سے کسی ریچھ سے کم نہیں لگتا تھا۔ اُس کا سارا جسم گھنے بالوں سے لدا تھا۔ اگرچہ میں نے بالوں والے کئی کشمیریوں کو دیکھا ہے لیکن اس جیسا اور کوئی میری نظروں سے نہیں گزرا۔ وہ انہی حیوانوں کی طرح سست اور خاموش تھا۔

اکثر کشمیری لوگ ریچھوں سے بہت ڈرتے ہیں مگر اس ترکھان نے گویا اپنی ساری زندگی انہی کے ساتھ گزاری ہو۔ لہٰذا وہ دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ ان حیوانوں کی جان پر ہر طرف سے بن آئی ہے۔

ایک بزرگ پادری نے مجھے بتایا کہ جب وہ جوانی میں کشمیر میں تھا اور ایک دن وادئ سندھ کے اوپری حصے پر چار ہا تھا تو اُس نے کم از کم اٹھارہ ریچھ دیکھے جو میوہ دار درختوں سے پھل توڑ توڑ کر مزے سے کھا رہے تھے اور وہ ان شاخوں سے ہلنے کا نام بھی نہیں لے رہے تھے جن پر وہ سوار تھے۔

ریچھ ریاست پونچھ میں خاص طور پر موسمِ خزاں میں بکثرت دیکھے جاتے ہیں۔ جب وہ مکئی کے کھیتوں پر دھاوا بولتے ہیں۔ پونچھ کے راجہ نے کئی بندوقوں اور اپنے مصاحبوں کے ہمراہ

ایک بار ایک ہی دن میں تیس ریچھوں کا شکار کیا تھا۔

تینندوا ایک پُر اسرار قسم کا حیوان ہے۔ وہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور مال مویشیوں کا بہت نقصان کرتا ہے۔ ہمارے یہاں کئی سال تک ہمسائیگی میں ایک مکان میں ایک مادہ تینندوا رہتی تھی۔ یہ مکان ہمیں اپنے دوست سی۔ ایم۔ ہیڈ و نے کرایہ پر دیا تھا۔ اس حیوان کو مارنے کے لیے ہمارے کئی دوست آگئے لیکن وہ ہمیشہ ناکام ہی رہے۔ یہ مادہ کسی صورت میں اپنے آپ کو پکڑوانے کا موقع نہیں دیتی اگر چہ اسے قابو کرنے کے لیے ایک کتے یا بکری کو بھی چارے کے طور پر باندھا گیا۔ ایک سال میں تو اس نے آس پاس کے گاؤں سے سبھی کتوں کا صفایا کر دیا۔ جس سے ہمیں خوشی بھی ہوئی کیونکہ یہ کتے چالاک چور ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں رات بھر اپنے بھونکنے کی کان پھاڑنے والی آوازوں سے سونے بھی نہیں دیتے۔ تینندوے کے لیے ایک کتا ہر شکار سے زیادہ پسندیدہ کھانا ہے۔ وہ سیدھے کسی کے گھر کے برآمدے تک یا اس کے خیمے میں آکر کتے کو اٹھالے جاتے لیکن خوش قسمتی سے ابھی میرے کتے سلامت ہیں۔

ایک بار جب ہماری قیام گاہ کے باہر ہمارے نوکر رات کا کھانا کھا رہے تھے تو ہمارے پڑوسیوں کے یہاں ایک کتا دروازے کے باہر بچے کچھ کھانے کا انتظار کر رہا تھا۔ نوکروں نے ایک آواز سنی اور دیکھا کہ تینندوا کتے کو اٹھا کے لے جا رہا ہے جو ایک گلہ بان کے کتے کی جسامت کا تھا۔ تینندوے نے اسے اٹھا کر جنگلے پر سے چھلانگ لگائی اور دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اگلی رات کو آخری کتا ہمارے دھوبی کے پاس لیٹا ہوا تھا جو لالٹین کی روشنی میں ایک درخت کے نیچے کھانا کھا رہا تھا کہ تینندوا گذشتہ رات کی طرح ظاہر ہوا اور اس نے پچھلی رات کی طرح اسے بھی دبوچ لیا۔

اگلی رات کو ہم ہتھیار لے کر اس کے آنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ چونکہ اس بار کوئی کتا نہیں آیا ہم نے بکری کے ایک بچے کو ایک ٹوکری میں رکھ کر اسے درخت کی ایک شاخ سے لٹکا دیا۔ ہمیں پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے تینندوے کی موجودگی کا احساس تو ہوا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پھر ہم سوچ میں پڑ کر اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ شاید اسے انسانی زمین پر کی جانے والی چالوں کا

انداز ہ تو ہو مگر وہ پانی اور کشتی سے قطعاً واقف نہیں ہوگا۔ چونکہ ہمارا مکان ایک چھوٹی جھیل کے کنارے واقع تھا۔ ہم میں سے ایک شخص نے ایک شکار پالیا اور پھر وہ نرکلوں کے پیچھے تقریباً پندرہ گز کی دوری پر چھپ گیا۔ چاند نکلا اور آسمان کی طرف چلنے لگا مگر تیندوے کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ آخر کار شکاری کا پیمانۂ صبر لبریز ہوا اور اس نے کہا کہ بکری کو کسی اور جگہ باندھا جائے۔ پھر کنارے پر آ کر شکاری بکری کو کندھے پر اٹھا ہی رہے تھے کہ تیندوا اچھل کر سامنے آیا مگر شکاری کے ایک طرف کھسکنے سے اپنے شکار کو پا نہ سکا۔ بندوق بردار شخص اس وقت ایک گرے ہوئے درخت پر چل رہا تھا اور وہ اپنے ہتھیار سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ یہ سب کچھ اچانک ہوا ہمارا نشانہ پھر چوک گیا پھر ایک مشہور کھلاڑی نے مشورہ دیا کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا بشرطیکہ وہ سردیوں میں یہاں آئے کیونکہ اس وقت حیوان کے پنجوں کے نشان پہچاننے میں آسانی ہوگی۔

وہ جاڑے کے دنوں میں آ گیا اور اس نے برف پر پنجوں کے نشان دیکھے جن کا وہ ایک ہفتے تک تعاقب کرتا رہا۔ اپنے آخری دن وہ ایک دائرے کے ارد گرد گھومتے ہوئے فوراً سمجھ بیٹھا کہ تیندوے نے بھی اپنی چال چلی تھی جسے وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ تیندوا دم زدن میں اس کے عقب میں نمودار ہوا۔ وہ رک گیا اور پھر اس نے دو چمکتی آنکھوں کو اسے تاکتے دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے ہتھیار کو کام میں لاتا حیوان غائب ہو چکا تھا۔

اب ہم نے یہ سوچا کہ ہماری ملاقات ایک غیر معمولی ذہانت والے تیندوے سے ہوئی ہے جس میں انسانی خصائص کے عناصر بھی موجود تھے۔

وہ اگست کی ایک شام تھی جب پہاڑوں کے پیچھے سورج کے ڈوبنے کا منظر بہت ہی اچھا لگتا ہے اور پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں سے نیچے آنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روح کو تازہ کرتی ہے۔ میں اپنے دو بچوں اور کتے کے ساتھ چہل قدمی سے لوٹ رہا تھا۔ میرا لڑکا ایرک کتے کے ساتھ آگے نکل چکا تھا اگرچہ میں نے اسے ساتھ ساتھ رہنے کو کہا تھا۔ کیونکہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں تیندوا کتوں کے شکار میں خوب مزہ لیتا ہے۔ ہم جنگل میں ایک چھوٹی سی گزرگاہ تک پہنچ چکے تھے کہ میری چھوٹی بچی نے میری ٹانگ پکڑ کر حیرانی سے کہا۔ ''ڈیڈی! دیکھو ڈیڈی دیکھو''۔ میں نے اپنی بائیں طرف نظر ڈالی تو ایک تیندوے کو گرجتے ہوئے، اپنی دم اونچی کیے ہوئے اور ناک زمین

پر رگڑتے ہوئے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ گویا صرف چند لمحوں کا معاملہ تھا۔ ہم بُت بنے ساکت و جامد کھڑے رہے۔ اس نے بھی ہمیں اس وقت دیکھا جب وہ ہم سے صرف چھ گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے بھی اپنے آپ کو سمیٹا اور ہمیں اپنی شیشے کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں سے گھورتا ہوا ایک ہی جگہ کھڑا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے سانس کو بھی روکنا ہوگا اور آنکھ کو بھی جھپکنا نہیں ہوگا۔ ہم تینوں مجسموں کی طرح ایستادہ رہے۔ چھوٹی پامیلا نے شاندار طریقے سے اپنا رول ادا کیا۔ اس نے اپنے جسم کے کسی حصے کو جنبش تک نہیں دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ پر سارا بھروسہ کرتی ہے اور میں بھی اس بات سے آگاہ تھا کہ تیندوے کے حملے کی صورت میں اس کا تحفظ میرے لیے کتنا اہم تھا۔ بالآخر یہ خاموشی اس وقت ٹوٹ گئی جب حیوان نے ایک جھپکی لی۔ میں سمجھ گیا کہ میں نے کھیل کا پہلا راونڈ جیت لیا ہے مگر یہ کسے معلوم تھا کہ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ ہمارے دشمن نے اپنی ٹھوڑی اپنے اگلے پنجوں پر رکھی، وہ قدرے جھک گیا، گویا ہمیں سلام کر رہا ہو۔ پھر اس نے ایک اونچی چھلانگ لگائی اور زمین دہل گئی۔ اس نے یہی کرتب بار بار دوہرائے، پھر ایک اور بار ہمیں سلام کیا اور اخیر پر گرجتا ہوا جنگل کے اُسی طرف غائب ہوگیا جہاں ہم نے اسے دیکھا تھا۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس حیوان نے کس طرح ہمیں نوازا اور ہم نے کس قدر راحت محسوس کی جب ہم اس مخمصے سے آزاد ہوگئے۔ مجھے لگتا ہے کی اس مادہ حیوان نے پیٹ بھر کے کھانا کھالیا ہوگا یا پھر وہ اپنے ساتھیوں سے ملی ہوگی۔ یہ بھی قسمت ہی کا کھیل تھا کہ اس نے کتوں کے ساتھ ایرک کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچائی جو ہم سے آگے چل رہا تھا۔ حالانکہ تیندوا آسانی سے انگریزی کتوں کو کھا کر بہت ہی خوش ہو جاتا۔ مادہ تیندوے کے ساتھ میرا واسطہ صرف دو بار پڑا جن میں سے ایک قابل ذکر ہے۔

ایک رات میری بیوی بیمار تھی۔ میں نے نصف شب کو اس کے لیے طبی امداد کا انتظام کیا۔ مجھے چونکہ جنگل میں سے ایک پگڈنڈی کا پتہ تھا لہٰذا میں نے کبھی لالٹین ساتھ نہیں رکھی۔ لیکن میری بیوی نے اصرار کیا کہ مجھے روشنی کا سہارا لینا چاہیے۔ میں نے اُس کی بات مان لی۔ رات بے حد تاریک تھی۔ میں اصطبلوں سے گزر رہا تھا جو ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کا زینہ باہر کی طرف بنایا گیا ہے اور اوپر کے کمرے میں کاٹھیاں رکھی گئی ہیں۔ میں نے کچھ ایسا دیکھا کہ سیڑھیوں پر ایک

شخص بیٹھا ہے جو آہستہ آہستہ ادھر سے اُدھر چل رہا تھا۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ یہ سائیس ہے جو درد کے مارے ایسا کر رہا تھا۔ غالباً اس کی چھاتی میں درد اٹھ رہا تھا۔ میں اوپر گیا اور پوچھا کہ بات کیا ہے؟ میں نے ابھی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ میں نے اپنی کمر پر ہوا سی محسوس کی۔ میرا سائیس غائب ہو چکا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں جنگل کے اپنے پرانے دوست تیندوے سے ہم کلام تھا۔ وہ اب نزدیک آرہا تھا اور شاید ان کتوں کے درپے تھا جنھیں ہم نے ان کے بچاؤ کی خاطر اصطبل کے اندر رکھا تھا۔

اس کہانی کا اخلاقی سبق یہ ہے: ''شوہرو! اپنی بیویوں کی بات مانا کرو!''۔ کیونکہ میں یہ گمان بھی نہیں کرسکتا کہ میں اپنا چہرہ بہ سلامت واپس لاتا اگر میں وہ لالٹین اٹھا کر نہیں نکلتا جسے ساتھ رکھنے کا مشورہ میری بیوی نے دیا تھا۔ یہ ایک حماقت کی بات ہے کہ ایک تیندوے سے گھپ اندھیرے میں بچا جا سکے اور وہ بھی اُس وقت جب وہ بھوکا ہو اور کھانے کی اسے سب سے زیادہ طلب ہو۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل ہے کہ آخر ہمارے جنگل کے دوست کا کیا انجام ہوا ہوگا جس نے ہمارے چور کتوں کو ہڑپ کر کے ہمیں اُن کی وجہ سے راتوں کو جاگنے سے بچایا۔ آس پاس کے دیہاتوں میں کتوں کی تعداد بھی بڑھ چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مادہ تیندوا کشمیر کے دوسرے جنگلوں میں شکار کر رہی ہوگی یا کہیں اور اپنی برادری کے حیوانوں کے ساتھ دیگر شکار گاہوں میں گھوم رہی ہوگی۔

ان جنگلوں میں کئی اور حیوانات بھی موجود ہیں جن کے ساتھ کسی دن علی الصباح یا شام کو سامنا ہو جاتا ہے۔ یہاں وحشی سور بھی ہیں جو اندھیرے میں ریچھ جیسے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ وہ بھی جھاڑیوں کو روند کر اپنی راہ بناتے ہیں۔ گیدڑ بھی یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

سیاہ گوش جانور کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ تیندوے کے ساتھ شکار کرتا ہے تا کہ اسے بھی شکار کا جھوٹا حاصل ہو سکے۔ چیڑ کے درختوں سے وابستہ سمور خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ دیکھنا مشکل نہیں ہے کہ وہ کہاں کہاں ملبے کے نیچے سرو کے پیڑوں تلے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔

ہمالیہ کا چھوٹی دم والا بندر سارے جنگل میں دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اجتماعی طور پر بڑے

بڑے گروہوں میں رہنے کا عادی ہے۔ ان بندروں کو غور سے دیکھنے میں مزہ آجاتا ہے۔ وہ عجیب آوازیں نکالتے ہوئے درختوں کی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھد کتے ہیں اور اگر انھیں کسی خطرے کی بو محسوس ہو تو وہ اپنے بچوں کو آوازیں دیتے ہیں اور یہ بچے بھی فوراً ان کی پیٹھ پر سوار ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بندروں کے یہ بچے بہت ہی دلچسپ مخلوق ہوتے ہیں۔

بندروں کو ایک سادہ پھندے کے استعمال سے پکڑا جا سکتا ہے۔ چاول سے بھرا ہوا مٹی کا ایک گھڑا اُن کے راستے میں رکھا جاتا ہے۔ جس کا گول دہانہ تنگ ہوتا ہے تاکہ جب وہ خالی ہو تو بندر کا ہاتھ اُس میں آسانی سے جا سکے۔ لیکن جب اس کا یہی ہاتھ چاول سے بھر جاتا ہے تو پھر اسے باہر نکالنے میں دقت آتی ہے۔ بندر اس تیار کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے لیکن ایک انسان کے سامنے آنے پر وہ اسی ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ چاول بھر کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ہاتھ باہر نکلنے سے رہا اور وہ پکڑا گیا۔ اُس احمق میں اتنی بھی عقل نہیں کہ وہ چاول کو برتن ہی میں چھوڑ کر اپنا ہاتھ بغیر کسی حجت کے نکالتا۔

جو بندریا میں نے پہلی بار لے لی وہ ایک اچھی دوست ثابت ہوئی۔ وہ میرے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی لیکن جب ہم ایک جھٹکا کھاتے تو وہ گھبرا سی جاتی اور پھر میرے کندھے یا سر پر اپنی جگہ بنا لیتی۔ وہ میری ناک اور کان بھی پکڑ کے رکھتی جس سے مجھے بہت کوفت ہوتی۔ یہ بندریا میرے ہمراہ کشتی میں بھی سوار ہوتی اور وہ تیرتی بھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بیحد فرماں بردار تھی۔ میں اسے باغ میں کھلا چھوڑتا اور جب بھی بلاتا تو وہ فوراً لوٹ کے آجاتی۔ لیکن میں اسے ایمانداری سکھانے میں ناکام ہی رہا۔ وہ اُس کھانے پر چوری کا کھانا پسند کرتی جو ہم اسے متواتر فراہم کرتے رہتے۔ مثال کے طور پر ہم جھیل میں ایک ہاؤس بوٹ میں رہتے تھے اور ہمیں ان دوستوں کا انتظار تھا جنھیں ہم نے چائے پر بلایا تھا۔ لہٰذا کیک اچھی خاصی تعداد میں تیار کیے گئے تھے۔ یہ بندریا، جس کا نام ہم نے سُندری رکھا تھا جس کے معنی کشمیری میں ایک خوبصورت عورت کے ہوتے ہیں، بوٹ کے اگلے دروازے سے نکل کر آئی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کیک لیے ہوئے تھی اور ایک تو اس نے منہ میں بھی ڈال رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی دونوں بغلوں میں بھی دوسری قسم کا ایک ایک کیک دیکھا گیا۔ جونہی اسے لگا کہ میں

نے اسے دیکھ لیا ہے وہ ایک چھلانگ لگا کر چھت کی طرف اچھل کر لپکی اور زینے چڑھتی ہوئی بوٹ کے عرشے پر جا پہنچی۔ اس حال میں وہ صرف اپنی ٹانگیں اور کہنیاں استعمال کر سکتی تھی کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ اور بغلیں کیکوں سے بھری تھیں۔ پھر اس نے ایک عالم بے بسی میں یہ کیک ہڑپنا شروع کیے لیکن اسے اس کا افسوس ہی رہا کیونکہ یہ سارے کیک بیک وقت اس کے منہ میں نہیں سما سکتے تھے۔ لہٰذا ان کو کھانے سے پہلے ہی اسے پکڑا گیا۔ پھر سزا شروع ہوئی۔ اسے جھیل میں غوطے لگوائے گئے جسے اُس نے خاموشی سے قبول کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اسی کی مستحق تھی۔ مزید یہ کہ اس نے کم از کم تین کیک ہضم کیے تھے اور وہ اس سے بھی مطمئن تھی۔

سندری دیر تک ہمارے چھوٹے بچے کے ساتھ ہتھ گاڑی میں بیٹھ جاتی۔ وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے۔ وہ ایک پیاری سی آواز نکالتی گویا وہ اسی کا بچہ تھا۔ اسے اس عمل میں مداخلت کرنے والے ہمارے ایک اور نوکر سے سخت چڑ تھی۔ یہ بد بخت ان کی اس خوشی میں خلل ڈالنے کی غرض سے بچے کو کھانے یا سلانے کی خاطر اٹھا کر لے جاتا۔ مجھے عام طور پر اس مرحلے کو آسان بنانے کی غرض سے سامنے آنا پڑتا اور نوکر کی قسموں اور سندری کی کاٹ کو بند کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑتا۔ سندری کو اکثر بندروں کی طرح وہ شخص بالکل ناپسند تھا جو اس پر ہنس کر اسے چڑاتا۔ وہ ان لوگوں سے بھی نفرت کرتی تھی جو اس کے سامنے اپنے منہ کھول کر اس کا مذاق اڑاتے۔ لیکن جو اس کی عزت کرتے اور سنجیدگی سے پیش آتے انھیں وہ پیار کرتی۔

کشمیر کے جنگلات کئی دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ کیونکہ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ اس کے راستے میں کون سا حیوان، پرندہ یا کیڑا آ جائے۔ ایسا خاص طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی ستانے کی خاطر کسی درخت کے سائے تلے، جھاڑی میں یا کسی چٹان پر بیٹھ جائے اور اس کے کان اور آنکھیں کھلی ہوں۔

جنگل میں میری نظروں میں ایک خامی یہ ہے کہ یہاں انخور نام کا ایک درخت پایا جاتا ہے۔ یہ ایک شاندار پیڑ ہے اور اس کے پتے سبز ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا رس زہریلا ہوتا ہے۔ اس کا اثر کئی لوگوں پر دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ میں خود تین بار اس کی وجہ سے بیمار پڑ گیا جب میں نے غیر شعوری طور پر اسے چھوا۔ اس کے بعد میرے جسم کو جہاں جہاں میرے ہاتھوں نے چھوا

وہاں بڑے بڑے چھالے پڑ گئے۔ اور پھر مجھے سخت بخار چڑھ گیا۔ کوئی دوائی کام نہیں آئی اور اس علالت نے مجھ سے اپنا پورا وقت لیا۔ کشمیر کے لوگ بری طرح اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ اس کا استعمال اُس وقت کرتے ہیں جب انھیں اپنے کسی دشمن کو سزا دینا مطلوب ہو۔ میں نے اس دشمن سے بدلہ لینے کے لیے کئی ایسے درخت جڑ سے اکھاڑ لیے۔

تیسرا باب

وادی کے قصبہ جات

صنوبر کے درختوں سے مالا مال باوقار پہاڑوں پر کھڑے ہو کر جنگل میں ایک کھلی جگہ سے نیچے دیکھتے ہوئے ساری وادیٔ کشمیر نظروں کے سامنے پھیلتی ہے۔ یہاں پر کھڑا کوئی بھی شخص تخیلات کی دنیا میں جا کر سوچتا ہے جیسے موسیٰ پسگاہ کے پہاڑ پر اُس سرزمین (Promised Land) کا منظر دیکھ رہا ہے جس کا اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔ کشمیر بلاشک دودھ اور شہد کی سرزمین ہے۔

ہمارے دائیں بائیں راستے پر مال مویشیوں کے مرگیں ہری گھاس سے بھری پڑی ہیں اور پھولوں کے گلستان شہد کی مکھیوں کو دعوتِ عام دیتے ہیں۔ نیچے آنکھوں کے سامنے درختوں کے جھنڈ دیکھے جا سکتے ہیں جو ایک وسیع سمندر کی طرح سورج کی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ گاؤں جزیروں کی طرح ہیں اور اُن سے پرے آپ کو سری نگر کا شہر دکھائی دے گا جہاں ہندو مندروں کے کلس سورج کی شعاعوں کو پکڑ رہے ہیں اور پھر جھیل ڈل نظروں میں آئے گی جو پانی پر بہنے والے سبزی کے کھیتوں اور دیگر باغات سے آباد ہے۔ اس کے اوپر عظیم الشان پہاڑیاں اور پھر اُس سے بھی دور او نچائی پر برف پوش پہاڑوں سے بھی بلند گلگت کا قریبی خطہ نظر آ جائے گا جہاں ننگا پربت اپنا سر اور کندھے عمودی چٹانوں کی دنیا سے اُبھر کر شان سے کھڑا ہے۔

وادیٔ کشمیر میں صرف ایسے چار مقامات ہیں جنھیں قصبے کہا جا سکتا ہے۔ان کے نام سری نگر، بارہمولہ، سوپوراور اسلام آباد ہیں۔راجدھانی سری نگر کا شہر وادی کے وسط میں واقع ہے جس کی آبادی ایک لاکھ تیس ہزار ہے۔بارہ مولہ کا محل وقوع جنوب مغرب ہے(1) جہاں دریائے جہلم ایک گہرے کوہستانی درّے سے وادی سے نکل کر اور ایک جھاگ دار طوفان بن کر تین ہزار فٹ نیچے گرتے ہوئے میدانی علاقوں کی جانب بہتا ہے۔

بارہمولہ کی آبادی چھ یا سات ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔اس برآمدی قصبے میں وادی بھر سے دریائی راستے سے لیے جانے والا سامان سڑک پر منتقل ہو جاتا ہے۔جسے بعد میں بیل گاڑیوں کے ذریعے جہلم ویلی روڈ سے دس دن تک پنجاب میں راولپنڈی پہنچایا جاتا ہے۔

یہاں سے زیادہ تر جو اشیا باہر بھیجی جاتی ہیں اُن میں سیب، ناشپاتی اور اخروٹ جیسے میوہ جات، کھالیں اور مختلف اقسام کی غذائی اجناس، گھریلو اونی اشیا، ایک بڑی سرکاری سِلک فیکٹری سے حاصل شدہ ریشم، قالین اور یارقندی ٹوپیاں شامل ہیں۔البتہ چاول کی برآمد پر پابندی عائد ہے۔

ریلوے کے لیے خاص طور پر دیودار کے شہتیر جہلم میں بارہمولہ کے راستے بھیجے جاتے ہیں جو خراب سفر میں چار سو فٹ نیچے گر کر دو سو میلوں تک بہائے جاتے ہیں۔

بارہمولہ قصبے کو، جسے مقامی لوگ ورہ مُل کہتے ہیں، قدیم نام دراصل وارامل تھا، پرانے زمانے سے بہت تقدس حاصل ہے کیونکہ اسے ادی وارا ہا یعنی ماقبل تاریخ کے سور کے جنم میں وشنو کی قیام گاہ بتایا جاتا ہے۔

اس مقدس جگہ کی حکایت نیلہ مت پوران میں بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یوں ہے۔شدکا سورا نام کا ایک دیو کرۂ ارض کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔اس سے دیوتا بے حد پریشان تھے کیونکہ اس طرح وہ پرتھوی یعنی زمین کی دیوی اور ابدی ویدوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔جس جگہ شدکا سورا اس چوری کے بعد آرام کر رہا تھا اُسے وارامولا یعنی سور کی پناہ گاہ کہا گیا۔اس حکایت میں ایک زبردست سیلاب کا بھی ذکر ہے جس میں کرۂ ارض ڈوب گیا اور بعد میں پانی کی سطح کم ہو جانے سے دوبارہ نمودار ہوا۔

دارا ہا کا پرانا مندر موجودہ کوٹی تیرتھ، جو مغربی سمت میں دریا کے کنارے واقع تھا، کشمیر کی ایک مشہور عبادت گاہ رہا ہوگا۔ کوٹی تیرتھ میں پائے گئے قدیم لنگ اور مجسمے غالبًا اسی مندر کے ہوں گے۔ یہ عبادت گاہ اور اس میں دارا ہا کی مقدس شبیہ کو سکندر بُت شکن نے تباہ کر دیا۔

اس سے کوئی دس میل دریا کے اوپری حصے میں مشرق کی طرف سوپور ہے جس کی آبادی نو ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ یہ قصبہ تب سے نہیں بدلا ہے جب میں نے اسے پہلی بار 1890 میں دیکھا تھا۔ یہ خوب منظر ہے کیونکہ یہ دریا کے دونوں کناروں پر واقع ہے جو یہاں پر دو سو فٹ یا اس سے کشادہ ہے۔ اسے دیودار کے (شجرِ الٰہی) ایک جھولتے ہوئے پل سے جوڑا گیا ہے۔ گھاس پھوس کی چھتوں اور لکڑی کے میناروں والی مسلمانوں کی مسجدیں اور ٹین کے کلسوں والے ہندوؤں کے مندر اس کی دلچسپی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ سڑکیں نہایت تنگ، گندی اور نا قابل برداشت حد تک بد بودار ہیں۔ یہ ولر جھیل کا بڑا گھاٹ ہے لہٰذا یہاں جھیل کی پیداوار کا اہم بازار ہے جس میں مچھلیاں، سنگھاڑے اور آبی پرندے شامل ہیں۔ موسمِ خزاں میں مچھلیاں پکڑنے والے خاص طور پر مہاشیر مچھلی پکڑنے آتے ہیں جس کا وزن کبھی کبھی چودن پونڈ تک دیکھا گیا ہے۔

اس قصبے کی سب سے بڑی خرابی یہاں کے مچھر ہیں جو ماحول پر چھائے رہتے ہیں۔ یہ ایسی کثرت سے یہاں موجود ہیں کہ کسی شخص کے لیے انھیں بھی نگلے بغیر کھانا کھانا مشکل ہے۔ مچھیرے اپنی ماہی گیری کے لیے بہت پریشان رہتے ہیں جب تک کہ انھیں اچھا خاصا شکار نہ ملے۔

ایک دن ایک افسر مچھلیاں پکڑ رہا تھا کہ دریں اثنا چند کشتی بان آئے اور کہنے لگے کہ انھوں نے ایک ریچھ کو جھیل میں تیرتے ہوئے دیکھا ہے۔ انھوں نے اس سے کہا کہ وہ اسے گولی مار دے۔ پہلے پہل اسے اس کہانی پر یقین نہیں آیا لیکن بعد میں وہ اپنی بندوق لیے ان کے ساتھ جانے پر رضامند ہوا۔ کچھ دیر بعد جب کشتی بانوں نے وہ جگہ دیکھی تو وہاں واقعی ایک ریچھ ان لوگوں سے کوئی پانچ چھ میل کی دوری پر کنارے کی طرف تیر رہا تھا۔ بدقسمتی سے اسے تیرنے کا کام مکمل کرنے نہیں دیا گیا جسے میری رائے میں محض ایک کھیل کھیلنا نہیں کہا جا سکتا۔

اس سے مجھے ایک اور ایسا ہی واقعہ یاد آیا جو کچھ عرصہ پہلے شہر کے نزدیک جھیل ڈل میں

پیش آیا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں پہلے ہی جنگلی جانوروں کے بارے میں لکھ چکا ہوں لیکن یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا لہٰذا مجھے اسے بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔

دو برطانوی افسر نسیم باغ میں، جو اس خوبصورت جھیل کا بہترین اقامتی میدان ہے، کیمپ لگائے تھے کہ چند مانجھی پر جوش انداز میں ان کے پاس آکر انھیں یہ اطلاع دینے لگے کہ پاس ہی ایک جزیرے میں ایک تیندوا بیٹھا ہے۔ افسروں نے اس پر اعتبار نہیں کیا کیونکہ ان کے خیال میں کوئی تیندوا گرمیوں کے دنوں میں شہر کے قریب نہیں آئے گا جبکہ اسے پہاڑیوں پر وافر خوراک ملے گی۔ بہر حال کشتی بانوں نے انھیں تیندوا دکھانے کا یقین دلایا تو یہ لوگ جزیرے کی طرف چل پڑے۔ ایک مانجھی نے انھیں ایک چھوٹی سی کشتی میں بٹھایا جو بید کے درختوں کی قطاروں سے گزرتی ہوئی ایک جگہ پہنچی۔ ایک افسر بندوق لیے ناؤ کے بیچوں بیچ کھڑا تھا، دوسرا کشتی کے کنارے پر تھا اور مانجھی ناؤ کو کھے رہا تھا۔ جب مانجھی کشتی کو مقررہ جگہ پر روکنے میں ناکام ہوا تو انھوں نے واقعی تیندوے کو دیکھا جس نے فوراً ان پر چھلانگ لگائی۔ کونے پر بیٹھا افسر اور ملاح دونوں پانی میں گر گئے۔ جب انھوں نے اپنے سر باہر نکال کر ایک دوسرے کو دیکھا تو انھیں لگا کہ وہ تیندوے کی زد میں ہیں لہٰذا اوپر جا کر مر جانے سے بچنے کی خاطر انھوں نے پھر پانی میں ڈبکی لگائی۔ دریں اثنا بندوق والے افسر نے ایک گولی بے چارے حیوان کے سر میں داغ دی جو اپنی زندگی بچانے کے لیے جی جان سے لڑ رہا تھا۔

اسلام آباد، جہاں دس ہزار باشندے رہتے ہیں، وادی کے مشرقی سرے پر واقع ہے۔ یہ سری نگر سے دریا کے ذریعے اڑتالیس اور سڑک کے راستے صرف تینتیس میل دور ہے۔ اسلام آباد گندھک کے گرم چشموں اور ناخوردنی مچھلیوں کے تالابوں کے لیے مشہور ہے جو دریا کے کناروں پر ہندوؤں کے مندروں سے منسلک ہیں۔ ان چشموں سے اُن لوگوں کو بہت شفا ملتی ہے جو جلد کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں جسے مقامی زبان میں 'کچھن' کہتے ہیں۔ چونکہ اس خاص بیماری سے تقریباً ہر کشمیری متاثر ہوتا ہے یہ چشمے اس کے علاج کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اس قصبے کو ہندو اننت ناگ کے نام سے پکارتے ہیں جس کے معنی 'کئی چشموں کی جگہ' ہے۔ شال کے کاروبار کی اسلام آباد سب سے بڑی منڈی تھی مگر اب ان دستکاریوں میں کشیدہ کاری، فرش کے

لیے گبھے، نمدے اور ناقابل استعمال اونی کمبلوں سے پردے بناتا ہے۔ یہاں کے ترکھان لکڑی کا رنگین ساز وسامان بنانے میں ماہر ہیں۔ وہ اپنی لکڑی کی کاری گری کی اشیا پر رنگ وروغن چڑھا کر انھیں بے حد خوبصورت بناتے ہیں۔ وہ چرخے، موم بتیاں، برتن اور پیالے بنانے میں بھی اپنی فن کاری کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔

فٹ نوٹ

(1) بارہمولہ اصل میں سری نگر شہر کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ مصنف نے غالباً نادانستہ طور پر اسے جنوب مغرب لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

چوتھا باب

کشمیر کے لوگ

راجہ حانی سری نگر کے اپنے دورے کے بیان سے قبل اس خوش منظر اور خوبصورت شہر کے لوگوں کے کردار اور عام شکل وشباہت کے بارے میں کچھ کہنا برمحل ہوگا۔

اہل کشمیر اصل میں آریائی نسل کے ہیں اور وہ خوبصورت بھی ہیں۔ان کی عورتیں بھی خوش شکل ہوتی ہیں۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے بہت سی خوبصورت خواتین کو نہیں دیکھا ہے۔لیکن کشمیری عورتیں اگر صاف ستھرا لباس پہنیں تو میں اپنی یہ رائے بدل دوں گا۔اس کے علاوہ اونچے طبقے کی عورتوں کو سڑکوں پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ جو خواتین زنانے میں آتی ہیں ان میں سے اکثر بیحد حسین ہوتی ہیں۔

یہ خیال عام ہے کی کشمیری اسرائیل کے گم شدہ قبیلے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کئی لوگوں کی ناک یہودیوں جیسی ہوتی ہے اور پیسے سے ان کا لگاؤ اور اپنے ہمسائے سے بڑھ چڑھ کر رہنے کا لالچ اس دلیل کو سہارا دیتا ہے۔

ان کے خدو خال ہندوستانی پڑوسیوں سے زیادہ گورے ہوتے ہیں۔ جو قصبوں میں رہتے ہیں وہ مقابلتاً بہت خوبصورت ہوتے ہیں جنھیں یورپی باشندوں کے ساتھ مشابہت دی جا سکتی

ہے۔ہندوعورتیں اور بچے یونانیوں کی طرح کسی حد تک نفیس شباہت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے گال گلابی اور خدوخال پیازی ہوتے ہیں۔چند ایک کی آنکھیں نیلی اور بال سرخی مائل ہوتے ہیں لیکن انھیں اچھے بال تصور نہیں کیا جاتا۔لہٰذا ان پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا جاتا۔
ان کی خوش کن شکل وصورت اُس وقت اور بھی نکھر آتی ہے جب انھیں کسی ہندوستانی یا یوروشیائی یعنی اینگلو انڈین نسل کے لوگوں کے ساتھ ایک ساتھ دیکھا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک منظر نے میرے ذہن پر نقوش ثبت کیے ہیں جس کا تعلق ایک اینگلو انڈین اور اُس کے نوکر سے ہے۔یہ اینگلو انڈین توے کی طرح کالا تھا۔وہ گرمیوں میں ایک دن پیدل اپنے دفتر جارہا تھا اور کشمیری نوکر، جو اپنے یورپی خدوخال، نیلی آنکھوں، بھورے گالوں اور ایک روشن چہرے سے صاف طور پر پہچانا جاسکتا تھا، اپنے مالک کے پیچھے پیچھے چھتری لے کر اسے دھوپ سے بچانے کی کوشش میں لگا تھا۔نوکر کے ہاتھوں میں مالک کی کتابیں بھی تھیں۔ یہاں مشرق میں یہ عادت بڑے لوگوں کے معیار زندگی کی برتری میں شامل ہے کہ ان کے پیچھے پیچھے ایک نوکر ان کا ساز وسامان لے کر چل رہا ہو۔

کشمیری پنڈت (ہندو) سرکاری اہل کار ہر صبح اُس وقت دوسروں کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے جب کسی دفتر کا بڑا افسر اپنے گھر سے دفتر کی طرف شاہانہ انداز میں ایک بیل کی طرح سست رفتار سے چلتا تھا اور اُس کے پیچھے پیچھے اُس سے کم درجے کے اہل کار اور نوکر ہوتے تھے۔

میں نے کم از کم تیس مرتبہ دیکھا ہوگا جب یہ لوگ خراماں خراماں ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے ہوں تو گویا کوئی جنازہ جارہا ہو۔اس سے شاید یہ تاثر دلانا مقصود ہے کہ یہ سرکاری کارواں اعلیٰ مرتبت والوں کا ہے جن کے لیے وقت کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔

یہ سبھی صرف ایک ہی قطار میں چلتے ہیں۔جو اہل کار دوسرے سے برتر درجے کا ہوتا ہے وہ کم درجے کے ملازموں سے آگے چلتا ہے، سب سے بڑا افسر سب سے آگے ہوتا ہے اور پھر اس کے ماتحت ملازم اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔کبھی کبھی بڑا پنڈت افسر بڑبڑاتے ہوئے دبے دبے لفظوں میں اپنے کسی ماتحت سے کچھ کہتا ہے جو ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے آجاتا اور اس کا سر

تابعداری کے انداز میں جھکا ہوتا ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ اس چھوٹی سی فوج میں اکثر افراد افسر کے گھرانے کے نمک خوار تھے۔ ان میں اُس کے کئی مفلوک الحال قرابت دار بھی شامل تھے جو مالک کی خیرات پر پلتے۔ وہ انھیں اس لیے کھلاتا پلاتا تا کہ اس کی اور اُس کے گھرانے کی شان اور عظمت قائم رہے۔ اب تو سستی سے چلنے کی عادت ختم ہوتی جارہی ہے کیونکہ اب وقت کی اہمیت کا احساس جاگ رہا ہے۔

ایک بار میں ایک پنڈت منشی کے ساتھ سفر میں تھا۔ وہ ایک خوشگوار دن تھا۔ میرے خچر کو بھی اس بات کی خوشی تھی۔ لیکن منشی میرے ساتھ چلنے میں اتنا ہی تیز تھا کہ میں سولہ قدم آگے بڑھتا اور وہ صرف درجن بھر قدم اٹھاتا۔ اُسے میرا یہ تیز چلنا بھی گوارا نہیں تھا اور وہ بار بار چلاتا کہ ذرا رک جائیے۔ میں ٹھہر گیا اور منشی بھی میرے نزدیک آ پہنچا آتے ہی وہ کہنے لگا۔ "ارے صاحب! آپ کیوں اس طرح کی تیز سواری کرتے ہیں؟ دوسرے کریں تو کریں۔ میں کوئی بادشاہ تو نہیں ہوں"۔ بہر حال منشی اب رونے کو ہی تھا کہ میں نے اس پر ترس کھا کر مقابلتاً کم رفتار سے سفر جاری رکھا۔ مگر اُس شاہانہ رفتار سے نہیں جس کا تصور اس کے ذہن میں تھا۔

قصبوں کے رہنے والے دیہاتی اور پہاڑی علاقوں کے باشندوں سے جسمانی لحاظ سے بہت مختلف یعنی کمزور اور کوتاہ قد ہوتے ہیں کیونکہ ان کا زیادہ کام کاج اور کارگزاری اندرون خانہ ہوتی ہے۔ جس میں بُنائی یا سوزن کاری یا کلرکی جس میں وہ میزوں پر جھکے ہوتے ہیں اور جو کبھی ورزش کرنے یا کھیلوں میں شامل ہونے کے بارے میں نہیں سوچتے۔ اُن کے پاس ایسے مشاغل بھی نہیں جن سے وہ اپنا فاضل وقت گزار سکیں۔

وہ اس وجہ سے بھی لاغر لوگ ہیں کہ قصبوں میں گندگی اور آلودہ ہوا انھیں علالتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ان کی زندگی کا عرصہ بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ ان میں سے اکثر ہڈیوں اور جلد کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کی وبائیں ان کی زندگیوں میں تباہی لاتی ہیں۔ آپ ہر شخص کو چیچک کی بیماری کا شکار دیکھیں گے۔ اس بیماری سے صرف وہی بچ پاتے ہیں جو وقت پر ٹیکے لگواتے ہیں ورنہ ہر پانچواں فرد چیچک کا مریض ہے اور کئی تو اس سے آنکھوں کی بینائی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہر چار یا پانچ سال میں گرمیوں کے موسم میں طاعون سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کو نگل جاتا ہے۔ شہر میں تپ محرقہ بھی عام ہے اور اس سے آبادی کا بہت بڑا حصہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

تعلیم کے شعبے میں ترقی کی بدولت اب لوگ اس بات سے واقفیت حاصل کرنے لگے ہیں کہ بیماریاں جراثیم کی وجہ سے پھیل جاتی ہیں اور اس میں اللہ کی مرضی شامل نہیں ہے۔ البتہ ہندو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ بیماریاں دیوی دیوتاؤں کی مرضی سے ہی پھیل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب چیچک کسی خاندان پر حملہ کرتی ہے تو اس گھرانے کے افرادِ خانہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ شیتلی ماتا یعنی چیچک کی دیوی نے ان کے معمولی گھر میں پرویش کیا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ کشمیری ہندو چیچک زدہ بیمار کو ٹیکے لگانے سے منع کرتے ہیں۔

قصبوں میں ایسے حالات کو تبدیل کرنے میں وقت لگے گا کیونکہ لوگ خود بخود کوئی بہتری لانے کے خلاف ہیں۔ وہ ہر نوع کی تبدیلی کا بس یہی ایک جواب دیں گے۔ ''ہمارے آباواجداد اسی طرح مطمئن تھے تو بھلا ہم کیوں ان کو بدل دیں؟'' ایک ہیلتھ افسر جو تربیت کے لیے انگلستان گیا تھا، ایک صبح میرے پاس آ گیا۔ وہ نہایت دل برداشتہ تھا۔ اس نے کہا کہ ایک جگہ ایک نہایت ہی گندی نالی ساری غلاظت، کو دریا میں بہادیتی ہے۔ اس نے اس کے نیچے اینٹوں کا فرش بچھا کر پانی کو صاف رکھنے کی کوشش کی۔ اُس نے مزید بتایا کہ پڑوس میں رہنے والے برہمن پجاری اس کے پاس آئے اور اسے تنبیہ کی کہ وہ اس کام سے باز آئے جیسا کہ ان کے اجداد نے کہا تھا۔ ہیلتھ افسر بھی اپنے ارادے پر ثابت قدم رہا مگر برہمنوں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ نہ مانا تو وہ اس نالی کے اوپر لیٹ کر اس سے کہیں گے کہ وہ اُنھیں کے اوپر اینٹیں ڈال دے۔ وہ بے چارہ مخمصے میں پڑ گیا۔ میں نے اسے صلاح دی کہ وہ اپنا کام کرے مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ گندی نالی جوں کی توں رہی اور برہمن اور ان کے افرادِ خانہ اسے پاخانے کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ میری رائے میں مشرق میں بہتری کا کوئی کام عجلت میں کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

دیہاتوں میں رہنے والوں کی عادات بھی شہر میں رہائش پذیر باشندوں جیسی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ گاؤں میں لوگوں کو تازہ ہوا میسر ہے جو ان کی اچھی صحت اور جسمانی رکھ رکھاؤ

کا باعث بنتی ہے۔ دیہاتیوں کی گھر سے باہر کی زندگی بہتر طور پر اچھی ہے جبکہ ان کے جسم مسلسل محنت سے مضبوط بن جاتے ہیں۔ البتہ جاڑوں میں وہ بھی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو گھروں میں ہی بند کرتے ہیں۔ وہ اپنے مال مویشیوں کو مکان کی نچلی منزل میں رکھتے ہیں اور خود اوپر کے حصے میں رہتے ہیں۔ وہ ہر سوراخ یا کسی بھی کھلی جگہ کو کیچڑ یا گھاس سے ڈھکتے ہیں تا کہ تازہ ہوا بھی اندر نہ آ سکے۔ نتیجے کے طور پر اُن کا کمرہ اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ نمی چھت سے ٹپکنے لگتی ہے۔ یہ لوگ اوپر کی منزل میں اس لیے رہائش اختیار کرتے ہیں کہ نیچے سے گایوں اور بیلوں کی گرمی اوپر آ کر انھیں بھی حرارت فراہم کرتی ہے۔ اس طرح وہ سردیوں کے موسم میں خوش اور مطمئن رہتے ہیں جس میں ان کا کوئی اضافی خرچہ نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب کے لوگ جن کے پاس قیمتی کوئلہ ہے، کشمیری گھرانوں میں سرما کی غیر صحت مندانہ صورت حال کے باوجود، اس انتظام سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

موسم خزاں میں بیل گاڑیوں کے ذریعہ مال ڈھونے سے پہلے جہلم ویلی روڈ پر آپ سینکڑوں قلیوں کو دیکھتے ہیں جو دو سے تین من سیبوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھائے دو سو میل کے سفر پر نکلتے ہیں۔ ہر قلی اپنے ساتھ ڈھائی فٹ لمبی ایک موٹی چھڑی ساتھ رکھتا ہے جسے وہ میوے کی بوریوں اور اپنی پُشت کے بیچ میں پھنسا کر اپنے بوجھ کو ہلکا کر لیتا ہے۔ اسے تکان اتارنے کی ضرورت پڑتی تو وہ اسی چھڑی کو بوجھ تلے رکھ لیتا اور اپنا بوجھ بغیر کسی تکلیف کے اُتار لیتا ہے۔ یہ لوگ ہر پچاس گز کے بعد سستا لیتے ہیں۔ اس طرح سیبوں کی یہ کھیپ بارہ دن میں راولپنڈی پہنچائی جاتی ہے۔

ان کی عورتیں روزانہ چکی پیسنے اور چاول کو اوکھلی (کشمیری: کنز) میں موسل (کشمیری: مُہل) سے کوٹنے کی مصروفیات سے اپنے پٹھے مضبوط بنا لیتی ہیں۔ اوکھل درخت کا پانچ فٹ چوڑا گول حصہ ہوتا ہے جو دو فٹ اونچا ہوتا ہے۔ موسل لکڑی کا پانچ فٹ لمبا دستہ ہے جسے ایک ہاتھ سے بھی بہ آسانی پکڑا جا سکتا ہے۔ یہ ایک محنت طلب کام ہے جس میں ایک کھانے کے لیے چاول تیار کرنے میں ڈیڑھ گھنٹہ بھی لگ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عورتیں گھریلو کام کاج کے علاوہ کھیتوں کو بھی سنبھال لیتی ہیں اور اسی پر ان کی زندگی کا دارومدار ہے۔

جب قلی اور دوسرے محنت کش حد سے زیادہ تھک جاتے ہیں تو وہ ایک مقامی طریق کار کے تحت پیٹ کے بل زمین پر لیٹ جاتے ہیں۔ پھر اپنے ساتھی سے مالش کروانے کو کہتے ہیں۔ یہ ساتھی مالش کے مطلوب شخص کے جسم پر اپنی انگلیاں آہستہ آہستہ اوپر نیچے پھیرتا ہے۔ وہ پہلے اس کے پاؤں کو سہلاتا ہے اور پھر اس کی ٹانگوں اور کمر سے لے کر اس کی گردن تک پہنچتا ہے۔ اس دوران وہ اپنی انگلیاں اس کے پٹھوں میں زور سے دباتا رہتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنے سارے جسم کو زور زور سے ہلاتا ہے۔ پھر یہ محنتی لوگ اپنا اپنا بوجھ اٹھا کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ میں نے اس قسم کی مالش کو کبھی نہیں آزمایا مگر ان کے مالش کرنے کے ایک اور طریقے پر عمل کیا جسے میں نہایت تازگی بخش کہہ سکتا ہوں۔

ان میں سرحدی ریاستوں خاص کر گلگت، ہونزار (1) اور نگر میں جو لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں وہ عمدہ ذات کی نسل کے ہیں۔ وہ کشمیریوں سے بالکل مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ پیدائشی کھلاڑی ہیں جو پہاڑوں کی چٹانوں میں کوہستانی بکروں کا شکار کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ خود بھی انہی بکروں کی طرح سخت جان اور مضبوط جسم والے بن جاتے ہیں۔

فٹ نوٹ:

(1) صحیح نام ہونزہ ہے ہونزار نہیں۔

پانچواں باب

کشمیر: قدیم وجدید

اب تک ہم اس خوبصورت وادی کا کسی حد تک جائزہ لینے کے ساتھ اس میں رہائش پذیر اور پہاڑی لوگوں کی جانکاری بھی حاصل کر چکے ہیں۔اب یہ مناسب ہوگا کہ اُن کے ماضی کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تاکہ ہمیں ان کے کردار سے آگاہی حاصل ہو۔خوش قسمتی سے ہماری اپنی تہذیب سے بنی کشمیر کی پرانی ایک قدیم تاریخ اور تہذیب ہے۔اس بارے میں قبل از تاریخ اس وادی سے کئی حکایات جڑی ہیں جب وادیٔ کشمیر ایک وسیع جھیل تھی اور اس کی تہہ میں ایک بہت بڑا سانپ رہتا تھا۔

قدیم ترین حکایات کے مطابق اس جھیل نے ساری وادی کا احاطہ کیا تھا جس میں ایک دیو جلود بھاوا (پانی سے پیدا شدہ) بھی رہتا تھا۔اس دیو نے تمام ہمسایہ ممالک میں تباہی اور بربادی کا بازار گرم کیا تھا۔بالآخر کشیپ مُنی نے بھگوان شو سے منت کی کہ وہ اس دیو کو ختم کرنے میں اس کی اعانت کرے۔کشیپ کی دعا سن لی گئی اور وہ اس دیو کو دیوتاؤں کی مدد سے کوثر ناگ کے نزدیک ہلاک کرنے میں کامیاب ہوا۔شو نے اپنے ترشول سے بارہمولہ کے نزدیک پانی کے نکاس کا راستہ نکالا۔پانی باہر کی طرف بہہ نکلا اور پھر یہ سرزمین قابلِ رہائش بن گئی۔

پہلے پہل کشمیر میں لوگ صرف چھ مہینوں تک رہائش پذیر ہوتے اور سرما کے باقی چھ مہینے وہ باہر ہی گزارتے۔ اس دوران کشمیر پر پشاچوں (دیودؤں) کا قبضہ ہو جاتا۔

آخر کار لوگوں نے نیلہ ناگ کی حمایت سے ان دیوؤں سے نجات پائی لیکن اس کے ساتھ یہ شرط عائد کی گئی کہ لوگ جاڑوں میں ان دیوؤں کی بہتری کے لیے چند رسوم ادا کریں گے۔ اس طرح وادی سال بھر آباد رہی۔ یہ رسوم آج بھی کشمیری ہندو ادا کرتے ہیں جو یوں ہیں:

1۔ کچھ ماوس (کھچڑی کی کالی رات)۔ یہ رسم جنوری میں پوری کی جاتی ہے جب ایک قسم کی کھچڑی یا پلاؤ تیار کیا جاتا ہے اور اسے مٹی کی ایک تھالی میں رکھ کر صحن کے بیچوں بیچ دیوؤں کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر سارے مکان کے اردگرد ایک لکیر کھینچی جاتی ہے۔ یہ اس یقین کے حوالے سے کیا جاتا ہے کہ یہ دیو اس جادوئی لکیر کو پار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

2۔ گاڑہ بتہ (مچھلی اور بھات)۔ اس رسم کو کشمیری ہندو جنوری کی کالی رات میں انجام دیتے ہیں جب وہ چاول اور مچھلی پکاتے ہیں۔ پھر پکے اور کچے چاول سے بھرا ہوا ایک بہت بڑا برتن مکان کی سب سے اونچی منزل پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جلتا ہوا دیا بھی ہوتا ہے۔ وہاں کسی کو سونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس خوراک کو عام طور پر بلیاں نوش کرتی ہیں۔ صبح کے وقت اہل خانہ اس جگہ کو ملاحظہ کرنے وہاں چڑھ جاتے ہیں اور انھیں یہ دیکھ کر بشاشت ہوتی ہے کہ برتن خالی ہو چکا ہے اور یہ کہ اسے دیوؤں نے خالی کیا ہے۔

3۔ کاوہ پُنم (کوؤں کی پونم)۔ یہ رسم عام طور پر فروری میں ادا کی جاتی ہے۔ پکے ہوئے چاول کے چھوٹے چھوٹے گولے بنا کر انھیں درختوں کی ٹہنیوں اور گھاس سے بنے بہت بڑے کف گیروں میں رکھا جاتا ہے۔ پھر انھیں مکان میں ایک نمایاں جگہ پر بدروحوں کے لیے کوؤں کی شکل میں رکھا جاتا ہے۔ دریں اثنا بچے اپنا مخصوص گانا گاتے ہیں:

''آؤ! کوؤ! جو کھیر کے دلدادہ ہیں۔ تم گنگا بائی کے پانیوں میں نہاؤ۔ اپنے اوپر بھوری مٹی ڈالو! اپنی ماداؤں کو بھی ساتھ لے کر آ جاؤ۔ ہمارے مکانوں کے بام اور چھجوں پر بیٹھ کر یہ شاندار ضیافت کھاؤ!''

ارضیاتی تجزیات سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر واقعی ایک جھیل تھی۔ اس سلسلے میں ہر جگہ

کریوؤں پر جھیل کی تہہ میں بننے والے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔

کشمیر ایک عرصۂ دراز تک مختلف راجوں کے تحت رہا ہے۔اس سلسلے میں ادگونند راجے کا نام سب سے پرانی دستاویزوں میں درج ہے جو 4249 قبل مسیح میں تخت نشین ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب مصر میں نیم دیوتاؤں کی حکمرانی تھی۔ ادگونند کے بعد اُس کے بیٹے دانودر نے راج گدی سنبھالی جسے کرشن سے وابستہ قبیلے کے یادوؤں نے قتل کر ڈالا۔

کشمیر میں بدھ مت کو مہاراجہ اشوک نے 308 قبل مسیح میں متعارف کیا۔اس دھرم کا بانی سکھی مُنی گوتم تھا جسے بعد میں مہاتما بدھ کا نام دیا گیا۔ وہ نیپال کی ایک الگ تھلگ سلطنت کا شہزادہ تھا اور اسی عہد میں رہتا تھا جسے یہودیوں کی غلامی کا دور کہا جاتا ہے۔اشوک کے پوتے اور باختر کے فاتح راجہ جلوکی نے یہ مذہب ہر طرف پھیلایا۔ بودھ مشنری سارے ہندوستان میں بھیجے گئے۔ جہاں انھوں نے لوگوں کو صراط المستقیم پر چلنے کی تبلیغ کی۔

تارتریوں نے ہمارے ابتدائی دور میں وادی پر حملہ کیا۔اُن کے تین بادشاہ بیک وقت کشمیر کے حاکم بنے رہے جن کے نام ہسکا، زاشکا اور کنشکا ہیں۔ ہسکا نے بڈگام کے نزدیک ادشکار کی بنیاد ڈالی، زاشکا نے نسیم باغ کے پاس زکورہ کی بنیاد ڈالی اور کنشکا نے کانس پور بنایا۔ یہ تینوں بادشاہ کشمیر میں عوامی مقبولیت کے حامل تھے۔

کشمیر سفید ہنوں کے تحت چھٹی صدی کے پہلے نصف دور میں آیا جب یوروشیایوں نے انگلستان کو فتح کیا۔ ان کا بادشاہ مہراکولا ظالم اور بے رحم ہونے کی وجہ سے بدنام تھا۔ بدھ مت شنکر آچاریہ کے وقت میں آٹھویں صدی میں زوال پذیر ہوا۔

گیارھویں صدی میں اسلامی مہم جوئی کے نتیجے میں ملک پر حملے ہوئے۔ محمود غزنی نے 1015 میں توسہ میدان کے راستے کشمیر پر ہلہ بول دیا مگر اسے کشمیری افواج کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔ مشہور مورخ البیرونی محمود کے ہمراہ تھا۔

کشمیر کا پہلا مسلم بادشاہ رینچن شاہ تھا جو 1341 میں تخت نشین ہوا۔ وہ ازبک تبتی باشندہ تھا اور بچپن کے دنوں میں ہی کشمیر آیا تھا۔ وہ ہندو بننے کا خواہاں تھا مگر برہمنوں نے اسے اپنے دھرم میں آنے کی اجازت نہیں دی لہٰذا اُس نے ایک مسلمان ولی اور مرد خدا بلبل شاہ کے ہاتھ پر بیعت

کر کے اسلام قبول کیا۔ بلبل شاہ کی زیارت اب بھی موجود ہے اور شہر سری نگر کے اس علاقے کو بلبل لنکر کہتے ہیں۔ رنچن شاہ نے بعد میں متکبر برہمنوں کو مسلمان بننے پر مجبور کیا۔ رنچن انگلستان کے شاہ ایڈورڈ سوم کا ہم عصر تھا۔

رنچن شاہ کے عہد سے لے کر سلطان قطب الدین کے زمانے تک کشمیر ایک پُر امن خطۂ زمین رہا۔ 1359 میں اس سلطان کے دورِ حکومت میں سید علی ہمدانی المعروف شاہ ہمدان کشمیر آیا۔ وہ فارس کے ایک قصبے ہمدان سے یہاں آیا تھا تا کہ اس کی جان مغل شہنشاہ تیمور لنگ کے ہاتھوں سے بچ سکے۔ اس واقعے کی کہانی کو اس طرح مختصراً بیان کیا گیا ہے:

کئی مشرقی بادشاہوں کی طرح تیمور لنگ بھی راتوں کو بھیس بدل کر جگہ جگہ جا کر خود دیکھتا تھا کہ اس کی رعایا کی حالت کیسی ہے۔

ایک رات کو وہ ایک نہایت مفلوک الحال شخص کے گھر کے باہر کھڑا تھا جس کے بچے بھوک کے مارے رو رہے تھے۔ اس کی بیوی بھی اس حال سے بے حال تھی۔ اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ باہر جا کر بھیک مانگ کر بچوں کے کھانے کا کوئی انتظام کرلے۔ لیکن یہ صاحبِ خانہ ایک معزز شخص تھا اور گداگری کرنے پر ہرگز راضی نہیں تھا۔ تیمور نے یہ دیکھ کر افسوس کیا اور چپکے سے سونے کے چند سکے اس مکان کے اندر ڈال کر وہاں سے چل پڑا۔

اگلی صبح گھر کی مالکن فرش پر سنہری سکے دیکھ کر خوش ہوئی۔ اس کے شوہر نے کچھ کھانا منگوا کر اپنے بچوں کو کھلایا۔ جب ہمسایوں نے انھیں اچھا کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے اندازہ لگایا کہ یہ چوری کا ہی پھل ہے۔ انھوں نے اس بے چارے کے خلاف چوری کا الزام عائد کیا۔ وہ حضرت محمد ﷺ کے فرزند نسبتی حضرت علی مرتضٰی کے شجرے سے تھے اور سید کہلاتے تھے وہ اسے آسانی کے ساتھ سزا دلوا سکتے۔ جب بادشاہ کو اس واقعے کا علم ہوا۔ اس نے دونوں فریقوں کو بلایا۔ ملزم نے سارا واقعہ سچ سچ بیان کیا جس سے بادشاہ بہ نفسِ نفیس واقف تھا۔ سیدوں نے اس کے بیان کو غلط کہا اور انھوں نے قسم کھائی کہ ان کی رقم چرائی گئی ہے۔ بادشاہ غصے ہوا۔ اُس نے فوراً حکم دیا کہ ایک گھوڑا سات دھاتوں سے بنایا جائے۔ پھر اسے پوری طرح دہکتے آتش کی طرح گرم کیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ کا حکم ہوا کہ تمام سید اپنے ساداتی پس منظر کو ثابت کرنے کے لیے اس

گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔ کیونکہ اسلامی عقائد کے مطابق آگ ایک راست گو سید پر کوئی برا اثر نہیں کرتی۔ اس طرح سے جن سیدوں نے بادشاہ کا حکم مان لیا وہ گھوڑے پر چڑھتے ہی جل گئے۔ اور جنھوں نے حکم کی عدولی کی انھیں تیموری سپاہیوں نے تہہ تیغ کر ڈالا۔ لیکن سید علی ہمدانی نے اس آزمائش سے نجات پانے کی غرض سے کشمیر کی راہ لی۔ یہ اس کے اور اس کے بیٹے کے اکسانے ہی کا نتیجہ تھا کہ سلطان قطب الدین نے بے رحمی سے کشمیری ہندوؤں کو مصائب میں مبتلا کر دیا جس میں بعد میں اس کا جانشین سکندر بُت شکن بھی شامل ہوا۔ (1)

اس طرح سینکڑوں ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جنھوں نے اس سے انکار کیا انھیں تہہ تیغ ہونا پڑا۔ سکندر نے ہندوؤں کے تمام مقدس مقامات اور تاریخی یادگاروں کو زمین بوس کیا اور اس ملبے سے اس نے مختلف جگہوں پر مساجد اور زیارت گاہیں تعمیر کروائیں۔

کشمیر کے سنی مسلمان شاہ ہمدان کو ایک بہت بڑا ولی تصور کرتے ہیں۔ اس کا آستانہ جسے قطب الدین نے تعمیر کروایا تھا ابھی تک سری نگر میں جہلم دریا پر تیسرے پل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

سکندر کے بیٹے علی شاہ نے جو 1435 میں تخت پر بیٹھا اور جو ہنری پنجم کا ہم عصر تھا، تخریب کاری کا یہ سلسلہ جاری رکھا جسے اس کے باپ نے ہاتھ میں لیا تھا۔ اُس کے عہد میں سینکڑوں ہندوؤں نے خودکشی کی۔ بے شمار اپنے گھروں کو نذر آتش کر گئے اور کنوؤں میں چھلانگیں لگا لگا کر مر گئے تا کہ ان کا مذہب بچ سکے۔ ان میں سے جنھوں نے اپنے بال بچوں سمیت فرار ہونے کی کوشش کی ان کی حرکات پر سرکاری کارندوں نے گہری نظر رکھی، ان کے باہر نکلنے کے درّوں کو سر بمہر کیا گیا، لہٰذا انھوں نے بھی آپ اپنے کو پہاڑوں کی چوٹیوں سے کود کر اپنی جانیں دے دیں۔ (2)

اس دار و گیر کے دور سے جو لوگ بچ سکے اور جنھیں اپنی قسمت کے حوالے کیا گیا انھیں علی شاہ کے بیٹے زین العابدین کے ہاتھوں کچھ راحت نصیب ہوئی۔ وہ ایک نیک دل اور انسان نواز حکمران تھا۔ یہی وہ زین العابدین ہے جس نے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے اور سرکاری عہدے قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ اُس کے عہد میں ہندو دو فریقوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ جو سرکاری اہل کار بننے پر راضی ہوئے اور دوسرے وہ جو اپنے شاستروں کو ہی اپنی گود میں سنبھالتے رہے۔ پہلے فریق

کو کارکن (سرکاری ملازم) اور فریق ثانی کو پروہت (پجاری) کا نام دیا گیا۔
سلطان زین العابدین ہی نے کشمیری شال بننے اور کاغذ بنانے کا فن متعارف کرایا۔ اُس کے عہد تک ہندو اہلِ قلم اپنی مقدس عبارات کو بھوج پتر پر تحریر کیا کرتے تھے۔
زین العابدین کے وقت سے لے کر اکبر اعظم تک کشمیر پر مقامی اور غیر ملکی مسلمان حکمرانوں کی حکومتیں رہیں۔ اس دورِ حکمرانی میں بے چارے ہندوان اصحابِ اقتدار کے قہر و عذاب میں مبتلا رہے جبکہ انھیں بار بار ہراساں اور پریشان کیا گیا۔ ان کے مکانوں میں لوٹ کھسوٹ کی گئی۔ انھیں بے دردی سے مغلوب کیا گیا اور بغیر کسی جواز کے ان کی توہین کی گئی۔
مغل شہنشاہ اکبر انگلستان کی ملکۂ بیس (Queen Bess) کا ہم عصر تھا۔ اُس نے کشمیر 1587 میں فتح کر لیا۔ اس نے شہر میں ہاری پربت کی پہاڑی کے ارد گرد ایک فصیل تعمیر کروائی۔ مغل عہد میں ہندوؤں کو جان و مال کا تحفظ حاصل ہوا۔ انھیں بڑے بڑے سرکاری عہدے دیے گئے اور اکبر نے ان کی ذہانت سے متاثر ہو کر انھیں پنڈت (عالم) کا لقب دیا۔
اکبر کے بیٹے جہانگیر کے زمانے میں جس نے کئی باغات لگوائے اور تعمیرات بنوائیں، ایک مقامی صوبے دار ایک خوبصورت ہندو لڑکی کو دل دے بیٹھا۔ جب وہ اس کے ساتھ شادی کرنے پر راضی نہ ہوئی تو اس کے شیطانی ذہن میں ایک عیارانہ چال نے جنم لیا۔ اس نے ایک بزرگ مسلمان عورت کو راغب کر لیا کہ وہ اس کی عدالت میں برقعہ پہن کر آ جائے۔ عورت نے ہندو لڑکی ہونے کا ڈھونگ رچا کر اور اسی کی آواز کی نقل کر کے عدالت میں بیان کیا کہ وہ صوبے دار سے محبت کرتی ہے اور اس سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اسے اس کا باپ اپنے ہم مذہبوں کی شہ پر ایسا کرنے سے روک رہا ہے۔ صوبے دار نے ملاؤں سے ایک روایت (حکم نامہ) حاصل کیا (3) جس کی رو سے اسے لڑکی سے اس کے باپ کی رضامندی کے بغیر شادی کرنے کی اجازت دی گئی۔ صوبے دار نے معصوم لڑکی کے گھر اپنے سپاہی بھیجے تاکہ اسے جبراً پکڑ کر اُس کے حرم میں داخل کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل فوراً کی گئی۔ لڑکی کا باپ چونکہ ایک معاملہ فہم شخص تھا اُس نے اس بات کا کوئی بتنگڑ نہیں بنایا بلکہ صوبے دار سے یہ التجا کی کہ وہ چھ مہینے تک انتظار کرے جسے صوبے دار نے شہنشاہ کے خوف سے خوشی خوشی مان لیا۔

دریں اثنا وہ جہانگیر سے ملنے چپکے سے آگرہ روانہ ہوا۔ جب وہاں پہنچا تو اُس نے دربارِ شہنشاہ میں وہ گھنٹی بجائی جسے جہانگیر نے عوام کی فریادیں سننے کے لیے اپنی مخصوص آرام گاہ کے ساتھ باندھ کے رکھا تھا۔ پنڈت نے بادشاہ کو ساری کہانی سنائی۔ جہانگیر جو ایک نرم دل بادشاہ تھا اسی وقت اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اور بھیس بدل کر چند خاص حفاظتی دستوں کے ساتھ چل پڑا۔

جب وہ سری نگر پہنچا تو سیدھا اسی عورت کے گھر گیا جس نے لڑکی بننے کا کھیل کھیلا تھا۔ جہانگیر نے اس سے کہا کہ وہ ایک غیر ملکی ہے۔ اس نے عورت کو چند سونے کے سکے دیے اور اسے کھانا بنانے کو کہا۔ پھر اس نے عورت سے اصل واقعہ کی تفصیلات سنیں۔ جہانگیر نے رات وہیں پر گزاری۔

علی الصباح بادشاہ نے اپنا شاہی لباس زیب تن کیا اور شاہی محل پہنچا جہاں صوبے دار کے ساتھ دوسرے اعلیٰ عہدہ دار بھی بادشاہ کی کورنش بجالانے کے لیے دست بستہ حاضر تھے۔

جہانگیر نے حسب دستور ان سے حالات دریافت کیے۔ یہ بات چیت جاری ہی تھی کہ لڑکی کا باپ ایک پہلے سے ہی تیار کیے گئے منصوبے کے تحت صوبے دار کے خلاف شکایت لے کر دربار میں حاضر ہوا۔ صوبے دار نے بادشاہ کو مطمئن کرنے کی سرتوڑ کوشش کی کہ یہ کافر جھوٹ بول رہا ہے۔ اُس نے پھر ملاؤں کا فتویٰ بادشاہ کے سامنے رکھا۔ جہانگیر نے فوراً بزرگ عورت کو حاضر کروانے کا حکم دیا جس کے گھر وہ شب باش ہوا تھا۔ عورت نے جہانگیر کو پہچان لیا اور اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دربار میں سارا سچ اُگل دیا۔ صوبے دار حواس باختہ ہوا۔ پھر بادشاہ نے سارے ملاؤں کو بھی بلایا جنھوں نے بہر حال جرم کا اعتراف کیا۔ بادشاہ نے صوبے دار کے عہدے کے اعزازات اپنے ہاتھوں سے چھین لیے۔ ملاؤں کو گرفتار کر کے ہاری پربت کی فصیل کے باہر زنجیروں میں جکڑا گیا اور پھر ان پر توپوں کے دہانے کھول دیے گئے جس سے ان کے جسموں کے پرخچے اڑ گئے۔ انھیں آخری رسومات کی ادائیگی کے بغیر اسی جگہ دفن کیا گیا جس کا نام بعد میں ملہ کھاہ پڑ گیا۔

جہانگیر کے بیٹے شاہجہاں نے خوشحال وادی میں کئی محل بنوائے اور باغات لگوائے۔

اس کے بیٹے اورنگ زیب نے جو 1658 میں بادشاہ بن گیا اور جو برطانیہ کے چارلس دوم، جیمز دوم اور ولیم سوم کا ہم عصر تھا، کشمیر اور دیگر جگہوں پر ہندوؤں کو ایذائیں دینے کا سلسلہ

پھر شروع کیا۔

اہل کشمیر ظالم اور بے رحم مغل صوبے داروں کی حکمرانی میں 1751 تک رہے جب اس ملک کو احمد شاہ دُرانی نے فتح کیا جس نے 1738 کے بعد ہی اپنے آقا نادر شاہ کو قتل کیا تھا۔ یہ قاتل اور اس کے افغان جانشین ہندوؤں کے لیے مصیبتوں کے دن اپنے ہمراہ پھر واپس لائے۔

اس کے بعد افغانوں نے تباہی اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ انھوں نے ہندوؤں کی ساری مقدس کتابیں جمع کیں جن سے انھوں نے ایک بنڈ بنایا جسے سوتھ کہا جاتا ہے۔ یہ ابھی تک محفوظ ہے۔ جب اُن کے ہاتھ بے شمار لوگوں کو تہہ تیغ کرتے کرتے تھک گئے تو انھوں نے ان کو بوریوں میں بند کر کے ڈل جھیل میں پھینک دیا۔ جھیل میں جس جگہ یہ بوریاں ڈال دی گئیں اسے اب بھی بٹہ مزار (کشمیری ہندوؤں کا قبرستان) کہتے ہیں (3)

ان کے مکانات ڈھائے گئے۔ انھیں اسلام قبول کرنے کے لیے سرِ بازار اذیتیں دی گئیں۔ ان کی عورتوں کو اٹھا کر داشتاؤں کی طرح استعمال کیا گیا۔ کئی ہندو نا انصافی نہ سہہ کر مر گئے یا انھوں نے اس حیوانیت سے بچنے کی خاطر اپنے آپ کو مار ڈالا۔ انھیں پگڑیاں باندھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی ہندو کسی بازار میں چلتا ہوا نظر آجاتا تو کوئی بھی مسلمان اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اسے ایک مخصوص جگہ تک پہنچانے پر مجبور کرتا۔

یہ دورِ دہشت 1820 تک جاری رہا جب پنجاب کے راجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر کو زیر کرلیا۔ اس نے باقی ماندہ ہندوؤں کو ان جابروں کے پنجے سے چھڑا لیا لیکن ساتھ ہی ایک انتقامی کارروائی کے تحت سکھوں نے مسلمانوں پر قہر ڈھانا شروں کیا حتیٰ کہ وہ آزادی سے نماز بھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔

سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد کشمیر کا الحاق برطانیہ کے ساتھ ہوا جس نے اس ملک کو 1846 میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں بیچ ڈالا۔ ان گلاب سنگھ کا پوتا اب کشمیر کا مہاراجہ ہے۔

ہز ہائی نیس مہاراجہ سر جنرل پرتاپ سنگھ، جو 1886 میں تخت نشین ہوا، انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے رقبے کے برابر اس ملک کا حکمران ہے جس میں وادی کشمیر کے علاوہ جموں، پونچھ، لداخ، بلتستان اور گلگت ایجنسی کے بشمول دوسری تمام ریاستیں شامل ہیں۔ ان سارے خطوں کی آبادی تیس لاکھ لوگوں پر مشتمل ہے۔

حکومت میں ہز ہائی نیس کی اعانت تین وزرا کرتے ہیں جو وزیراعلیٰ ، وزیر مال اور وزیرداخلہ کہلاتے ہیں۔ انھیں ہندسرکار نے منتخب کیا ہے اور ہز ہائی نیس نے اس تقرری کی توثیق کی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے ساتھ ایک برطانوی ریزیڈنٹ بھی ہے جو انگلستان کے بادشاہ کا نمائندہ ہے۔ اسے دیگر برطانوی افسران کی مدد حاصل ہے۔ اسی طرح پونچھ ریاست، لداخ اور بلتستان اور گلگت کے لیے بھی ایک ایک ریزیڈنٹ مقرر ہے۔ ان علاقوں میں تمام پہاڑی ریاستیں چلاس، ہونزہ، نگر وغیرہ بھی شامل ہیں۔

1890 سے لے کر اب تک تیرہ ریزیڈنٹ آ چکے ہیں۔ میرے یہاں پہنچنے پر کرنل پیری نسبت ریزیڈنٹ تھا۔ وہ ایک شاندار شخص تھا اور یہ اسی کی دوراندیشی اور دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس کی مساعی کی بدولت جہلم ویلی سڑک پہاڑوں سے ہوتے ہوئے دو میل کی جگہ سے بار ہمولہ تک نکالی گئی جسے انجینئرنگ کا ایک بہت بڑا کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اسے ایک انجینئر مسٹر اٹکنسن نے بنوایا اور اس کی تکمیل میں سپیڈنگ اینڈ کمپنی کی محنت بھی شامل رہی۔

ریزیڈنٹ کا عہدہ کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے زبردست حکمت عملی، صبر اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کہنا غیر منصفانہ ہوگا کہ ان میں سے ان شخصیات کا الگ سے تذکرہ کیا جائے جنھوں نے کوئی خاص کام سرانجام دیا ہو۔ ان میں سے کئی ایک دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط کردار کے مالک ہوکر قابل تعریف کام سے ملک اور لوگوں کے دلوں میں اچھے تاثرات قائم کر کے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف محکموں کے لیے انگریز مشیر بھی ہیں جن میں فوج، تعمیرات عامہ، حساب کتاب، زمینی معاملات وغیرہ شامل ہیں۔

تخت کا جانشین جنرل پرنس ہری سنگھ ہے۔ نوجوان شہزادہ کھیل کود کا رسیا ہے جسے انصاف اور ذہن نشینی کی صلاحیت بخشی گئی ہے۔

فٹ نوٹ:

(1) مغربی ممالک سے کشمیر آنے والے چند عیسائی سیاحوں، مورخوں، تحقیق کاروں اور سفرنامے قلم بند کرنے والوں نے کشمیری مسلمانوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً اپنے تعصب کا برملا

طور پر اظہار کیا ہے۔ یہ سلسلہ بدقسمتی سے آج بھی جاری ہے۔ پارس کے سیّدوں کے حوالے سے اس گھوڑے کی کہانی محض ایک مفروضہ ہے جس پر کسی صورت میں اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخی لحاظ سے حقیقت یہ ہے کہ تیمور لنگ نے اپنی فتوحات کا آغاز ہی مسلم سیّدوں کے خلاف ظالمانہ انتقام گیری کی کارروائیوں سے کیا، ورنہ میر سید علی ہمدانی جیسے تاریخ ساز مفکر زمان، مبلغ، دین، نابغۂ زمانہ، عالم و فاضل اور علمی فضیلت والے بے نظیر سید کے حوالے سے ایسے واقعات منسوب کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس مذموم بیان بازی کے پس پردہ سیّدوں کو دروغ گو ثابت کرنے کا ایک فرقہ وارانہ نظریہ ہی کارفرما ہو سکتا ہے۔ حضرت ہمدانی نے اُس مخالف ماحول سے تنگ آ کر اسی میں ہر ایک کی خیریت سمجھی کہ وہ اپنے سینکڑوں عقیدت مندوں کے ہمراہ کشمیر آیا جو مقابلتاً ایک پرامن اور پرسکون ملک تھا۔ یہاں آ کر انھوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور پیار اور محبت سے ان ہزاروں بُت پرست ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا جو اپنے معاشرے میں ذات پات کے بندھنوں میں قید ہو کر برہموں کے آہنی پنجے تلے غلاموں اور جانوروں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ (خیال)

(2) کشمیری ہندوؤں پر نام نہاد ظلم و ستم کے اس افسانوی بیان پر مورخوں نے مختلف آراء پیش کی ہیں اور جس طرح سے مسلمان حاکموں کے ہاتھوں ان پر ناقابل بیان مظالم کو درج کیا گیا ہے اس کے ساتھ چند ہندو تاریخ دان مثلاً پریم ناتھ بزاز، پرتھوی ناتھ کول بامزئی وغیرہ بھی اختلاف رکھتے ہیں۔

(3) یہاں روایت کا لفظ غلط ہے۔ اس کی بجائے فتویٰ صحیح ہے۔

(4) پُرسیدم از خرابیٔ گلشن زباغبان
افغاں کشید و گفت کہ افغاں خراب کرد
(اور)
سر بُریدن پیشِ ایں سنگیں دلاں گل چیدن است

چھٹا باب

اہلِ کشمیر کا کردار

کشمیریوں کے کردار کے بارے میں لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ ملکِ کشمیر، جس میں صوبہ جموں بھی شامل ہے، بہت بڑا خطہ ہے۔ اس میں لوگوں کی کئی نسلیں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر سارے علاقے جو کشمیر کے واحد نام سے جانے جاتے ہیں، بلند پہاڑی درّوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں لہٰذا ان مختلف ریاستوں کے عوام شکل وصورت، عادات واطوار، رسوم ورواج، زبان وبیان، عادات وکردار اور عقائد ومذاہب کے تعلق سے بھی واضح طور پر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔

جموں صوبے کے لوگ ڈوگرے ہیں جو راجپوتوں کے قرابت دار ہیں اور وہ پنجابی بولتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ملک پہاڑوں کے نچلے دامنوں میں اور میدانوں میں واقع ہے وہ سخت جان اور اچھے لڑاکو ہیں۔ مہاراجہ کی فوج زیادہ تر انہی پر مشتمل ہے۔ ہماری ہندوستانی فوج میں بھی کئی ڈوگرا رجمنٹ موجود ہیں۔ مشرقی افریقہ کی مہمات میں کشمیری ڈوگرہ رجمنٹ نے خاصا کام کیا اور اپنے لیے نام کمایا۔

جموں ہز ہائی نیس سر پرتاپ سنگھ کے، سی، ایس، آئی کی سرمائی راجدھانی ہے، اس نام کو ادر قصبے کے راجہ سر پرتاپ سنگھ کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا جانا چاہیے جس کا نام اور تصاویر جنگ کے

دوران کئی بار اخباروں کی زینت بنے۔ یہ قصبہ ایک اونچی پہاڑی کی ڈھلوان پر واقع ہے جہاں سے نیچے دریائے توی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ دور سے یہ ایک دیدہ زیب منظر کی طرح سامنے آجاتا ہے جب اس پر بنے کئی مندر سورج کی پُرنور شعاعوں میں درخشاں نظر آتے ہیں۔

جموں بنیادی طور پر ایک ہندو علاقہ ہے۔ مرحوم مہاراجہ کی خواہش تھی کہ اسے دوسرا بنارس بنایا جائے جو ہندوؤں کا مکّہ ہے۔

ڈوگرے کھشتری یا سپاہی ذاتوں کے ہیں جنھیں برہمن ذات سے کم تر درجہ حاصل ہے۔ پونچھ ریاست میں رہنے والے گٹھے ہوئے جسموں کے مالک ہیں۔ یہی وہ ریاست ہے جہاں سے ہندوستانی حکومت کو کسی اور جگہ سے زیادہ سپاہی ہند کی فوج کے لیے بھیجے گئے۔ ان کا مذہب اسلام ہے۔

لداخ کے باشندے جسے چھوٹا تبت بھی کہتے ہیں مذہبی لحاظ سے منگول اور بودھ ہیں (1) یہ بھی مضبوط جسم والے، محنت کش اور ہنس مکھ لوگ ہیں۔

میں نے پہلے ہی پہاڑی اور سرحدی لوگوں کے بارے میں کچھ باتیں کی ہیں۔ مناسب ہے کہ اب وادی کے باشندوں کے کردار کی بات کریں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ یورپی سیاحوں کے رشتے دوستانہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کا براہ راست واسطہ اور تعلق کشمیر میں نوکروں، قلیوں، کشتی بانوں، دکانداروں، کلرکوں اور تاجروں اور دوسرے طبقات کے لوگوں سے رہتا ہے۔

جب کوئی کسی کشمیری کا ذکر کرے تو اس کے ذہن میں اہلِ کشمیر کا ایک مخصوص طبقہ ہوتا ہے۔ یہاں کسی کو کشمیری کہنا اسے گالی دینے کے مترادف ہے کیونکہ اس نام سے بزدلی اور آوارگی کی بو آتی ہے۔ مثال کے طور پر جب کسی نوکر کو ملازمت نہ دینا مقصود ہو تو آپ اسے ایک "کشمیری نمونہ" کہیں گے۔ میں نے ایک نام نہاد دانشور کی درخواست پر اسے کاغذ کی پرچی پر یہ سفارشی الفاظ تحریر کیے۔ "یہ نوجوان ایک کشمیری ہندو کی مثال ہے"۔ چند روز بعد اس کا بھائی میرے پاس آیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا کہ میری سفارش سے اسے نوکری نہیں ملی ہے لہٰذا میں دوسری پرچی اس کے حق میں لکھوں۔ جب میں نے نوکری نہ ملنے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا۔" آپ نے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ ایک کشمیری ہندو کی مثال ہے۔ اس جملے کے معنی سے ہر کوئی

واقف ہے لہٰذا اسے ملازمت نہیں مل سکتی۔" میں نے اس کی التجا پر غور کیا اور دوسری بار سفارشی خط لکھ کر اسے دے دیا۔ میں نے اس میں لکھا تھا۔ "یہ نوجوان کشمیریوں کی انفرادی خصوصیات رکھتا ہے"۔ وہ پرچی لے کر خوشی خوشی چلا گیا۔

مجھے کشمیریوں کے بارے میں ایسے الفاظ کا استعمال بجائے خود بہت برا لگتا ہے کیونکہ میں ان کا چاہنے والا ہوں۔ میں اپنے ایسے لاتعداد دوستوں کے نام دوہرا سکتا ہوں جن میں سے کئی ایک خطرات اور مشکلات میں میرا سہارا بنے رہے۔ چند ایک تو میری وجہ سے مصائب میں بھی پھنس گئے جب انھوں نے میری زندگی کو ڈوبنے یا دوسرے سانحوں سے بچانے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ لہٰذا میری نظروں میں وہ جانباز اور صحیح معنوں میں شریف النفس لوگ ہیں حالانکہ ان کے اردگرد جو ماحول ہے وہ ان کے لیے ناخوشگوار ہے۔ پھر بھی ایک حق گو ہونے اور کبھی دروغ گو نہ ہونے کے پیش نظر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ایک عام کشمیری جسے میں تیس سال سے دیکھ رہا ہوں، واقعی بزدل ہے۔ اسے کوئی عزت نفس حاصل نہیں اور وہ فریب کاری بھی کرتا ہے۔ یہ باتیں میں اپنے ضمیر کی صفائی کے ساتھ بیان کرتا ہوں اور یہ تو میں نے ان کے ہر طبقے کے سامنے ان کے منہ پر دوہرائی ہیں۔ یہ ان کی فراخ دلی ہے کہ انھوں نے میری بات کو کبھی نہیں جھٹلایا کیونکہ انھیں اس میں پوری سچائی دکھائی دی۔ کشمیریوں کی بزدلی، دھوکہ دہی اور آپسی دشمنی کی باتیں آپ ہر اس شخص سے سن سکتے ہیں جو کشمیر کو جانتا اور پہچانتا ہے۔ مگر وہ وادی سے باہر کے لوگوں سے مختلف کیوں ہیں؟ شاید اس لیے کہ وہ دنیا کے ایک حسین ترین ملک میں رہتے ہیں جس کی طرف ہمیشہ باہر والوں کی حریصانہ نظریں اٹھتی رہی ہیں۔

کشمیر کو حملہ آور فتح کرتے رہے۔ دوبارہ اسے زیر قبضہ لایا اور اس کے رہنے والوں کی زندگیاں چھین لیں، انھیں سختی سے دبایا اور ان کے آباواجداد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اس طرح سے ان کی زندگی کی چاہت کو پاؤں تلے روندا گیا۔

یہ ممکن ہے کہ ہم برطانوی لوگ کشمیریوں کی طرح ظلم واستبداد کا شکار ہوتے تو ہماری مردانگی ختم ہو جاتی۔ مجھے اپنے اسکول کے دن یاد آجاتے ہیں جب لڑکوں پر سختی سے ایسی دھونس جمائی گئی کہ وہ اپنی قوت ارادی کھو بیٹھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اور دیگر مغربی ممالک کے ساتھ اس

کے برعکس سلوک ہوا۔ ہمیں کمزور طبقوں کے لوگوں کی حمایت کرنے اور ان سے اظہار ہمدردی کا موقعہ نصیب ہوا جن میں اہل کشمیر بھی شامل ہیں۔ خدا کرے کہ ہم ہمیشہ اس بھروسے کو قائم رکھ سکیں۔

کشمیر کے لوگ رفتہ رفتہ غلامی سے خود شناسی کی طرف آ رہے ہیں۔ اگر چہ یہ رفتار فی الحال سست ہی ہے مگر وہ آگے کی جانب رواں دواں ہیں۔ میں ابھی آپ کے سامنے یہ ثابت کروں گا کہ وہ عنقریب ہی اپنے آپ کو پہچانیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر انہی بہادر لوگوں کی طرح پھر سے ابھریں گے جب ان کے آباواجداد انھیں میدانِ جنگ میں جانے کی ترغیب دیتے تھے۔ میں یہ باتیں ان کے صحیح تناظر میں کر رہا ہوں لہٰذا ہوسکتا ہے کہ مجھے کوئی ناپسندیدہ بات بھی کرنا پڑے کیونکہ میں نہ تو سچائی پر پردہ ڈالتا ہوں اور نہ ہی مجھے اس سے کسی ذاتی تشہیر کی ضرورت ہے۔

کشمیریوں کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ ان میں مزاح کا ذوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ سر والٹر لارنس کئی سال قبل کشمیر میں بندوبست اراضی کا کمشنر تھا۔ وہ یہاں کے کاشت کاروں کے لیے ایک رحمت بن کے آیا تھا۔ ایک دن وہ ایک ضلع کے دورے پر تھا کہ گاؤں میں داخل ہو کر اس نے ایک آدمی کو سر کے بل زمین پر کھڑے دیکھا۔ جب والٹر نے اس سے اس تکلیف دہ انداز میں رہنے کا سبب پوچھا تو وہ جواباً بولا: "میرے خانگی حالات اس قدر الجھے ہوئے اور پریشان کن ہیں کہ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ میں پیروں پر کھڑا ہوں یا پاؤں پر ایستادہ ہوں"۔ مجھے یقین ہے کہ کمشنر صاحب نے اسے اپنی صحیح حالت میں لا کر اُس کی مدد بھی کی ہوگی۔ کیونکہ اسے نادار کاشت کاروں سے زبردست ہمدردی تھی۔ یہ سبھی مسلمان ہیں جبکہ ان دنوں سبھی کے سبھی سرکاری اہل کار ہندو تھے۔

ایک دن گرمیوں کے موسم میں میں اور میری بیوی وادی میں سفر کر رہے تھے کہ ہم شام کو ایک گاؤں میں پہنچے جہاں ہم نے شب باشی کے لیے خیمے نصب کیے۔ پھر ہم نے گاؤں کے چوکیدار کو بلاوا بھیجا کہ وہ ہمارے لیے ضروری اشیا کا انتظام کرے۔ ان میں سب سے زیادہ ہمیں اپنے شیر خوار بچے کے لیے دودھ کی طلب تھی جو اپنے مخصوص اشاروں سے ظاہر کر رہا تھا کہ اسے

بھوک لگی ہے۔ چوکیدار اپنا لمبا سا بھالا لے کر ہمارے پاس پہنچا جس پر اس نے ایک جھنڈی باندھ رکھی تھی۔ یہ اس کے عہدے کی شناخت کا نشان تھا۔ میں نے اسے اپنی ضروریات کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ہمیں فوراً اپنے بچے کے لیے تھوڑا سا دودھ چاہیے۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے جواباً کہا کہ گاؤں میں دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ جب پوچھا گیا کہ اس گاؤں کے شیر خوار بچے کیا پیتے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا۔ ''وہ ہمیشہ پانی پیتے ہیں''۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی بیوقوفی چھوڑ کر جلد از جلد دودھ کا انتظام کرے تو وہ احمقوں کی طرح پھر بولا۔ ''میں کہاں سے لاؤں صاحب؟ کیونکہ گاؤں میں کوئی گائے ہے ہی نہیں''۔ اُسی لمحے میں نے دیکھا کہ کئی گائیں ہری بھری گھاس چر رہی ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون سا حیوان ہے۔ غالباً کوئی ریچھ ہوگا؟۔ وہ شاید میرا طنز سمجھ کے بولا۔ ''نہیں صاحب! یہ گائے ہے لیکن ہماری کوئی گائے دودھ نہیں دیتی۔ پھر میں نے اسے انڈے لانے کو کہا۔ اس پر بھی اس کا جواب یوں تھا کہ گائیں ہیں مگر مرغیاں نہیں ہیں۔ اسی وقت میں نے ایک مرغ کو بانگ دیتے ہوئے سنا۔ اب میں نے بھی اسی کے انداز میں اس سے پوچھا۔ ''یہ کیسی صدا تھی۔ کیا یہ کسی عقاب کی آواز تھی؟'' وہ بولا۔ ''نہیں صاحب! یہ مرغے کی آواز ہے۔ میں نے پھر سخت لہجے میں کہا۔ ''تو پھر جاؤ اور انڈے لاؤ!'' وہ انتہائی بے غیرتی سے بولا۔ ''ہمارے گاؤں میں صرف مرغے ہیں۔ یہاں کوئی مرغی نہیں ہے۔''

اب میرے صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا کیونکہ ہمارا بچہ رو رہا تھا۔ اور میری بیوی اسے تھوڑی سی چائے پلانے کے لیے متفکر تھی۔ میں نے آسمان میں ایک اڑتی چیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔ ''ذرا دیکھو یہ کون سا پرندہ ہے؟'' جب وہ اوپر کی طرف دیکھنے لگا تو میں نے جھپٹ کر اس کا بھالا اسی کی طرف موڑ کر کہا۔ ''دودھ، انڈے''۔ اس سے سارا منظر دم زدن میں بدل گیا۔ چوکیدار گاؤں کی طرف سرپٹ بھاگا اور زور زور سے چیختا رہا۔ ''قتل، قتل''۔ میں نے اسے دوڑتے ہوئے دیکھا جب تک کہ ہم گاؤں میں داخل نہ ہوئے۔ وہاں میں بھالا لیے جم کر بیٹھ گیا اور اسے ڈانٹ کر کہا کہ وہ فوراً میرا کام کرے۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ وہ دودھ، انڈے اور مرغے لا کر مجھ سے عاجزی کرنے لگا کہ میں اپنے کیمپ کی طرف لوٹ جاؤں۔ وہی میرے پیچھے پیچھے یہ سامان اٹھا کر آ رہا تھا کہ ہم دونوں اپنی ان چالاکیوں پر زور

زور سے ہنسنے لگے۔ پھر گویا یہ سارا معاملہ ایک کارخیر کی طرح انجام پایا۔ جب ہم گاؤں کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیے تو ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جان چکے تھے۔

دیہات کی ایک سڑک کے راستے ایک پہاڑی کی اونچائی تک چلتے چلتے میں نے چودہ قلیوں کی ایک جماعت کو دیکھا جو غذائی اجناس سے لدی بوریاں اٹھا کر جا رہے تھے۔ وہ واقعی بہت تھکے ہوئے تھے کیونکہ وہ چلتے چلتے ہانپ رہے تھے۔ یہ شام کا وقت تھا اور وہ اس محنت شاقہ میں دن بھر لگے تھے۔ میں نے اُن میں سے ایک کوتاہ قد قلی کو دیکھا جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھکا ہوا لگتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم تھک گئے ہو؟'' اس نے کہا۔ ''ہاں! میں اتنا تھک چکا ہوں کہ اگر چہ ابھی تک مرا نہیں مگر اب مرنے کو تیار ہوں''۔ میں نے اس سے کہا کہ آؤ میری پیٹھ پر چڑھ جاؤ، میں تمھیں پہاڑی پر لے جاؤں گا۔ اس نے مجھے کھلے منہ اور گھورتی آنکھوں سے حیرت سے دیکھا۔ میں نے اپنی بات دوہرائی اور اسے بوجھ سمیت اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ یہ میری جوانی کے دن تھے لہٰذا مجھے اسے اور اس کے بوجھ کو پہاڑی تک لے جانے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی۔ وہاں میں نے اسے نیچے اتارا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھی قلی ہم تک نہیں پہنچ چکے تھے بلکہ وہ اپنی چھڑیاں نیچے رکھ کر اور ٹانگیں زمین پر پھیلا کر ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر ہو رہے تھے۔ جب انھوں نے دم سنبھالا تو وہ پھر ہماری طرف چل پڑے اور ہنستے ہنستے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس طرح ہنسنے سے غالباً ان کی تکان دور ہوئی ہوگی۔ کشمیری ہنسنا جانتا ہے اور اُس کی یہ ہنسی کانوں کو اچھی لگتی ہے۔

جب کوئی کشمیری پھسل کر سڑک پر گر جاتا ہے تو آس پاس کے راہ گیر زور زور سے ہنستے ہیں جس میں گرنے والا شخص خود بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ہم کسی کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم خود بخود ہنسنے لگتے ہیں لیکن اگر کوئی حیوان گر جائے تو ہم ایسا نہیں کرتے۔

اب جبکہ ہم نے کشمیریوں کے اندرون میں کم وبیش جھانکا ہے ہم ان کے سب سے بڑے قصبے کو دیکھیں گے، ان کے روزمرہ کے کام کاج اور اُن دیگر مصروفیات کا بھی جائزہ لیں گے جو وہ دریا پر اور بازاروں میں سرانجام دیتے ہیں۔

سری نگر جس کے معنی ''دولت کا شہر'' (2) ہے سب سے زیادہ خوبصورت قصبہ ہے۔ یہ دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر تین میل تک پھیلا ہوا ہے اور اس منقسم شہر سری نگر کو سات پُل آپس میں ملاتے ہیں۔ جب سیاح کشتی میں شہر میں آ جاتے ہیں تو وہ یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا شہر دکھائی دیتا ہے جس پر بمباری کی گئی ہو کیونکہ عمارتیں سڑک سے نیچے کی سطح پر تعمیر کی گئی ہیں اور انھیں زبردست مرمت کی فوری ضرورت ہے۔

میرے اپنی رائے یہ ہے کہ اگر کسی نئی جگہ کو غور سے دیکھنا ہو تو وہاں کسی اونچائی پر چڑھ کر اس پر طائرانہ نظر ڈالی جائے۔ سری نگر میں ایسی ایک جگہ ایک ہزار فٹ کی بلندی پر شہر سے ڈیڑھ میل کی دوری پر واقع ہے جسے تخت سلیمان کہتے ہیں۔ ہندو قوم اسے شنکر آچاریہ یا مقدس کوہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر ایک قدیم ہندو مندر ہے جسے راجہ سندیمان نے بنوایا تھا۔ جو 2629 سے 2564 قبل مسیح تک کشمیر کا حکمران تھا۔ راجہ گوپادتیا (426 سے 365 قبل مسیح) اور للتا دتیا (734-697 عیسوی) اور دوسرے راجے وقتاً فوقتاً اس کی مرمت کرتے رہے۔ سکندر بُت شکن نے اس مندر کو نہیں توڑا کیونکہ سلطان محمود غزنوی نے اس کے اندر نماز ادا کی تھی۔

شنکر آچاریہ پہاڑی کی ایک ہزار فٹ اونچی بلندی سے وادی کا ایک دل نشین منظر آنکھوں کے سامنے کھل جاتا ہے جو جنوب میں بیس میل تک پیر پنجال کے پہاڑوں تک پھیل جاتا ہے۔ یہ پہاڑ پندرہ سو سے سولہ سو فٹ تک پھیل کر کشمیر اور پنجاب کو ایک حصار سے الگ کرتے ہیں۔

مشرق میں پچاس میل اوپر اور پچاس میل نیچے دریا کو بائیں طرف دیکھا جا سکتا ہے۔ بل کھاتی لکیروں اور پیچ در پیچ موڑوں سے گزرتا ہوا دریائے جہلم سورج کی روشنی میں نہاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ کشمیری شالوں پر نقش و نگار کا تصور دریا کے انہی نقوش سے اخذ کیا گیا ہے۔ نیچے کی طرف جنوب میں یورپی رہائشی مکان منشی باغ کے علاقے میں واقع ہیں۔ پھر یہاں درختوں سے گھری خوبصورت ریذیڈنسی ہے اور آگے کی جانب ڈاک خانہ، کوکس اینڈ کوکا بینک، الائنس بینک آف شملہ اور یورپی ایجنسیاں اور دکانیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ پھر شیخ باغ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے جہاں مشنریوں کے مکانات، عیسائیوں کا قبرستان اور سابق

ریذیڈنسی ہیں جہاں سر جان لارنس اور جنرل جان نکولسن رہتے تھے جب وہ کشمیر میں برطانوی ایجنٹ تھے۔ پھر دریا شہر میں داخل ہونے سے پہلے اپنا آخری موڑ کاٹ لیتا ہے۔

مغرب کی جانب دیکھ کر پہاڑی کے دامن میں مشہور مشن ہسپتال ہے جس کے ساتھ گالف کورس، پولو اور کرکٹ کے میدان اور نفاست سے چلایا جانے والا نیڈوز اینڈ سنز ہوٹل ہے۔ اس کے ساتھ رومن کیتھولک گرجا واقع ہے جہاں معزز پادری بولانڈ رہتا ہے۔ اس سے آگے وسیع میدان کے ساتھ سرکاری کالج دیکھا جاسکتا ہے۔ سڑکیں سفیدے کے درختوں کی قطاروں کے درمیان نظر آتی ہیں جن میں کہیں کہیں چنار کے درخت بھی نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد سری نگر کا شہر دریا کے دائیں اور بائیں دکھائی دیتا ہے جس میں دیدہ زیب مساجد، مینار اور منادر اپنی چمک دار چھتوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کئی ایک کی چھتیں مٹی کے تیل کے ڈبوں سے یا پالمیر کے بنائے بسکٹ کے ڈبوں سے ہی تیار کی گئی ہیں۔

شمال کی جانب نیچے جھیل ڈل ہے جو سال کے ہر موسم میں اور بالخصوص موسم بہار میں نہایت خوش منظر ہوتی ہے جب سرسوں کے پیلے کھیت نگاہوں کو ایک تراوٹ بخشتے ہیں جن میں کہیں کہیں آڑو اور خوبانی کے درخت بھی نظر آتے ہیں جنھیں ہری بھری گھاس کے پودوں اور جھاڑیوں، بید اور سفیدے کے درختوں اور عقب میں نیلے برف پوش پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ یہ سبھی رنگ جھیل کے صاف و شفاف پانی میں منعکس ہوتے ہیں۔ اس بے نظیر نظارے کے رنگا رنگ پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے جانچنا مشکل ہے۔

جھیل کے اُس پار مشرق کی جانب سات سو فٹ اونچی ہاری پربت کی پہاڑی واقع ہے جس کی چوٹی پر موجود ایک سکھ قلعے سے سارے شہر کو ایک آئینے کی طرح دیکھا جاسکتا ہے۔ اسے ٹاور آف لندن کی طرح ریاست کے قیدیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ قلعے سے ہر دن وقت کا پتہ چلتا ہے جب یہاں سے چار بجے صبح، دوپہر اور رات کے دس بجے ایک توپ داغی جاتی ہے۔ رات کے دس بجے توپ کی آواز کرفیو کا اعلان کرتی ہے اور اُس وقت سبھی اچھے شہریوں کو اپنے بستروں میں گھسنا چاہیے۔ اس وقت شہر میں کسی کو کوئی پل پار کرنے کی اجازت نہیں۔ چار بجے علی الصباح توپ چلانے کا مطلب یہ ہے کہ خدا دوست مسلمان جاگیں اور فجر کی نماز ادا کریں۔

کشمیر کے ہندو ہاری پربت کو شاریکا کہتے ہیں۔ مسلمان اسے کوہ ماران کے نام سے جانتے ہیں۔ اس پہاڑی کے حوالے سے یہ کہانی بیان کی گئی ہے:

زمانۂ قدیم میں کشمیر کے لوگوں کو دیتیا یعنی وہ دیو بہت ستاتے تھے جو عالم اسفل سے اس ملک میں ایک سوراخ کے راستے باہر آتے تھے۔ لوگ اپنے دیوتاؤں سے التجا کرتے رہے کہ انھیں اس وبال جان سے نجات دلائی جائے۔ ان کی آہ وزاری کے جواب میں شیو کی بیوی درگا ان کی مدد کے لیے ظاہر ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک مینا کی شکل میں تبدیل کیا جو کشمیر کے ایک بڑے کالے پرندے سے چھوٹی جسامت کی ہے۔ اس کی آواز کسی ہتھ گاڑی کی کیٹلی آواز کی طرح کرخت ہے اگر چہ اسے سیٹی بجانا اور بولنا بھی سکھایا جا سکتا ہے۔ یہ مینا پاتال میں اتری جہاں اس نے ایک مقدس پہاڑی میرُ و سے ایک ٹکڑا کاٹ لیا۔ پھر وہ اسے اپنی چونچ میں اٹھا کر اوپر لے آئی اور اس سے وہ سوراخ ڈھک لیا۔ اس سے دیو نیچے ہی دوزخ میں پھنس کر رہ گئے اور کشمیر کے لوگ بھی اس بڑی مصیبت سے آزاد ہوئے۔

یہ پہاڑی کشمیری ہندوؤں کے لیے اولمپس (3) کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی پوجا نامعلوم ادوار سے کی جارہی ہے۔ اس کے مشرقی دامن میں مخدوم صاحب اور ملا آخون شاہ کی زیارت گاہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مسلم آستانے ہندوؤں کی مذہبی عمارات کے اوپر بنائی گئی ہوں جیسا کہ کشمیر میں کئی اور مقدس جگہوں کے ساتھ ہوا ہے۔

پہاڑی کے مغربی سرے کے دامن میں ایک چٹان ہے جسے پرانے زمانے سے ہی مہاگنیش (ہاتھی دیوتا) کی حیثیت میں پوجا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب پرورسین نے اس نئی راجدھانی سری نگر کی بنیاد ڈالی تو دیوتا نے اس نیک بادشاہ کے احترام میں اُس کا منہ مغرب سے مشرق کی طرف کیا تھا تا کہ نئے شہر کو دوام بخشا جائے اور اسے دعائیں حاصل ہوں۔ یہ چٹان اب سرخ سیندور کی ایک موٹی تہہ سے اس حد تک ڈھک چکی ہے کہ کسی ہاتھی دیوتا کا چہرہ یا سر ہونے کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ اس بات کا تعین کرنا بھی مشکل ہے کہ اسے مشرق کی طرف پھیرا گیا ہے یا مغرب کی جانب موڑا گیا ہے۔

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں درج ہے کہ اس دیوتا نے سکندر بُت شکن کی حرکتوں سے

بددل ہوکر آخرکار شہر کی طرف اپنی پشت کر لی اور اب اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھا جا سکتا (4)

اس علاقے میں اس تحریر کی کوئی باقیات موجود نہیں جس سے پتہ چلتا کہ ہندو دور میں کبھی بھی شاریکا پہاڑی کی حصار بندی کی گئی ہو۔ موجودہ قلعہ جو اس پہاڑی کے تاج کی طرح ہے عطااللہ خان نے 1810 میں تعمیر کیا۔ اس کے آس پاس وقتاً فوقتاً حریف شہزادوں کے مابین اختلافات ان کی لڑائیوں کا باعث بن گئیں جو ڈوگرہ راج کے قیام سے پہلے مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور میں لڑی گئیں۔ اس سے قبل رنجیت سنگھ کے جرنیلوں نے جبار خان کی فوج کو شکست فاش دے کر اسے ملک بدر کیا۔

قلعے کے ارد گرد عظیم سنگی فصیل اور اس کے دامن میں زمینی رقبہ اکبر نے 1590 میں تعمیر کروا کے اسے سنبھالا جس کا ثبوت مرکزی دروازے پر موجود ایک تحریر سے اب بھی ملتا ہے۔

یہاں سے شہر کا نظارہ خاص کر بہار کے موسم میں نہایت غیر معمولی ہوتا ہے۔ اس سے آنکھوں کو ہرے بھرے کھیتوں کا منظر نصیب ہوتا ہے۔ جو ٹیڑھی میڑھی مینڈوں میں منقسم ہیں۔ چھتیں سبز گھاس سے ڈھکی ہیں اور ان میں سے اکثر پوست اور گل لالہ کے پھولوں سے سجی ہیں۔ انھیں بھی آڑی ترچھی گلیوں اور کوچوں نے الگ الگ کر دیا ہے۔ دیکھنے والے کو اس وقت مغالطہ ہو جاتا ہے جب وہ بھیڑ اور بکریوں کو ہوادار چراگاہوں میں چرتے ہوئے دیکھتا ہے اور گائیں بھی ان کے ساتھ پیٹ بھر رہی ہیں۔ یہ ایک غور طلب بات ہے کہ کسی بھی مکان میں چمنی نہیں ہے۔ یہ چھتیں اتنی ڈھلوان بھی نہیں جیسا کہ سلیٹی یا ٹائلوں والی چھت ہو سکتی ہے۔ پہلے پہلے اکثر و بیشتر چھتوں کو دھان کی گھاس سے ڈھانپا جاتا تھا لیکن اس سے ایسی خطرناک آگ لگ جاتی کہ اب سرکار کسی مکان بنانے والے کو ایسی گھاس چھت کے استعمال میں لانے کی اجازت نہیں دے گی۔ اب تو یہ چھتیں کیچڑ سے لیپی گئی ہیں اور اسی لیے ان سے گھاس اور پھول اُگتے ہیں۔

یہ چھتیں شہتیروں اور لکڑی کے موٹے موٹے ڈنڈوں پر کھڑی کی جاتی ہیں جو ایک مضبوط سہارا ہے۔ ان کے اوپر تین سے چھ انچ موٹائی کی ایک ہموار سطح تیار کی جاتی ہے تا کہ بھوج پتر اپنی جگہ مضبوطی سے جما رہے۔ بھوج پتر کاغذ کی طرح ہے جسے درختوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی چادریں کوٹے جانے کے بعد کارڈ بورڈ کی شکل میں ڈھالی جاتی ہیں۔

بھوج پتر کو زمانہ قدیم سے کاغذ کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ پرانے زمانے میں کتابیں اسی کے اوراق پر تحریر کی جاتی تھیں اور کئی دکاندار بھی اپنا حساب کتاب اسی پر درج کرتے تھے۔ بھوج پتر کو وہ اپنی فروختنی اشیا کو باندھنے کے لیے بھی استعمال میں لاتے تھے۔

کیچڑ کی چھتیں نہایت وزنی ہوتی ہیں۔ خاص کر جب رات کو بھاری برف باری یا اس کے بعد بارش ہوتی ہے تو برف کا وزن سنبھالنے کی طاقت سے محروم یہ چھتیں ڈھہ جاتی ہیں جس سے کبھی کبھی مکان کی تباہی کے سوا سوئے ہوئے اہل خانہ بھی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر چھت میں اوپر؛ ایک چھوٹا سا دروازہ بنایا جاتا ہے (5) جہاں سے گھر کے لوگ باہر نکل کر برف ہٹا کر اسے نیچے سڑک پر پھینک دیتے ہیں اگر چہ کبھی کبھی یہ برف ان راہ گیروں کے سروں پر بھی گرتی ہے جو نیچے سڑکوں پر چلتے ہیں۔ مکانوں کی چھتوں سے مختلف کام لیے جاتے ہیں جیسے ان پر شالی اور میوے سوکھنے کے لیے بچھائے جاتے ہیں اور جب موسم خزاں میں ان پر تہہ در تہہ سرخ مرچیاں نظر آتی ہیں تو ان کی رنگینی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی ہیں۔ مسلمان فرقے کے لوگ ان چھتوں پر نماز بھی ادا کرتے ہیں۔ یہ ان کی ایک عادت ہے کہ وہ اُس جگہ کو نماز کے لیے منتخب کریں جہاں سے دوسرے لوگ انھیں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ سکیں (6)۔

میں ایک دن آتش زنی کے ایک واقعے کے وقت موجود تھا جب آگ کے شعلے ایک مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر اس مسجد کی چھت پر ایک سفید ریش بزرگ ملا چڑھ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں قران تھا۔ پھر اس نے اونچی آواز میں اس کی تلاوت شروع کی۔ اسے پوری امید تھی کہ اس عمل سے مسجد بچ جائے گی مگر ایسا ہوا نہیں بلکہ اسے خود دوسری چھت پر پناہ لینی پڑی۔ وہ آگ کی حدت، دھویں اور شعلوں میں گھر کر ایک چھت سے دوسری چھت کی طرف دوڑتا رہا۔ بہر حال یہ اس کی ایک قابلِ دید کوشش تھی جس سے اس کے یقین اور عقیدے کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا تھا۔ گرمی اور ہوا نے آگ کے شعلوں کو دور دور تک پھیلنے میں مدد دی جس سے اس کی لمبی داڑھی کو بھی خطرہ لاحق ہوا جو ایک پھٹے ہوئے جھنڈے کی طرح لہرانے لگی۔ اب آگ اس کے جھریوں والے چہرے تک پہنچ گئی تھی اور اس کا چہرہ شعلوں سے دہکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ قرانی آیات کی زور زور سے تلاوت کر رہا تھا۔ عربی چونکہ مسلمانوں کی مقدس زبان ہے

لہٰذا قرآن کی تلاوت بھی اسی زبان میں کی جاتی ہے۔ شہر کو اونچائیوں سے دیکھنے کے بعد اب ہم دریا سے اس کے مناظر دیکھیں گے۔ ہم ایک کشتی لیں گے اور اب دریا کے ساتوں پلوں سے ہوتے ہوئے سری نگر کا جائزہ لیں گے۔

ہماری کشتی بھی ایک چھوٹی سی ناؤ ہے جسے شکارا کہتے ہیں۔ یہ شکارا کرایہ پر ملتا ہے۔ یہ کشتی تقریباً تیس فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اس کا اگلا اور پچھلا حصہ نسبتاً کم چوڑا ہوتا ہے۔ اس کے سرے جو سخت ہوتے ہیں شکارے کے آگے اور پیچھے کی طرف سطح آب سے اوپر اٹھے ہوئے ہوتے ہیں جس سے کشتی کو تیزی سے گھمانے میں ملاح کو اُس وقت آسانی ہوتی ہے جب دریا میں دوسری کشتیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ملاح اسی طرح چکر کاٹ کاٹ کر اپنے لیے راستہ نکال لیتا ہے۔

ان کشتیوں کو عام طور پر تین یا چار افراد چپوؤں سے کھیتے ہیں۔ چپو کا پانی کے اندر کا حصہ کنول کے پھول یا دل کی شکل کا ہوتا ہے۔ کشتی بان کشتی میں بیٹھ کر اسی طرف رخ کرتے ہیں جس سمت میں اسے چلنا ہو۔ مسافر ناؤ کے وسط میں بیٹھتے ہیں جن کے سروں پر چٹائیوں کی چھت انھیں دھوپ یا بارش سے بچاتی ہے۔

اولین پل جس کے نیچے سے ہم گزرتے ہیں پانچ محرابوں پر مشتمل ایک جدید طرز کا نمونہ ہے۔ اس کے ستون گلکاری کے فن کے بہتر استعمال سے بنائے گئے ہیں۔ تقریباً پچیس سال پہلے اس پل کے ساتھ دیودار اور صنوبر کی لکڑی سے تعمیر کردہ پل کو منہدم کیا گیا جس پر ایک وقت قدیم لندن کی طرح مکانات اور دکانیں بھی واقع تھیں۔

کشمیر میں ان پلوں کو سکندر اعظم کے افسروں نے متعارف کرایا (7) جو مضبوطی کے لحاظ سے عدیم المثال ہیں۔ اس پل سے ذرا آگے دریا کے بائیں کنارے پر ہز ہائی نیس مہاراجہ کا محل ہے جس کے ساتھ کئی اور عمارات بھی موجود ہیں لیکن وہ زیادہ خوبصورت تعمیرات نہیں ہیں۔ محل کے عقب میں اور دریا کے دوسرے کنارے کے ساتھ ہز ہائی نیس کے بجرے ہیں جو اس کے زنانے کی خواتین کے لیے بنائے گئے ہیں۔ انھیں چلانے کے لیے ساٹھ کشتی بان درکار ہوتے ہیں۔ ان سے بھی چھوٹی کشتیاں موجود ہیں جنھیں پرندے کہا جاتا ہے۔ انھیں تیس ملاح کھیتے

ہیں۔ان کا استعمال مختصر سیر وتفریح کے لیے کیا جاتا ہے۔ جب ان کے ملاحوں کا سربراہ چپو چلاتے وقت ایک خاص آواز نکالتا ہے تو باقی کشتی ران بھی اس کی آواز میں آواز ملا کر ایک خوش کن آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ محل کے مقابل کنارے پر ایک اسٹیم لانچ بھی ہے جو ملکۂ وکٹوریہ نے ہز ہائی نیس کو تحفہ میں دیا تھا۔ان کشتیوں کے کونے پتھروں کے اس زینے کے ساتھ بندھے رہتے ہیں جو مرحوم مہارانجہ کی یاد میں ایک یادگاری پتھر کو چھوتے ہیں۔اس سے آگے ریاست کا تار گھر ہے جو لوگوں کے لیے اطمینان بخش بھی اور تکلیف دہ بھی ہے۔

ایک دن میں یہ شکایت لے کر تار گھر گیا کہ میں نے ایک دوست کو ایک برقیہ بھیجا تھا جو اسے اس دن تک بھی نہیں ملا تھا جب اسے میرا وہ خط موصول ہوا تھا جو میں نے ڈاک میں تار کے ساتھ ارسال کیا تھا۔ تار گھر کے افسر نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے لگتا ہے کہ خط تار سے جلدی ملتا ہے تو آئندہ میں خط ہی بھیجا کروں۔

مجھے وہ دن یاد ہے کہ ہمیں ڈاک خانے میں بھی دقت ہوتی تھی جب وہاں کشمیری ٹکٹوں کا استعمال ہوتا تھا۔ میرے ایک دوست نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اسے چند استعمال شدہ کشمیری ٹکٹیں اسے بھیج دوں۔ میں نے تیس کشمیر پوسٹ کارڈ خریدے اور انھیں اپنے ہی نام اور پتے پر ڈاک میں ڈال دیا۔ان میں سے مجھے صرف تین کارڈ ملے۔ حالانکہ میرے دوست کے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی ٹکٹ لگے کشمیر کے تصویری پوسٹ کارڈوں کی فرمائش کی تھی۔اُن دنوں اگر آپ یہ چاہتے تھے کہ آپ کی چٹھیاں آپ کے اُن دوستوں تک پہنچ جائیں جو کشمیر میں رہتے ہیں تو بہتر یہی تھا کہ ان پر کوئی ٹکٹ نہ چپکائی جائے کیونکہ ڈاکیہ کبھی ان خطوط کی چھانٹ کرتے وقت انھیں خلط ملط کرتا تھا اور صحیح خط صحیح شخص کے لیے تلاش نہ کرکے کئی خطوط کو ضائع ہی کر دیتا۔لیکن اگر خط پر ٹکٹ نہ ہو تو مکتوب الیہ کو اصلی ٹکٹ کی قیمت سے دوگنی رقم ادا کرنی پڑتی۔ جس سے ڈاک والوں ہی کو فائدہ ہوتا۔اُن دنوں میں نے کئی پرانی ٹکٹیں خریدیں تا کہ بعد میں انھیں ٹکٹ فروشوں کے ہاتھ اچھی قیمت پر فروخت کروں لیکن ایسا کرتے ہوئے مجھ سے کہا گیا کہ میری یہ ساری ٹکٹیں اصل ٹکٹوں کی نقل ہیں۔ ممکن ہے کہ ڈاک خانوں میں کام کرنے والے کچھ اہل کار اسی طرح پرانے سانچوں سے ٹکٹیں چھاپ کر پیسے کماتے ہوں گے۔

مجھے لگتا ہے کہ ٹکٹیں جمع کرنے کے شوقین لوگوں کو یہ جاننے کے لیے بے حد تکلیف برداشت کرنی پڑی ہوگی کہ آیا وہ اصلی ہیں یا نقلی۔ایسی ٹکٹیں بنانے والوں کے پاس کچھ کاغذ، روغن کا ڈبہ اور ایک برش ہوتا ہے جس سے وہ کاغذ کو رنگتے ہیں۔جب روغن کا برتن خالی ہو جائے تو وہ اسے پانی سے بھرتے ہیں۔اس طرح اگر سرخ ٹکٹیں بنانا ہوں تو پہلے پہل تیار ہونے والی ٹکٹیں واقعی سرخ رنگ کی ہوتی ہیں مگر آہستہ آہستہ ان ٹکٹوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور پھر روغن کی دوبارہ ضرورت پڑتی ہے۔اسی وجہ سے کشمیر کے ٹکٹیں جمع کرنے والے کشمیری ٹکٹوں کی اس سودابازی میں نہایت محتاط رہتے ہیں۔میرے ایک دوست نے بہت ساری کشمیری ٹکٹیں جمع کی تھیں جنھیں وہ ایک ٹکٹ فروش کے پاس لے گیا تا کہ وہ ان سے اچھا خاصا منافع کما سکے۔ٹکٹوں کے اس بیوپاری نے انھیں بغور دیکھا اور پھر اس سے اندر کے کمرے میں آنے کو کہا۔اس کمرے کی دیواروں پر وہ ٹکٹیں چپکی تھیں جو نقلی تھیں۔ٹکٹ فروش نے اِن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"اگر میں نے آپ کی کشمیری ٹکٹیں خرید لیں تو میں ان کا بھی صرف یہی استعمال کر سکتا ہوں"۔

کچھ عرصہ قبل نقلی ٹکٹیں تیار کرنے اور انھیں دوبارہ چھاپنے کا کاروبار اس حد تک زوروں پر تھا کہ سرکار کو ایک قانون بنانا پڑا جس کی رو سے اس غیر قانونی کام میں ملوث لوگوں کو جیل میں ڈالنے کا اعلان کیا گیا۔اس طرح ایسے چند نام نہاد شریف لوگ بھی اس سزا کی زد میں آ گئے جنھیں یہ قابل اعتراض کام کرتے ہوئے پکڑا گیا۔اب لوگ اس کام میں ملوث ہونے سے پہلے ضرور سوچتے ہیں کہ کیا اسے جاری رکھا جائے یا نہیں؟ میرے خیال میں وہ اب اس بات کو ذہن نشیں کر چکے ہیں کہ ایسا کرنا غلط ہے۔اسی لیے اب کشمیری ٹکٹ فروش کہیں نظر نہیں آتے۔

ریاستی تار گھر کے باہر اور دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ہر طرح کی کشتیاں ٹھہری ہوئی نظر آتی ہیں۔ان میں چھوٹے شکارے بھی ہیں جنھیں کشتی بانوں کے خاندان کا کوئی بھی چھوٹا لڑکا یا لڑکی چلاتے ہیں کیونکہ انھیں اس کی تربیت لڑکپن سے ہی دی جاتی ہے۔یہاں بڑی کشتیاں بھی ہیں جن میں مختلف سامان مثلاً چاول اور لکڑی لادی جاتی ہے۔(8) رہائشی کشتیاں کسی بھی دیکھنے والے کی خاطر دلچسپی کے کئی سامان فراہم کرتی ہیں۔ان میں زندگی کی گہما گہمی ہوتی ہے اور یہ دلچسپی پیدا کرنے والوں میں کنبے کا مالک اور خون چوسنے والے پسّو بھی شامل ہیں۔

ان کشتیوں کے پاس سے گزرنے والے کو لگتا ہے کہ ان میں ہر وقت کوئی نہ کوئی مصروفیت رہتی ہے۔ ٹھہری ہوئی کشتیوں میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کشتی باش ان کے سروں پر بیٹھ کر حقہ پیتے یا چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں جبکہ بزرگ دادی یا نانی چرخہ کات رہی ہے تو عورتیں کھانا پکانے میں مصروف ہیں۔ کشتی کے نزدیک سے گزرنے والے کو لگتا ہے کہ کنارے پر موٹے موسل سے دھان کوٹا جا رہا ہے۔ دیگر افرادِ خانہ مرغیوں اور چڑیوں کو بھگاتے ہیں جو وہاں چاول کے دانے چگنے کی تاک میں لگی ہوتی ہیں۔ کچھ عورتیں لکڑی کے بڑے چمچوں سے برتن میں دریا کا جراثیم خوردہ پانی ڈال رہی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کنارے پر زور زور سے چلا چلا کر اوپر اڑتی ہوئی چیلوں کو دور بھگانے کی کوشش میں اپنے بازو اور کپڑے ہلاتی ہوئی عجیب اشارے کرتی ہیں۔ یہ چیلیں ان کے مرغی کے چوزوں کو ہڑپ کرنے کے لیے اوپر منڈلا رہی ہیں جب کوئی چیل پوری رفتار سے جھپٹ کر چوزوں کو پکڑنے کے لیے نیچے کی طرف لپکتی ہے تو مرغی انھیں اپنے پروں میں سمیٹ کر چیختی ہے۔ چیل ناکام ہو کر واپس آسمان کی طرف اڑ جاتی ہے اور عورتیں پھر سے کھانا پکانے کے کام میں لگ جاتی ہیں۔ یہ عورتیں اس کتے سے بھی تنگ ہیں جو لکڑیوں کے ایک ڈھیر کو بار بار سونگھ کر دیکھتا ہے کہ کھانے کی کوئی چیز مل جائے۔ پھر وہ چپکے سے کشتی کے اندر داخل ہوتا ہے جہاں اسے گوشت کا ایک ٹکڑا چھت سے لٹکتا ہوا نظر آتا ہے، قبل اس کے کہ وہ اس پر جھپٹ پڑتا کشتی کے باہر ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا ہے۔ کتا یہ شور شرابہ دیکھ کر خاموشی سے دم دبائے چلا جاتا ہے اور سبھی خوش ہیں کہ گوشت کا ٹکڑا محفوظ ہے۔ کتا اگرچہ مایوس ہے مگر ارادے کا پکا ہے اسی لیے وہ ایک الگ تھلگ جگہ پر لیٹ کر سونے کا بہانہ کرتا ہے اگرچہ وہ برابر جاگ رہا ہے۔

اب پھر امن کا ماحول بحال ہوا ہے۔ کشتی کے کسی چپو کا ڈنڈا اگر اس کی کھڑکی سے باہر اوپر کی طرف کھڑا ہے تو اس پر خوبصورت پروں والا ماہی خور پرندہ آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی نظریں پورے انہماک سے پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیوں پر جمائے بے حس و حرکت بیٹھا ہے اور دم زدن میں غوطہ لگا کر کسی چھوٹی سی مچھلی کو چونچ میں پکڑ کر پھُر سے دور اڑ جاتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ یہ ماہی خور پرندہ (کشمیری میں: کولہ ٹونچ) چیلوں کے مقابلے میں اپنا شکار پکڑنے میں عام طور پر کامیاب ہی ہوتا ہے۔

اب ہمیں ان حیوانوں اور پرندوں سے دامن چھڑا کر پھر کشتی بانوں کی طرف لوٹنا چاہیے۔ کنبے کا سربراہ جو خاموشی سے حقہ پیتا اور کچھ سوچتا دکھائی دے رہا ہے، یکا یک اُس لمحے غصے سے بھرا نظر آتا ہے جب وہ اس شخص کو دوسری کشتی میں پاس سے گزرتے ہوئے دیکھتا ہے جس کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کو اور ان کی عورتوں کو جی بھر کے گالیاں دی تھیں۔ اب اس تنازعہ نے پھر سے سر اٹھایا ہے، الفاظ کی جنگ پھر شروع ہوئی ہے جو چند لمحوں میں زوردار چیخوں اور چلانے کی کرخت آوازوں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس دھما چوکڑی میں دونوں کشتیوں کی عورتیں بھی بڑھ چڑھ کر شامل ہوئی ہیں جن کی فلک بوس چیخ پکار میں مردوں کی آوازیں دب گئی ہیں۔ کھانا پکانا بھلا یا گیا ہے کیونکہ دونوں کشتیوں کے افراد اپنے بازوؤں اور بھینچی ہوئی مٹھیوں کی عجیب حرکتوں سے ایک دوسرے کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ایک ایسے شخص کے لیے جو نیا نیا اس طرف آیا ہو، یہ منظر نامہ ایک فیصلہ کن جنگ کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں اب خون بھی بہایا جائے گا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے اس قسم کی جتنی بھی لڑائیاں دیکھی ہیں ان میں شاذ و نادر ہی مار پیٹ ہوئی ہے۔ یہ محض لفظوں کی جنگ ہوتی ہے۔(9)

یہ کشتیاں اگر چہ ایک دوسرے سے دوری پر ہیں لیکن مرد کشتی بان اب بھی اشتعال انگیز ہیں اور ایک دوسرے کو برابر دھمکیاں دے رہے ہیں۔ پھر اگر ایک کشتی دوسری کے بالکل قریب جاتی ہے تو لڑنے والے ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کرتے ہیں اور نہایت توہین آمیز لہجے میں بڑبڑاتے ہیں کہ وہ اپنے چپو سے بھی ایک دوسرے کو چھو کر اپنی بے عزتی نہیں کریں گے۔ پھر اگر ان میں سے کوئی دوسری کشتی والے کو بزدلی کا طعنہ دے تو پہلی کشتی کا مرد اُسے پکڑ کر اپنی بیوی کو مخاطب کر کے چلا چلا کر شور مچائے گا۔ '' پکڑو! مجھے پکڑو! ورنہ میں اسے قتل کر دوں گا''۔ پھر یہ عورتیں بھی چیختی ہوئی اپنے اپنے شوہروں کا گھیرا ڈال کر انھیں چھڑانے لگتی ہیں جو خود بھی اپنے آپ کو اس جھڑپ سے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ کشتیاں اب الگ الگ ہو جاتی ہیں اور سبھی اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ یہ سلسلہ پھر شروع کیا جائے۔

یہ شور انگیز لڑائی علی العموم چلتی ہی رہے گی جب تک کہ دونوں فریق تھکاوٹ سے چور نہ ہوں

اوران کی آوازیں بیٹھ نہ گئی ہوں۔ جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو دونوں اپنی اپنی ناؤ میں موجود مرغیوں کے مخصوص ٹوکرے کو الٹا کر رکھ دیتے ہیں جو اس بات کا اشارہ ہے کہ فی الحال لڑائی بند کی جائے۔ امن کا یہ ماحول کئی گھنٹوں تک یا دوسرے دن تک قائم رہتا ہے۔ پھر جب ایک یا دوسرا فریق اپنے کو تازہ دم محسوس کرتا ہے وہ ٹوکرے کو سیدھا کرتا ہے یعنی اعلان جنگ دوبارہ ہو چکا ہے۔ ہانجیوں کی یہ لڑائیاں پہلے پہل ان کے روزمرہ میں شامل تھیں جو شہر کی سیر کرنے والے ہر شخص کے لیے باعثِ تفریح بن جاتیں۔ ان لڑائیوں میں کسی کے مال یا سامان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا البتہ عورتوں کو ہر قسم کی گالیوں سے نوازا جاتا۔ اسی لیے لفظِ ہانجی بجائے خود ایک گالی کے برابر مانی جاتی ہے۔ اگر آپ کسی با اخلاق شخص کو برا بھلا کہنا چاہتے ہیں تو اس سے صرف یہ کہہ دیں: ''لگتا ہے کہ تم کوئی ہانجی ہو''۔

میں اس موقع پر اپنے ہم وطنوں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اس ملک میں اگر وہ کسی وقت رہائشی کشتیاں، ڈونگے یا ہاؤس بوٹ کرایہ پر لینے کے خواہاں ہوں تو ایسی کشتیاں نوجوان انگریزوں کے لیے اخلاقی طور پر باعثِ ہلاکت ثابت ہو جاتی ہیں۔ اور میں نے بذاتِ خود ان میں سے چند ایک کو مرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مجھے ایک ایسے ہی نوجوان کی یاد آتی ہے جو غلط کام کر کے ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسے ان بدخصلت ہانجیوں نے شیشے میں اتارا تھا جو اُس سے پیسہ حاصل کرنے کے لیے اپنی عورتوں کا چارہ بنا کر ان نوجوانوں کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مقامی گروہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس گندے کام میں لگا ہے جس کے سرغنہ کو میں نے بار بار تنبیہ کی ہے کہ وہ یہ کارِ خباثت بند کرے۔

جن نوواردوں کو دو پاؤں والے حیوانوں کے اس طبقہ نے ہراسان کیا تھا وہ میرے پاس مشورہ اور مدد کے لیے آتے تھے۔ میں عام طور پر انھیں اپنی حرکات قابو میں رکھنے کی خاطر دو واقعات سناتا تھا جو اس طرح ہیں:

ایک بار ایک کرنل پریشانی کے عالم میں میرے پاس آیا اور مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ وہ تین دن کا دریائی سفر کر کے بارہمولہ سے سری نگر آیا تھا۔ جب اس نے کشتی بان کو کرایہ ادا کرنا چاہا

تو اُس سے پانچ سو روپے مانگے گئے جبکہ اصل کرایہ چار روپے سے بھی کم تھا۔ جب کرنل نے اس غیر مناسب مانگ کی وجہ پوچھی تو ہانجی نے کہا کہ اس کی ناؤ میں ایک ناچنے والی لڑکی ہے اور اگر اسے پانچ سو روپے نہیں دیے گئے تو وہ لوگوں سے کہے گا کہ کرنل صاحب سفر کے دوران کشتی میں اس لڑکی کے ساتھ ہم بستری کرتا رہا ہے۔

دوسرا واقعہ ایک کم رتبے کے افسر کا ہے جو اسی طرح کی صورت حال میں پھنس گیا تھا۔ اس نے کسی سے مشورہ کیے بغیر معاملہ رفع دفع کیا کیونکہ اس کا ہانجی کشتی سے دریا میں کود چکا تھا اور سواری کو خدشہ تھا کہ وہ کنارے پر جا کر نہ جانے اس کے خلاف لوگوں کو کیسے کیسے اکسائے گا۔ مجھے پتہ چلا کہ یہ کشتی والا اسی گروہ کا فرد تھا جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عظیم سپاہی، دہلی کا جنرل جان نکولسن جب کشمیر میں برطانوی ایجنٹ تھا تو وہ اس مکروہ کاروبار کا قلع قمع کرنے کی جی جان سے کوشش کرتا رہا۔

میں یہاں ان ہانجیوں کی برائیوں کے تذکرہ پر ہی اکتفا نہیں کروں گا کیونکہ انسان کے ہر طبقے میں کہیں نہ کہیں قابل تحسین اچھائیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔

میں ان کے پیشے کی مناسبت سے ہانجیوں کی عزت کرتا ہوں کیونکہ انھوں نے اپنی کشتی سازی کے فن کا مظاہرہ کر کے مجھے ہمیشہ خوش کیا ہے۔ وہ اس فن کے بادشاہ ہیں۔ میں نے انھیں اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر طوفانی لہروں کو چیرتے ہوئے دریا کی اوپری جانب ایک ڈنڈے یا چپو سے اسے عبور کرتے دیکھا ہے۔ وہ اس کام کے دوران کسی پل کے نیچے اس کے مضبوط پشتوں یا کسی عمارتی سوراخ کے ساتھ اپنے چپو لگا کر ناؤ کو سہارا دیتے ہیں۔ پتھروں کی دیواروں میں ہر سوراخ اور دراڑ کا پتہ ہے جس میں ناؤ کھینے کا ڈنڈا ڈال کر وہ اپنی محنت میں کسی حد تک سہولت پیدا کرتے ہیں۔

پھر اُن میں یہ خاصیت بھی موجود ہے کہ وہ بے حد محنت کش ہیں۔ وہ اپنی کشتی کو دریا کے اوپر کی طرف سارا دن کھیتے ہی رہیں گے اور اگر ضرورت پڑی تو رات کو بھی یہ صبر آزما کام جاری رکھیں گے۔

مجھے ایک ایسے ہی کشتی بان کی صحبت نصیب ہوئی جسے میں ہانجیوں کا بادشاہ کہوں گا۔ اس کا نام اِسالا (10) ہے۔ اس پر خدا کی رحمت ہو۔ یہ شخص میرے لیے ہر کوئی کام کرتا۔ دریا یا جھیل

میں اس سے بہتر کشتی بنانے والا مجھے اور کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کے آس پاس کے مانجھی سراسیمگی کی حالت میں چیختے چلاتے اور ادھر اُدھر چھلانگیں لگاتے اور ان کی عورتیں اپنے بال نوچ نوچ کر کپڑے پھاڑ ڈالتیں۔ قطع نظر اس کے کہ پانی کا درجۂ حرارت کتنا ہے، ضرورت پڑنے پر اسمالا فوراً دریا میں کود پڑتا۔ زبردست سیلابوں، شہر میں ہونے والی آتش زنی کی وارداتوں یا وبا پھیلنے کے وقت وہ ہمیشہ متاثرہ جگہوں پر موجود رہتا۔ سیلابوں کے دوران جب اس کے ہم پیشہ بھائی بند لوٹ کا مال سمیٹنے میں لگ جاتے، اِسمالا جان جوکھم میں ڈال کر انسانی جانیں اور سامان بچانے میں لگ جاتا۔ میں اُس پر ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔

اسمالا صرف ایک بات سے ڈرتا تھا۔ وہ تھی اس کی بیوی کی زبان۔ میں اسے دوش نہیں دوں گا کیونکہ وہ ہمیشہ کشتی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اسی بیوی کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ مجھے اس بات کی کوفت بار بار ستارہی تھی اور پھر میں نے بھی اس عورت کی زبان کو لگام دینے کی کوشش کی مگر میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میں اس میں ناکام ہی رہا اور میں مانجھیوں کے بادشاہ کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔

اسمالا اپنے آپ کو اس قینچی جیسی زبان سے نجات دلا سکتا تھا اگر وہ بھی اپنے ہی پیشے کے ایک اور بھائی کے نقش قدم پر چلتا جس کی بیوی ہمیشہ شوہر کے کہے ہوئے کا الٹ کرتی۔ جب ان کی کشتی دریا میں ایک ناہموار اور طوفانی حصے میں داخل ہوتی تو شوہر اس سے کہتا کہ وہ ناؤ کے سرے پر بیٹھنے کے بجائے اس کے وسط میں منتقل ہو جائے تاکہ کشتی کے ہچکولے کھانے کی صورت میں وہ دریا برد نہ ہو جائے۔ لیکن وہ سرے پر ہی بیٹھی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پانی میں گر کر نظروں سے غائب ہوگئی۔ جب ناؤ کنارے لگ گئی تو شوہر نے بیوی کو دریا کی اوپری جانب کناروں پر چل کر دیکھنا شروع کیا تو لوگوں نے اس سے کہا: ''ارے بھائی! کیا کر رہے ہو؟ تمھاری بیوی پانی میں گر کر نیچے کی طرف بہہ گئی اور تم اسے اوپر کی طرف ڈھونڈ رہے ہو؟''۔ اس نے جواب دیا کہ اس کی بیوی ہمیشہ ہر کام الٹا کرتی ہے۔

اسمالا بھی بیوی کی تیز گفتاری سے اسی طرح نجات حاصل کر لیتا مگر وہ ایک صابر اور خاموش طبیعت انسان تھا اور پھر یہ کہ یہ عورت اسمالا کے دشمنوں سے بار بار جھگڑا کرتی رہتی جس کا مظاہرہ

میں نے خود بھی دیکھا ہے۔

میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ ہانجی بد اخلاق ہوتے ہیں۔ مگر اسالا ایک الگ ہی ذات کا انسان ہے۔ شاید اسی لیے وہ دوسرے ہانجیوں کے مقابلے میں سفید چہرے کا مالک ہے جبکہ دیگر سبھی ہانجی کالی شکل وصورت کے ہیں۔

ہم نے ہمیشہ اپنے بچوں کو پورے بھردسے کے ساتھ اسالا کی صحبت میں رکھا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اس کے پاس محفوظ ہیں اور جب اسالا موجود ہو تو کسی کو انھیں زک پہنچانے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔

ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اسالا جیسے کئی اور کشتی بان ضرور موجود ہوں گے جن سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ اسالا پر لقوے کا حملہ ہوا تھا مگر وہ صحت یاب ہوا۔ میں ہانجیوں کے اس بادشاہ سے پھر ملاقات کا مشتاق ہوں۔ اسے پُرتبسم چہرے اور سرخ داڑھی سمیت چپو ہاتھ میں لیے پھر سے پہلے ہی کی طرح دیکھنا باعث مسرت ہوگا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ہانجی اب گذشتہ دنوں کی طرح لڑائیوں میں نہیں الجھتے بلکہ اب وہ اس کے برعکس نمازیں پڑھتے ہیں۔ بعد دوپہر آپ کو یہ لوگ نماز کے وقت یا تو کسی دیوار کے اوپر یا اپنی کشتی کے عرشے پر نماز ادا کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ عورتیں مردوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتیں نہ ہی وہ مسجدوں کے اندر جاتی ہیں البتہ چند امیر گھرانوں میں مولوی عربی زبان میں اُنھیں نماز پڑھنا سکھاتے ہیں جسے وہ بالکل ہی سمجھ نہیں پاتیں۔

فٹ نوٹ:

(1) یہاں مصنف سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ اس نے منگول کو بھی مذہب کہا ہے۔ بودھ مت اگر چہ واقعی ایک مذہب ہے مگر منگول ایک نسل ہے مذہب نہیں۔

(2) جی نہیں۔ سری نگر کے معنی ہیں سوریہ یعنی سورج کا شہر۔

(3) قدیم یونانی دیومالا کے مطابق اولمپس عالم بالا میں ایک افسانوی پہاڑ کا نام ہے جس میں یونانیوں کے دیوی دیوتا رہتے تھے۔

(4) لگتا ہے کہ یہاں بھی مصنف سے واقعاتی طور پر چوک ہوئی ہے۔ دیوی دیوتا ہر ملک کی دیو مالا میں نامعلوم ادوار کی مخلوق ہیں۔ ہندوؤں کے ہاتھی دیوتا کو سلطان سکندر کے زمانے سے وابستہ کرنا ایک غیر حقیقی مفروضہ ہے کیونکہ سکندر کا دورِ حکومت ہمیں معلوم ہے جبکہ ہاتھی دیوتا کے بارے میں یہ کسی طور پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب موجود تھا۔

(5) کشمیری زبان میں اسے 'دوگہ' کہتے ہیں۔

(6) بسکو کے اس بیان میں ہمیں مبالغہ آمیزی دکھائی دیتی ہے کیونکہ کشمیری مکانوں کی چھتیں ڈھلوان ہوتی ہیں اور ان پر جائے نماز بچھا کر بے خطر ہو کر نماز ادا کرنا عملی صورت میں ناممکن لگتا ہے۔ یہ مفروضہ اس لیے بھی بے بنیاد لگتا ہے کہ کوئی بھی مسلم اپنے گھر کے کسی بھی کمرے میں نماز آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اُسے چھت پر چڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک سچا نمازی دوسروں کو دکھانے کے لیے نہیں بلکہ خدا کی رضامندی کے لیے ہی عبادت کرے گا۔

(7) اس دلیل کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کیونکہ یہ سکندرِ اعظم کے دور کے بہت بعد تعمیر کیے گیے۔ اس تعمیری سلسلے میں کئی غیر ملکی اور ملکی دونوں حکام کا عمل دخل ہے۔ سکندر 326 قبل مسیح میں سندھ کے راستے ہند میں داخل ہوا جبکہ دریائے جہلم کے سات پل غیر ملکی اور ملکی حکام نے تعمیر کروائے جن میں اٹھارھویں صدی عیسوی میں افغان گورنر امیر خان جوان شیر کا بنوایا جہلم کا پہلا پل امیرا کدل بھی شامل ہے۔

(8) جن کشتیوں میں کھڑکیاں نہیں ہوتی ہیں وہ مال ڈھونے کے کام میں لائی جاتی ہیں جس میں چاول، آٹا، ایندھن اور لکڑی وغیرہ شامل ہیں۔ انھیں کشمیری میں 'بہتو' کہتے ہیں۔ کھڑکیوں والی بڑی کشتیاں ڈونگے کہلاتی ہیں جو کشتی بان کنبے رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

(9) یہاں مصنف نے چند ایسے پیراگراف اگلے باب ''مسلمان اور کشمیری ہندو'' کے عنوان سے شروع کیے ہیں جو کشتی بانوں کی آپسی چپقلش کی مزید تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان عبارات کو ان کی مناسبت سے چھٹے باب کے آخر پر ہی جگہ دی ہے۔

(10) اصل نام اسماعیل ہے۔ نچلے طبقوں میں عام طور پر ناموں کو بگاڑا جاتا ہے مثلاً رسول کو رَستا، علی کو علیا، محمد کو موما وغیرہ کے نام دیے جاتے ہیں۔

ساتواں باب

مسلمان اور کشمیری ہندو

ملک کشمیر کے مسلمان کو بھی حسبِ ہدایت دن میں پانچ بار نماز ادا کرنی ہوتی ہے۔ ہر کوئی مسلمان یہ نماز ایستادہ ہوکر اور کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے انگوٹھوں کو کانوں کے نیچے رکھنے کے بعد ہاتھوں کی انگلیاں پھیلاتا ہے، اسے تکبیر کہتے ہیں۔ پھر وہ اپنے ہاتھ نیچے کر کے انھیں پیٹ یا چھاتی پر رکھتے ہوئے دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھتا ہے۔ اس طرح دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اللہ کی شکل بن جاتی ہے، اس عمل کو تحریم کہتے ہیں۔ پھر وہ اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر ایک ہلال کی طرح جھک جاتا ہے جسے رکوع کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی پیشانی زمین پر ڈال کر سجدہ کرتا ہے۔ یہ عمل/ دو بار دوہرایا جاتا ہے۔ بالآخر وہ اپنی بائیں ٹانگ پر بیٹھتا ہے۔ نماز کی تکمیل کے بعد وہ دائیں بائیں دو فرشتوں کراماً کاتبین کی طرف سلام پھیرتا ہے جو اس کے اعمال کو اس کی زندگی کے دوران درج کرتے رہتے ہیں۔

کشتی بان زیادہ تر نمازی نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ دن بدن آسودہ حال بنتے جا رہے ہیں اور اپنے آپ کو زیادہ آزاد محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے دلوں سے مولویوں یا اپنے ساتھی مذہب پرستوں کا رعب رفتہ رفتہ زائل ہو رہا ہے۔

عوامی مجالس میں نماز ادا کرنے سے مسلمان کا وقار اس کے ہم مذہبوں کے دلوں میں بڑھ

جاتا ہے۔ الگ تھلگ نماز پڑھنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسی ہی ہمت عیسائیوں کو بازاروں میں یا عام جگہوں پر عبادت کرنے کے لیے چاہیے۔لوگوں کے درمیان عبادت کرنا مذہبی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ اپنی نمازوں کی نمائش کرتے ہیں وہ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔

عیسائیوں میں بھی یہ عادت پائی جاتی ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں زیادہ باتیں کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔کشمیر میں بہر حال مذہب اور زندگی کا ایک دوسرے سے کوئی ناطہ نہیں اور جو لوگ مذہب پرست ہوتے ہیں وہ اپنی عبادت کا چرچا نہیں کرتے۔

دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف جاتے وقت جگہ جگہ کناروں پر سیڑھیوں پر نہانے کے گھاٹ موجود ہیں۔ہندو برہمن انہی گھاٹوں پر گھٹنوں تک پانی میں جا کر اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔کشمیر کے ہندو اکثر علی الصباح نیند سے جاگتے ہیں۔بستر چھوڑنے سے پہلے اپنے پیٹ کے بل لیٹ کر ایک مختصر سا عبادتی عمل انجام دیتے ہیں۔ان میں جو زیادہ مذہب پرست ہوتے ہیں وہ ایسا کرتے وقت صاف کپڑے، قالین یا ہرن کی کھال پر بیٹھ کر تسبیح پھیرتے ہیں۔اس دوران وہ بودھوں کی طرح ویدوں کا پاٹھ کرتے ہیں یا تھوڑی دیر کے لیے سانس روک کر ذہنی آسودگی حاصل کرتے ہیں۔یہ عبادت صرف خلوت میں ہی کی جاتی ہے۔پھر وہ شبستان سے نکل کر دریا کی طرف جاتے ہیں جہاں وہ کچھ اور مذہبی رسومات انجام دیتے ہیں جبکہ دوسرے کناروں پر بیٹھ کر روزمرہ کی عبادت یعنی سندھیا کرتے ہیں۔اپنے کپڑے اتارنے کے بعد ایک ہندو دریا کے کنارے پہلے بایاں پاؤں اور پھر دایاں پاؤں دھوتا ہے۔کیونکہ ہندو عقیدے کے مطابق جسم ایک طرح سے جنسی جبلت کا حامل ہوتا ہے اور اپنے بائیں پہلو میں وہ نسوانی خصائص دیکھتا ہے۔عورت (شکتی) کے بارے میں یہ تصور موجود ہے کہ وہ مرد سے بہتر مخلوق ہے۔بایاں پیر پہلے دھویا جاتا ہے۔عورت بھی ہر مذہبی رسم کی ادائیگی کے وقت اپنے شوہر کے بائیں طرف بیٹھتی ہے۔اس طرح کوئی رسم تب تک مکمل نہیں کہلائی جاسکتی جب تک کہ اس میں عورت بھی شریک نہ ہو۔اکثر ہندو عورت کی شکل والی دیوی کی عبادت کرتے ہیں۔اگر ہندو فرقہ عورت کے تئیں اپنے عقائد میں کچھ تبدیلی لائیں تو اس بے چاری کو شاید غیر ضروری تکالیف سے نجات مل

سکے۔ اپنا پاؤں دھونے کے بعد یہ ہندو تھوڑا سا پانی لے کر ویدوں کے منتر سے تمام مقدس دریاؤں کی روح کو یاد کرتا ہے جن میں گنگا، جمنا، گیا وغیرہ شامل ہیں۔ اب وہ پانی سے اپنا منہ، زنار اور سر کے بالوں کی مخصوص لٹ ایک مختلف منتر پڑھ کر دھوڑالتا ہے۔ بعد میں وہ اپنے بازو پھیلائے سورج کی طرف پھیلے ہوئے ہاتھ اٹھاتا ہے تاکہ ہوا کے دیوتاؤں کو بلایا جائے اور وہ صاف و پاک ہو۔ اخیر پر وہ اپنی بائیں طرف تین بار پانی کا چھڑکاؤ کرتا ہے۔

اس عمل کے سلسلے میں وہ مٹی کا ایک ٹکڑا کنارے پر رکھ کر اس کے تین حصے کرتا ہے اور ان پر الگ الگ منتر پڑھتے ہوئے پانی چھڑکتا ہے جس سے اس کا مقصد سورج کے دیوتا کو یاد کر کے اپنے من کی پاکیزگی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ مٹی کے ایک ٹکڑے کو اٹھا کر اسے چاروں سمت پھینک دیتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ اپنے جسم پر ملتا ہے اور تیسرا حصہ دریا میں ڈال دیتا ہے۔ پھر پانی کی تھوڑی سی مقدار ہاتھ میں لیے وہ دریا میں اتر کر نہا لیتا ہے۔ دریا میں کھڑے ہو کر وہ اپنے اجداد، ہندوستان کے قدیم سنتوں اور دیوتاؤں کا نام لے کر تین مرتبہ پانی کا چھڑکاؤ کرتا ہے۔ اب وہ پانی سے باہر آ کر کپڑے پہن لیتا ہے اور پھر ایک بار کنارے پر بیٹھ کر اپنی سانس درست کرنے کے ساتھ ساتھ اس رسم کا باقی حصہ پورا کر لیتا ہے۔ پہلے وہ بائیں نتھنے سے ایک گہری سانس لیتا ہے، اسے چند لمحوں کے لیے اندر ہی رکھتا ہے اور پھر اسے دائیں نتھنے سے آہستہ آہستہ باہر چھوڑ دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مشق سے فکری اطمینان حاصل ہوتا ہے جو کچھ دیر تک قائم رہتا ہے۔

یہ رسم بھی تین یا چار بار انجام دی جاتی ہے۔ اس سارے عمل کو اس وقت اختتام کو پہنچایا جاتا ہے جب وہ ہاتھوں کو عجیب و غریب انداز میں حرکت دیتا ہے۔ تسبیح پھیرتا ہے اور ایک ایسے طریقے سے پانی کا چھڑکاؤ کرتا ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس عبادت کا وہ حصہ دیکھنے والے کو پوری طرح متوجہ کر لیتا ہے جب یہ ہندو منہ سے پچکاری کی طرح پانی دور دور تک پھینکتا ہے۔

دریا کے ساتھ چلتے چلتے آپ کو جگہ جگہ ہندو عورتیں پیتل کے برتن دھوتی نظر آئیں گی۔ ہندو صرف پیتل ہی کے برتنوں میں کھانا پکاتے ہیں۔ وہ پیتل ہی کے برتنوں میں کھاتے اور پانی پیتے ہیں۔ یہ دیکھنا عجیب سا لگتا ہے کہ وہ پیتل ہی کے پیالے میں بہت گرم چائے پیتے ہیں جو اس

پیالے سے زیادہ حرارت والی ہوتی ہے اور اس کے ہونٹ بھی نہیں جلتے۔اگر ہندو مٹی یا چینی کے برتن استعمال کریں تو وہ انھیں ساتھ ہی پھینک دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ایسے برتن دوبارہ صاف نہیں کیے جاسکتے۔ پیتل کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ اسے دوسرے برتنوں کے برعکس بار بار صاف کیا جاسکتا ہے۔لہٰذا ہندو عورتیں یہ برتن ریت اور کیچڑ سے صاف کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔اگر چہ دیکھنے والے کو اس کا باہری حصہ ہی نظر آئے گا۔اندر کا حصہ صاف کرنے میں انھیں سہولت نہیں ہوگی اور وہ بھی جب اس کا دہانہ تنگ ہو۔ان عورتوں کے پاس مندر کا کوئی ہندو پجاری بھی پیتل یا پتھر کے بُت صاف کرنے یا کوئی دھارمک رسم ادا کرنے کے لیے وہاں نظر آئے گا۔

یہ پجاری پہلے منتر پڑھ کر ایک مخصوص دیوتا کو یاد کرتا ہے۔اس کے بعد وہ اسی دیوتا کو نہلاتا ہے جو اس کے عقیدے کے مطابق پیتل یا پتھر میں براجمان ہے۔وہ تھوڑے سے دودھ میں پانی ملاتا ہے جسے وہ بت پر ڈال دیتا ہے۔دریں اثناوہ ویدوں سے زُود زُود منتر پڑھتا ہے۔اس میں اسے کم از کم بیس منٹ یا اس سے زیادہ وقت لگتا ہے۔جیسا کہ پجاری کے پاس وقت میسر ہو۔پھر وہ بُت کو تولیہ سے پونچھتا ہے اور اسے پھولوں اور چاول سے ڈھانپتا ہے۔ضروری نہیں کہ اس کے پاس صاف تولیہ ہو۔

ادھر دریا کے کنارے ایک عورت چاقو سے ایک مچھلی صاف کر رہی ہے وہ اس کے پر اکھیڑ لیتی ہے (اگر چہ مچھلی پکڑنے کا پاپ ایک مسلمان نے کیا ہے)۔اُدھر ایک شخص بید کے درخت کی پتلی شاخ سے اپنے دانت صاف کر رہا ہے۔اسے دانتوں کا پیارا برش کہا جاتا ہے۔وہ ہاتھوں سے منہ میں پانی ڈال کر غرارے کرتا ہے۔کبھی کبھی یہ خیال کر کے حیرانی سی ہوتی ہے کہ ان غراروں میں مچھلی کے اندر کا کتنا مواد شامل ہوتا ہوگا؟ وہ پانی کی ایک مقدار ناک کے اندر بھی کھینچتا ہے جس سے اس عضو کی اچھی خاصی صفائی ہوتی ہے۔

نیچے دھوبی کپڑے دھونے میں مصروف ہے۔اگر یہ کپڑے آپ کے اپنے نہ ہوں تو یہ نظارہ اس وقت دلچسپ بن جاتا ہے جب وہ ایک کے بعد ایک کپڑا اٹھا کر اسے سیڑھیوں پر پوری طاقت سے پٹختا رہتا ہے۔کبھی اس سے کپڑے کے سارے بٹن ٹوٹ جاتے ہیں۔پھر وہ ان دھلے کپڑوں کو اس طرح نچوڑتا ہے کہ ان کا ایک سرا پاؤں تلے دبا کر دوسرا سرا دونوں ہاتھوں سے پکڑ

کر بار بار گھما تا ہے۔اس کے بعد وہ انھیں سوکھنے کے لیے دریا کے گندے کنارے پر پھیلا کر سورج کی روشنی میں ڈال دیتا ہے۔دیگر کپڑے دھوتے وقت اس کی نظریں برابر آوارہ کتوں اور چوزوں پر لگی رہتی ہیں جو دُھلے کپڑوں پر چلنا پسند کرتے ہیں۔ان کپڑوں کے حصوں کو چبانا کسی گائے یا بیل کا بھی پسندیدہ شغل ہے یا ایک کوے کو ان کپڑوں میں سے ایک چھوٹا رومال یا رنگین کپڑا اپنے گھونسلے میں رکھنا اچھا لگتا ہے۔اس لحاظ سے دریا کے کنارے دھوبی کا کپڑے دھونے کا کام کوئی آسان کام نہیں۔

ہماری بیگمات کو یہ دھوبی ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔اس کی ایک وجہ بھی تھی کہ یہ طبقہ ہیرا پھیری کرنے میں ماہر تھا۔کسی وقت اگر ہمارا کوئی بڑا رومال اُس کے ہاتھوں گم ہو جاتا تو وہ ہمارے ہی دوسرے رومال کے دو حصے کر کے ہمیں لوٹاتا اور اپنی نظروں میں تعداد برابر کر لیتا۔ اسی طرح جب ہمارا ایک خوبصورت اور قیمتی کوٹ ہمیں واپس نہیں ملتا تو دھوبی کوئی بہانہ کرتا لیکن اس کا جھوٹ اس وقت سامنے آجاتا جب کوئی دولہا یہی کوٹ پہن کر اور اس کے جانے پہچانے حصے طلائی اور نقرئی چیزوں سے آراستہ کر کے شہر میں گھوم گھوم کر پھولے نہیں سما تا تھا۔

اس کے باوجود دھوبی لوگ بہت آرام پہنچاتے ہیں۔کیونکہ وہ شاندار کام سر انجام دیتے ہیں۔ ان کا عوضانہ بھی کم ہوتا ہے جبکہ انگلستان میں کپڑے دُھلانے کی لاگت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سال قبل میں نے ایک سو کپڑے دھونے کے لیے صرف تین روپے دیے جن میں ایک جیبی رومال سے لے کر بستر کی چادر تک شامل تھی۔

انگلستان میں دھوبیوں کو ادائیگی کرتے وقت دل چاہتا ہے کہ کاش کشمیر کے دھوبی بھی تندرست اور توانا ہوں۔مگر وہ تو دبلے پتلے جسم والے ہوتے ہیں۔لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرے پاس دو ہٹے کٹے دھوبی تھے۔ان میں سے ایک کو میری بیوی دوسرے افراد خانہ کے ساتھ جنگل میں ہماری چھوٹی کٹیا میں لے گئی تھی جہاں وہ اطمینان سے ہمارے کپڑے دھوتا رہا۔ایک دن اس نے گھر جانے کے لیے رخصت مانگی اور یہ وعدہ کر گیا کہ وہ تین دن بعد لوٹ کر آئے گا مگر وہ نہیں آیا۔اس نے اپنے کمزور باپ کو اس پیغام کے ساتھ ہمارے پاس بھیجا کہ جنگل کی زندگی اسے راس نہیں آئے گی کیونکہ وہاں تیندوے اور ریچھ ہوتے ہیں لہٰذا اس نے اپنے باپ کو کام کے لیے بھیجا ہے۔

دریا کے ہر گھاٹ پر، جسے یارہ بل یا دوستوں کے ملنے کی جگہ بھی کہتے ہیں، ایک لمبا چوڑا پتھر ملے گا جس کے سرے پر ایک بہت بڑا چھید نظر آئے گا یہ عام لوگوں کے مل کر کپڑے دھونے کی جگہ ہے۔ یہاں غیر تربیت یافتہ دھوبی کپڑے دھوتے ہیں اور پھر انھیں پاؤں تلے روند کر اسی طرح نچوڑتے ہیں جس طرح شراب بنانے کے کارخانوں میں انگور کے گچھوں کو پیروں سے دبا دبا کر شراب نکالتے ہیں۔ ان دھوبیوں کو کام پر دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ کاش وہ اپنے پیروں کو ذرا سا صاف رکھتے۔

دریا کے کنارے ایک دلچسپ منظر یہ ہے کہ تین یا چار عورتیں یا لڑکیاں ایک دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے اپنے سامنے والی لڑکی کا سر کھجاتی ہے۔ دراصل انھوں نے جنگل میں رہنے والے اپنے اجداد کی ایسی ہی رسم کا الٹ اپنایا ہے جس سے وہ اپنے مہمانوں یا کرایہ داروں سے چھٹکارا پانے کے لیے یہ رسم ادا کرتی ہیں۔ یہ اسکاوٹوں کا ایک عمل ہے۔

یہ دیکھ کر عجیب سا لگتا ہے کہ کشمیری کتنے گندے لوگ ہوتے ہیں حالانکہ پانی ہر جگہ ان کے آس پاس موجود ہے۔ اسی طرح اگر چہ دھونے دھلانے کے سارے سامان ان کے پاس ہیں پھر بھی وہ گندے کپڑے پہنے ہوئے ہی دکھائی دیں گے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ انھیں اپنے کپڑے دھونے چاہئیں تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے کپڑے جلدی پھٹ جاتے ہیں۔ عزت دار عورتیں بھی گندے کپڑے پہنتی ہیں کیونکہ اگر انھوں نے صاف کپڑے پہنے تو ان کے بارے میں یہ افواہیں اڑتی جائیں گی کہ وہ بدکردار ہیں۔

مجھے خوشی کا وہ دن یاد ہے جب میں برما گیا اور مجھے رنگارنگ کپڑوں میں ملبوس وہاں کے لوگوں نے گھیر لیا۔ وہاں عورتیں آزادی سے مردوں کے ساتھ ملتی جلتی دیکھی گئیں۔ وہ کتنے خوش اور ہنس مکھ تھے۔ نہ کسی کی غیبت اور نہ ہی کسی کی برائی کرتے تھے۔ کشمیر بھی کبھی برما کی طرح تھا جب یہاں بودھ رہتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا کشمیری بھی اُس وقت کے برما کے لوگوں کی طرح صاف و پاک اور خوش مزاج تھے؟

میں نے دریا پر ہر سُو پھیلی ہوئی بد بو کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس وقت لکڑی چیرنے والوں کو دیودار کے بڑے بڑے شہتیروں پر کام میں لگایا گیا ہے۔ اسی طرح ان کشتیوں کے پاس گزرتے

ہوئے بھی خوشبو سے خوشگوار کیفیت پیدا ہوتی ہے جن میں مصالحہ جات بھرے ہوتے ہیں یا جب شام کو کھانا پکایا جاتا ہے۔ ایک سیلانی کو دریا یا سری نگر کے بازاروں کی سیر کرتے وقت اپنی پائپ یا سگار ساتھ رکھنے چاہئیں جبکہ عورتوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان کے پاس بھی خوشبودار بوتل ہو۔

عملی طور پر آپ کو ہر گھاٹ پر ماشکی نظر آئیں گے جنھیں بھشتی یا مردانِ فردوس کہتے ہیں۔ واقعی گرمیوں کے موسم میں وہ لوگ جنتی مخلوق ہی لگتے ہیں۔ وہ بکری کی کھال کے بستے میں لکڑی کے ایک بہت بڑے چمچے سے پانی بھرتے ہیں۔ یہ کام زیادہ تر عورتیں ہی کرتی ہیں جو آنکھوں کو پیاری لگتی ہیں۔ خاص کر جب وہ کندھے پر مٹی کا برتن اٹھائے خراماں خراماں چلتی ہیں تو ان کی عشوہ طرازی کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ اگر چہ یہ بہت ہی محنت طلب کام ہے پھر بھی پانی فراہم کرنے کا کام عورتوں کو ہی سونپا جاتا ہے۔ ایک مٹی کے بڑے برتن کو پانی سے بھرنے کے بعد زمین سے اٹھا کر کندھے یا سر پر بٹھانا کوئی آسان کام نہیں۔ میں نے اس سلسلے میں مردوں کو نزدیک ہی بے مقصد کھڑے ہو کر یا بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کبھی عورتوں کا ہاتھ نہیں بٹاتے ہیں کیونکہ یہ ایسی رسم ہے جسے بدلنا مشکل ہے۔

ابھی تک ہم نے دریائے جہلم کے کناروں پر رہنے والے لوگوں کی زندگی اور عادات واطوار پر اظہارِ خیال کیا ہے لیکن ہمیں اب ان مکانوں کی بات بھی کرنی چاہیے جو دریا کے کنارے گویا پانی کی طرف جھکے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ یہ مکان اگر چہ ایک بے ڈھنگ طریقے سے تعمیر کیے گئے ہیں پھر بھی ان کی انفرادی خوبصورتی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مکان اکثر وبیشتر لکڑی کے چوکھاٹوں سے بنے ہیں جو اینٹوں کے ساتھ جڑے ہیں۔ اس طرزِ تعمیر کی وجہ سے یہ مکان اُن تعمیروں کے مقابلے میں زلزلوں کے دوران محفوظ رہ سکتے ہیں جو ٹھوس مواد سے مستریوں نے بنائے ہوں۔

اگر آپ کی نظر ایک ایسے مکان پر پڑے جسے کسی نے بنوایا ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے ایک باہری ستون پر کوئی پرانا اور ٹوٹا ہوا برتن لٹکا ہوا ہے۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ شیطان کا منحوس سایہ اس مکان پر نہ پڑے کیونکہ اگر شیطان کوئی نیا مکان دیکھے تو وہ اس پر اپنا سایہ کرتا ہے لیکن جب اسے یہ ٹوٹا ہوا برتن دکھائی دیتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ تو ایک پرانی تعمیر ہے۔ اس قسم کی

حرکات اور بھی کئی چیزوں کے ساتھ وابستہ ہیں جن میں نوزائیدہ بچے اور قالین وغیرہ شامل ہیں۔ مائیں عام طور پر بچوں کے چہرے دھوئے بنا ہی چھوڑ تے ہیں تا کہ ان پر بھی شیطان کی بری نظر نہ پڑے۔ اگر یہ مائیں آپ کو اپنا بچہ دکھائیں تو آپ بچے کے بارے میں یہی کہہ دیں کہ وہ بدشکل ہے کیونکہ اگر آپ نے اسے خوبصورت یا ہٹا کٹا کہا تو ماں کو بہت اضطراب ہوگا۔ چونکہ یہ ایک نازک معاملہ ہے لہٰذا آپ صرف اتنا ہی کہہ دیں کہ ''دیکھو! کیسا بچہ ہے''۔ اگر یہ ایک قالین ہے تو آپ اسے دیکھ کر اس میں صرف نقص تلاش کریں جیسے آپ کی نظروں میں اس کے نقوش یا رنگ بے ربط ہیں۔

مکانات میں تعمیری نقص بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اکثر جگہوں پر ان کے شاہ نشین اس طرح باہر کی طرف نکالے گیے ہیں کہ انھیں سہارا دینے کے لیے ان کی سیدھ میں زمین میں لمبے ستون گاڑے گئے ہیں جو انھیں منہدم ہونے سے بچاتے ہیں۔ جب میں نے اپنی تعمیر کا کام شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ مستری زیرِتعمیر دیوار سڑک کی جانب ٹیڑھی بنا رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ صحیح تعمیر کی خاطر شاقول (1) کا استعمال کرے۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ کشمیری ایسا نہیں کرتے کیونکہ وہ ان چیزوں کے بغیر ہی اپنا کام کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کشمیریوں کی بصارت اچھی ہے مگر میں نے اس سے کہا کہ اس کی بینائی کمزور ہو چکی ہے لہٰذا وہ اس ٹیڑھی میڑھی دیوار کو گرا کر اسے دوبارہ صحیح طریقے سے بنائے۔

مہاراجہ کے محل سے گزرنے کے بعد صرف چند ہی عمارتیں اپنی طرف توجہ کھینچ لیتی ہیں۔ ان میں تخت کے وارث راجہ ہری سنگھ کا بنگلہ بھی ہے۔

ان میں سے پتھروں اور اینٹوں سے تعمیر کردہ ایک خوبصورت مکان آج سے تیس سال پہلے کے گورنر کا ہے۔ ان دنوں شہر میں یہ ایک ہی مکان تھا جس کی کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ مجھے آج بھی اس کے نئے مکین کے ساتھ اپنی ملاقات یاد ہے۔ اُس نے مجھے آدھ گھنٹے تک انتظار کروایا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مجھ پر اپنی اہمیت اور میری کمتری ظاہر کرے۔ پھر بھی وہ آدھا گھنٹہ ضائع نہیں ہوا کیونکہ اس دوران اس کے نوکر نے مجھے سرکاری کمرے کے عجائبات دکھائے۔ اس نے میری توجہ شیشے کے ایک فانوس کی طرف مبذول کی جو کمرے کے وسط میں

چھت سے لٹک رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جب اس میں روشنی ہوتی ہے تو اس کے رنگ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے مجھے ایک قیمتی تصویر دکھائی جسے گورنر نے حاصل کیا تھا۔ نوکر نے مجھے کمرے کے ایک خاص کونے تک آنے کو کہا جہاں سے اس تصویر کو بہترین صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میں نے اسی کی طرح اپنی آنکھوں کو روشنی سے بچانے کے لیے ان کے اوپر دونوں ہاتھ رکھے اور اس کے بعد واقعی یہ تصویر خوب تر دکھائی دی۔ اس کے بعد مجھے کمرے کی جنوبی دیوار کی طرف لے جایا گیا جہاں ملکۂ ہند وکٹوریہ کی ایک تصویر آویزاں تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس تصویر کو ایک الگ زاویے سے دیکھ لوں۔ ارے! میں تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا جب مجھے ملکہ کی تصویر کے برعکس وہاں ایک انگریزی کتا دکھائی دیا۔ نوکر میری حیرانی سے خوش ہوا۔ ہم نے اب تقریباً ساری چیزیں دیکھ لی تھیں کہ بڑا صاحب خود کمرے میں داخل ہوا۔

دریا کی نچلی طرف بالمقابل مہاراجہ کا مندر ہے جہاں دھرم سبھا یا مذہبی کونسل ان ہم مذہبوں تک دھرم کا پیغام پہنچانے کے لیے جمع ہوتی ہے جنھوں نے کسی مختلف ذات کے لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا ہو یا اسی طرح کا کوئی سنگین پاپ کیا ہو۔ یہ مندر بجائے خود ایک چھوٹی سی سنگی عمارت ہے جس کی چھت کا گنبد ٹین کی چادروں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کا اندرون دس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا ہے جس میں ذرا اونچائی پر پتھروں سے تراشا ہوا لنگم کی شکل میں بھگوان شو کا بت ہے۔ یہاں پوجا پاٹھ کرتے وقت عقیدت منداپنے ساتھ دودھ، کھانڈ، چاول اور پھول بت پر چڑھاتے ہیں اور پجاری ان سے پیسے وصول کرتا ہے۔ یہ مندر صحن کے اندر واقع ہے اور اس سے نیچے سیڑھیوں کی قطار دریا کے ساتھ ملتی ہے۔ ان سیڑھیوں کے اوپر ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں دھرم سبھا کے اراکین اپنی مجلس جماتے ہیں۔

دریا کے بہاؤ کی طرف تھوڑا سا آگے فتح کدل کے ساتھ لڑکیوں کے لیے چرچ مشن اسکول ہے اور اس سے آگے لڑکوں کا سی۔ ایم۔ ایس ہائی اسکول واقع ہے۔ یہ تعلیمی ادارے دراصل بیوپاریوں کے ہیں جنھیں درس گاہوں میں تبدیل کیا گیا ہے۔ ان کی بالکنیاں دریا کی طرف جھکی ہیں جن سے طلبا سیدھے دریا میں نہانے کے لیے چھلانگیں لگاتے ہیں۔ وہ یہ چھلانگ بیس سے پچاس فٹ کی اونچائی سے لگاتے ہیں۔ یہ واحد عمارت ہے جس کے اوپر ایک پرچم لہرا

رہا ہے۔لال رنگ کے اس جھنڈے پر اسکول کا نشان ہے جو دو چپوؤں پر مشتمل ہے اور جس پر "ہر لحاظ سے مرد بنو" لکھا ہے۔اس سے سبھی شہریوں اور لڑکوں کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ جاگو اور کھیلو۔

دریا کے مقابل کی طرف ایک بہت بڑی دیدہ زیب عمارت ہے جو اس سے پہلے ایک گورنر کی رہائش گاہ تھی۔لیکن یہ کئی سال تک اس افواہ کی بنا پر خالی رہی کہ اس میں خبیث روحیں رہتی ہیں۔

کوئی اٹھارہ سال پہلے صوفی منش مسز اینی بیسنت (2) کو اُس وقت اس عمارت کو اس حال میں دیکھ کر دکھ ہوا جب وہ مشن اسکول کے خلاف کام کرنے کے لیے کشمیر آئی۔اس نے مشن اسکول سے تین سولڑ کے اٹھا کر اسی عمارت میں داخل کیے۔اس کام میں اسے نام نہاد مہاتماؤں کی نہیں بلکہ ان کشمیری اور ہندوستانی تاجروں کی حمایت حاصل رہی جو اس کے پیروکار بن چکے تھے۔ جنگ کے ان دنوں میں کئی دلچسپ باتیں دیکھنے کو ملیں۔اس خاتون نے کشمیر مشن اسکول اور خاص کر مسٹر بسکو کے بارے میں ہندوستانی اخباروں میں ایسی خبریں شائع کروائیں جن میں سے ایک چٹپٹی خبر جو ہندوستان میں چالیس مقامی اخباروں میں چھپی، کچھ اس طرح ہے:

"مسٹر بسکو، جو کشمیر میں ایک مشنری ہے، ہندو لڑکوں کو شہر کی سڑکوں پر مردہ گئے گھسیٹنے پر مجبور کرتا ہے"۔

اینی بیسنت کے اس جھوٹ کو اُسی کے آئینے میں منعکس کرنے کی غرض سے ہم نے ایک چال چلی۔نانی نام کا ایک ولایتی کتا حاصل کر کے اسے ایک ایسے اصطبل میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جو ایک خستہ عمارت لگتی تھی۔ہم نے اسے بیسنت ہی کا کتا ظاہر کیا۔ جب وہ مر گیا تو بیسنت کے اسکول کے چند لڑکے اسے گھسیٹتے ہوئے دکھائے گئے۔اس کی ایک تصویر بھی ہم نے کھنچوائی۔

اتفاق سے میرے پاس ایک انگریزی سپینیل کتا تھا جس کا نام ٹیلی تھا۔اگر چہ وہ ویلز سے نہیں تھا اور نہ ہی چور تھا۔وہ بہت ہی وفادار کتا تھا اور ملکہ کے لیے جان دینے کو تیار تھا۔میں ٹیلی کو اصطبل میں لے گیا جو خستہ حالت میں تھا اور شہر کا مکان لگتا تھا۔لڑکوں کو میں نے رسی دے کے تیار رکھا اور ٹیلی ملکہ کی بجائے مسز بیسینت کے لیے مر گیا۔رسی ٹیلی کی پچھلی ٹانگوں سے باندھی گئی جسے

لڑکے کھینچنے لگے۔ باقی کا کام ایک مہربان فوٹوگرافر نے انجام دیا۔ اس طرح سے مسز بیسینٹ کے الفاظ جو چالیس ہندوستانی اخبارات میں چھپے تھے، لافانی بن گئے۔ کون جانے کہ یہ حیران کن خبر کن کن ممالک میں پھیل گئی تھی کہ ایک مشنری مسٹر بسکو برہمن لڑکوں سے مردہ کتے کھنچواتا ہے۔

یہ رنگین کہانی اچانک ہمارے من کو بھا گئی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے لافانی بنایا جائے تاکہ یہ بات ثابت ہو کہ کم از کم ایک جھوٹ تو سچ ہے۔

فٹ نوٹ:

(1) شاقول (کشمیری میں شوولہ) وہ ڈوری ہے جس کے سرے پر پیتل کی ایک گول گیند جیسی چیز بندھی ہوتی ہے۔ کلکار اس سے اوپر سے نیچے تک دیوار کا سیدھا پن جانچنے کا کام لیتے ہیں۔

(2) اینی بیسنٹ (1933-1847) لندن میں پیدا ہوئی۔ وہ صوفیانہ فلسفے کی حامی تھی۔ اس تحریک کو 1875 میں روسی نژاد خاتون ہیلینا بلاواتسکی نے تھیوسافکل سوسائٹی کے نام سے شروع کیا تھا۔ یہ دراصل اُن ہندو نظریات پر مبنی ہے جن میں انسان کا بعد از مرگ دوبارہ زندہ ہونا بھی شامل ہے۔ مسز بیسنٹ انسانی حقوق کی علمبردار، ادیب اور اعلیٰ پائے کی مقرر تھی۔ مسز بیسنٹ نے ہندوستان میں 1933 میں وفات پائی۔

آٹھواں باب

مساجد، مندر اور دُکانیں

اب ہم تیسرے پل کے پاس پہنچے ہیں جسے فتح خان (1) کے نام کی مناسبت سے فتح کدل کہتے ہیں۔ کوئی ساٹھ سال قبل ایک کھمبا اور بہت بڑا کانٹا تھا جس پر سے اُن لوگوں کو لٹکا کر پھانسی دی جاتی تھی جنھوں نے گائے کو ذبح کرنے کا ارتکاب کیا ہو۔ یہ سزا دوسرے لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے رائج العمل تھی۔ اس پل کے چار پشتے تھے اور اس پر دکانیں بھی تھیں جنھیں اب منہدم کیا گیا ہے۔

دریا کے ذرا آگے دائیں کنارے پر شاہ ہمدان کی دیدہ زیب مسجد ہے جسے دیودار کی لکڑی سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی چھت موسم بہار میں گل لالہ کے پھولوں سے خوب سجی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے مشرق کی طرف نقوش ونگار سے آراستہ داخلی دروازہ ہے جس کے اوپر عربی زبان میں یہ تحریر کندہ ہے: ''یہ شاہ ہمدان کا آستانہ ہے جو خدا کا بہت بڑا ولی ہے۔ جو اس بات پر یقین نہیں کرے گا وہ اندھا ہو جائے گا اور اُس کی جگہ دوزخ میں ہوگی''۔

یہ عبارت ہر اُس زائر کے لیے توجہ طلب ہے جو اس جائے مقدس میں داخل ہوتا ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے واقع حضرت بل کی درگاہ کے بعد یہ خانقاہ دوسرا درجہ رکھتی ہے۔

شاہ ہمدان چودھویں صدی عیسوی میں بے مثال اثر و رسوخ کا مالک تھا اور اس کے ساتھ یہ بات بھی وابستہ ہے کہ اسے ہندوؤں پر ظلم و ستم ڈھانے کا اعزاز حاصل تھا(2)

یہ خانقاہ ایک ہندو مندر کی جگہ پر واقع ہے جسے مسلمانوں نے یہ زیارت گاہ تعمیر کرنے کے لیے منہدم کر دیا۔ زیارت کی بنیاد سے پانی کی ایک دھار نکلتی ہے جو ہندوؤں کے لیے ایک مقدس مقام ہے۔ ہندو اس جگہ پر سیندور ملتے ہیں اور یہاں شاذ ہی کوئی ہندو پوجا کیے بغیر یا کھانا نذر کیے بغیر چلا جائے گا۔

سال میں کئی ایسے دن بھی آتے ہیں جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے تیوہار ایک ہی دن منائے جاتے ہیں۔ اس دن اس مقام پر دونوں فرقوں کے عقیدت مند اپنے اپنے رواج کے مطابق عبادت کرتے ہیں۔ مسلمان زیارت گاہوں کے بہت ہی زیادہ پرستار ہیں۔ وہ شاہ ہمدان کی درگاہ پر حاضری دیتے ہیں اور ہندو درگاہ کے نیچے قتل و غارت کی دیوی یعنی کالی کی پوجا کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ہندو اسے کالی گھاٹ کہتے ہیں۔

میں جب بھی اس جگہ سے گزرتا ہوں تو ایک چھوٹا سا واقعہ جو یہاں پیش آیا، مجھے یاد آتا ہے۔

چند سال پہلے اس جگہ ایک مذہبی اجتماع میں تین مسلمان لڑکے وہاں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ تین سپاہی ایک ہندو عورت کو چھیڑ رہے تھے۔ لڑکوں سے یہ بدتمیزی نہیں دیکھی گئی اور انھوں نے سپاہیوں کو ایسا کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ سپاہیوں نے انھیں ڈرانے کی خاطر ان سے کہا کہ وہ بھاگ جائیں۔ چونکہ یہ لڑکے پہلوان قسم کے طلبا تھے۔ انھوں نے سپاہیوں پر وہی داؤ آزمائے تو یہ سپاہی غصے اور ہزیمت سے دم دبا کر بھاگ گئے۔

اگلے دن میں نے ان لڑکوں سے پوچھا وہ مجھے یہ بتائیں کہ کالی دیوی نے کس کا ساتھ دیا؟ کچھ لڑکوں نے کہا کہ دیوی نے سپاہیوں کا ساتھ دیا ہوگا کیونکہ وہ خون ریزی کی دیوی ہے لہٰذا اس نے حملہ آوروں ہی کی حمایت کی ہوگی جبکہ دوسرے یہ رائے رکھتے تھے کہ دیوی نے لڑکوں ہی کی حمایت کی ہوگی۔ پھر سلیمان لڑکے نے کہا چونکہ کالی کی پوجا خون سے کی جاتی ہے لہٰذا وہ لڑکوں ہی کی پشت پر رہی ہوگی کیونکہ اس جھگڑے میں لڑکوں نے ہی سپاہیوں کا خون بہایا۔ سبھی نے اسی

بات کو صحیح مان لیا۔

آگے بڑھ کر دریا کے کنارے قابل دید پتھر مسجد ہے۔ یہ مسجد مغل شہنشاہ جہانگیر کی خوبصورت ملکہ نور جہاں نے تعمیر کروائی تھی مگر اسے کبھی عبادت کے لیے استعمال میں نہیں لایا گیا کیونکہ اسے ایک عورت نے بنوایا تھا(3)۔ اب اسے اناج کے گودام میں تبدیل کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں وہی پتھر استعمال کیے گئے جن سے شراہیار میں مہارانیہ کے محل سے تخت سلیمان تک دو میل کا سنگ بستہ راستہ بنایا گیا تھا(4)۔

اب ہم چوتھے پل پر پہنچ گئے جسے زین العابدین کے نام کی مناسبت سے زینہ کدل کہتے ہیں۔ اس پل کے آگے دریا کے دائیں کنارے پر پانچ گنبد والا مہاشری کا مندر ہے جسے بادشاہ پرورسین نے تعمیر کروایا تھا جس نے سری نگر کا شہر دوسری بار آباد کیا۔ اسے اب ایک قبرستان میں تبدیل کیا گیا ہے۔ اس مندر کے اندر سکندر کی بیوی دفن ہے اور زین العابدین بھی اسی جگہ مدفون ہے۔ لہٰذا اس ساری بستی کو بڈ شاہ کہا جاتا ہے(5) جو زین العابدین کا لقب تھا۔

اب ہم شہر کے وسط میں پہنچے ہیں جہاں آپ کو دولت مند بیوپاریوں کے مکان نظر آئیں گے اور جہاں آپ دم زدن میں اپنا روپیہ پیسہ شال، قالین، اخروٹ کی لکڑی کا عمدہ فرنیچر، چاندی اور تانبے کے برتن، پیپر ماشی اور مختلف نقش و نگار والی چیزیں خریدنے میں صرف کریں گے۔ شال بافی یہاں بہت بڑی صنعت تھی لیکن شال بافت عملی طور پر غلامی کی زندگی گزارتے تھے۔ انھیں کبھی کشمیر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی گئی اور ان کے ساتھ ہمیشہ شرمناک سلوک روا رکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ ہر شال بُننے کے بعد کم از کم ایک یا اس سے زیادہ شال بنانے والوں کی بینائی زائل ہو جاتی تھی۔ کیونکہ اس کام میں خون جگر بہانے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کی روشنی بھی چلی جاتی تھی۔ اس تناظر میں یہ ایک رحم دلانہ عمل ثابت ہوا کہ 1870 میں فرانس اور جرمنی کی جنگ کے بعد یہ صنعت بھی ختم ہوگئی۔ شالوں کی بیشتر تعداد فرانس کو برآمد کی جاتی تھی۔ جب جرمنی نے فرانس سے تاوان کی ایک بھاری رقم وصول کرنے کا تقاضا کیا تو فرانس کے پاس اتنا نقد روپیہ نہیں تھا کہ وہ پھر سے کشمیری شال خرید سکے۔

ہماری ناؤ اب دھیرے دھیرے چلتے ہوئے عالی کدل کے پانچویں پل تک پہنچ چکی

ہے۔ یہاں دریا کا بہاؤ زیادہ تیز ہے لہٰذا جب ناؤ پل کے نیچے سے گزرتی ہے تو اسے زوردار لہروں سے ٹکرا کر ہچکولے کھانے پڑتے ہیں۔ یہیں پر کشتی بان اپنے فن کا مظاہرہ کر کے سامنے سے آنے والی تیز لہروں اور پانی کی طوفانی دھار کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

عالی کدل زین العابدین کے بیٹے عالی خان کے نام سے منسوب ہے۔ اس سے ایک میل کے چوتھے حصے کی دوری پر چھٹا پل نوا کدل ہے جسے 1666 میں نورالدین خان کے نام سے وابستہ کیا گیا۔

ساتویں پل یعنی صفا کدل تک پہنچنے سے پہلے دائیں کنارے پر ہندوؤں کے بندر دیوتا ہنومان کے نام سے ایک شاندار مندر ہے جو در خاندان کی ملکیت ہے۔ یہ مندر سامنے کے نیلے پہاڑوں کے پیش منظر میں اُس وقت نہایت دلکش دکھائی دیتا ہے جب اس کی سفید دیواریں اور طلائی چمک والا کلس سورج کی روشنی میں نہلایا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی پشت پر در خاندان کے بنگلے اور باغات ہیں جو زمین کے کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جب رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کر کے اسے زیرِ قبضہ لایا تو اُس وقت اسی خاندان کا سربراہ سکھوں کا مشیرِ اعلیٰ بن گیا تھا۔

صفا کدل کا نام سیف اللہ خان سے منسوب ہے۔ اس کے بنانے والے اور تعمیر کی تاریخ قریبی مسجد کے دروازے پر کندہ ہیں۔ یہ ایک اہم پل ہے کیونکہ اس کے بعد جو پل موجود ہے وہ اس سے بیس میل کی دوری پر واقع ہے۔ صفا کدل کے پار ہی سری نگر سے مسافر اور تاجر وسط ایشیا کے طویل سفر پر روانہ ہوتے تھے۔

اس پل کے قریب ہی یارقندی سرائے ہے جو وسط ایشیا کے مسافروں کی آرام گاہ ہے۔ جن میں لمبے، لحاف نما اور رنگین کپڑوں میں ملبوس یارقند، تبت اور ترکستان کے لوگ شامل ہیں۔ یہ لوگ یہاں اپنے ٹٹوؤں اور سُر اگایوں پر بوجھ لاد کر کشمیر آتے ہیں جس میں قالین، چمڑے اور چینی کے پیالے ہوتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ چین کے نرم و نازک پیالے کس طرح اس طویل اور مشکل سفر میں بھی محفوظ رہتے ہیں؟

دریا کے مقابل یارقندی سرائے کے ساتھ ایک خوبصورت میدان ہے جسے عید گاہ کہتے ہیں۔ یہاں وسط ایشیائی مسافر اپنی سُر اگایوں اور ٹٹوؤں کو چرنے کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ذرا

آگے اور دریا سے قدرے دوری پر ایک بہت بڑی دیدہ زیب مسجد ہے جس میں دو ہزار مسلمان بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس مسجد کے بارے میں افواہ ہے کہ یہ بھوتوں کا مسکن ہے۔لہٰذا مغرب کے بعد کوئی اس کے اندر نہیں جاتا۔

چند سال پہلے ایک لداخی مسلمان یہاں آیا اور اس نے بھوتوں سے متعلق اس کہانی کو محض ایک مفروضہ قرار دیا۔ مقامی لوگوں نے اس سے کہا کہ اگر وہ نصف شب کو اس میں داخل ہو کر اس کے اندر زمین میں ایک میخ گاڑ دے تو اسے ایک سونقرئی اشرفیاں دی جائیں گی۔ وہ اس شرط کو بخوشی مان گیا۔ رات کو وہ ایک میخ اور پتھر لے کر مسجد میں داخل ہوا۔ وہ دیودار کے قد آور ستونوں کے درمیان چلتا ہوا ایک جگہ پہنچا اور میخ کو مضبوطی سے زمین میں گاڑ دیا۔ جب وہ یہ کام کر کے باہر جانے کے لیے اٹھنے لگا تو یہ دیکھ کر اس کے پاؤں تلے زمین نکل گئی کہ اسے کسی چیز نے باندھ کے رکھا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اس گرفت سے آزاد کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر وہ اس سے نہیں نکل سکا۔ اب اس نے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں مدد کے لیے چلانا شروع کیا لیکن اس وقت بھلا کون اس کی آواز سنتا؟ وہ بھی جبکہ وہاں کے باشندے مسجد سے کافی فاصلے پر رہتے تھے۔ علی الصباح جب ایک شخص مسجد میں داخل ہوا تو اس نے ایک آدمی کو بے حس و ہوش فرش پر پڑا ہوا دیکھا۔ وہ خود حواس باختہ ہو کر باہر کی طرف دوڑا اور چند افراد کو ساتھ لے کر واپس مسجد میں آ گیا۔ جب انھوں نے لاش کو اٹھانے کی کوشش کی تو انھوں نے دیکھا کہ زمین میں میخ گاڑتے وقت لداخی کے لباس کا ایک حصہ بھی زمین میں دھنس گیا تھا۔ لہٰذا وہ اسے بھوت کی کارستانی سمجھ کر اور ہیبت زدہ ہو کر وہیں پر ڈھیر ہو گیا اور وہ ایک سونقرئی اشرفیاں وہیں پر رہیں جہاں وہ تھیں۔

دریا میں کشتیوں میں بود و باش کرنے والے ہانجیوں کی شادی کی تقریبات نہایت دلچسپ اور قابل دید ہوتی ہیں۔ شادی والے ایک بہت بڑا ڈونگا کرایہ پر لیتے ہیں جسے کم از کم بیس مانجھی چلاتے ہیں۔ وہ اپنے چپوؤں سے اسے دریا کے دونوں طرف گویا اس طرح آگے پیچھے دھکیلتے ہیں کہ ان کے چپوؤں کے زور سے پانی کی لہریں اچھل اچھل کر اوپر اٹھتی ہیں۔

اس ڈونگے کے آگے ایک چھوٹی کشتی چلتی ہے جس میں ڈھولکیے ڈھول بجا بجا کر آس پس کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان ڈھولکیوں کی سانس پھولی ہوئی ہے اور

وہ زور زور سے ڈھول بجا کر ہر تماشہ بین کی نظریں اپنی طرف مرکوز کرواتے ہیں۔

ڈونگے میں کم از کم ایک ناچنے والی یا اس سے زیادہ رقاصائیں ناچ گانے کے لیے بلائی جاتی ہیں اور کبھی کبھی مرد بھی عورتوں کا لباس پہن کر اس ناچ گانے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دولہے کو ناؤ کے وسط میں ایک تکیے پر بٹھایا جاتا ہے اور اس کا چہرہ کسی قیمتی کپڑے سے ڈھانپا جاتا ہے۔ اس کے سر سے دائیں بائیں مور پنکھ کی لڑیاں لٹکتی نظر آتی ہیں۔ ناؤ کے بیچوں بیچ موسیقار بیٹھتے ہیں جو اس محفل میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس محفل میں دلہن کو لانے کی اجازت نہیں ہے۔

فٹ نوٹ:

(1) فتح کدل دریائے جہلم پر تعمیر کردہ سات پلوں میں سے سب سے پرانا پل ہے۔ اسے فتح خان نے بنوایا جو 1486 میں تخت نشین ہوا۔ کئی مورخوں نے اس کی تعمیر برطانوی دور سے وابستہ کی ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ انگریزوں کا انیسویں صدی عیسوی سے پہلے کشمیر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔

(2) بسکو کی اس تصنیف کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر مسلمانوں کے بارے میں تعصب میں مبتلا ہو کر اُن کے لیے کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ حضرت شاہ ہمدان نے کشمیر میں اُس وقت اسلام پھیلایا جب یہاں ہندو دور میں ہندو کئی ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں خاص کر شودر یعنی اچھوت طبقہ اونچے طبقہ یعنی برہمنوں کے ہاتھوں قسم قسم کی تکالیف اور مصیبتوں میں مبتلا تھا۔ اس پس منظر میں شاہ ہمدان نے بغیر کسی زور زبردستی کے دبے ہوئے اور ستائے ہوئے کشمیری ہندوؤں کو اسلام کی طرف راغب کر لیا اور اس انسان نواز مذہب کو انھوں نے خوشی خوشی قبول کیا۔ لہٰذا بسکو کا یہ کہنا کہ شاہ ہمدان ہندوؤں کے لیے ظالم تھا، ہرزہ سرائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

(3) اس مسجد میں نماز نہ پڑھنے کا فیصلہ اس لیے نہیں کیا گیا کہ اسے ایک عورت نے بنوایا تھا بلکہ ایک معتبر روایت کے مطابق یہ مسجد اس لیے نماز کے لیے استعمال نہیں کی گئی کہ جب

نور جہاں سے پوچھا گیا کہ اس کی تعمیر پر کتنا خرچہ ہوا ہے تو اُس نے اپنی جوتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جتنا میری اس جوتی پر ہوا ہے۔ مسلمان ملاؤں نے اس بات کو مذہب کی توہین سمجھ کر اس مسجد میں نماز پڑھنے سے لوگوں کو روکا۔

(4) جی نہیں۔ پتھر مسجد میں تاریخی شواہد کے مطابق وہ پتھر استعمال کیے گئے جو پائین شہر میں آستانہ مخدوم صاحب کے باہر بہاؤالدین صاحب کے قبرستان سے اٹھائے گئے جہاں پہلے ایک مندر واقع تھا۔

(5) مقامی طور پر بڈشاہ نہیں بلکہ بڈشاہ کا مقبرہ کہا جاتا ہے۔

نواں باب

گزرگاہیں اور بازار

اب ہم کشتی کو شہر کے آخری موڑ پر چھوڑ کے پیدل ہی شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں گھوم کر یہاں کے لوگوں کی زندگی کا ایک جائزہ لیں گے۔ سری نگر میں مرکزی شاہراہ کو چھوڑ کر ساری کی ساری سڑکیں اور گلیاں تنگ و تاریک اور غلاظت سے بھری پڑی ہیں۔ چونکہ یہاں کوئی فٹ پاتھ نہیں ہے لہٰذا راہ گیر، حیوانات، بوجھ اٹھائے آدمی، مویشی، جانور اور آوارہ کتے سبھی ایک جمگھٹے کی شکل میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس صورت حال میں ہماری رفتار دھیمی پڑ سکتی ہے لیکن اس کا مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اطمینان سے اور زیادہ وقت گزار کر ہر دیکھی ہوئی شے کو اچھی طرح ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ جاڑوں میں ان گزرگاہوں پر چلنا اور بھی کٹھن ہے کیونکہ اُس وقت یہ کیچڑ اور گندگی سے بھری پڑی ہوتی ہیں۔ اُس وقت یہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہے کہ کسی راہ گیر کے ساتھ ٹکرا نہ جائے۔ ان کے لباس کے اندر کانگڑیاں چھپی ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کندھوں پر ایک کمبل ڈالے پھرتا ہے جو کسی بھی لمحے کھسک کر نیچے آ سکتی ہے۔ وہ یہ کمبل پھر سے اپنے کندھوں پر ڈالتا ہے اور اُسی وقت یہ خطرہ ہے کہ اس کا ایک تھپیڑا دوسرے کے گال پر بھی پڑ سکتا ہے۔

اس مصروفیت کے دوران کئی غیر متوقع واقعات کا بھی سامنا ہوتا ہے۔مثال کے طور پر یہاں کے باشندے اپنے مکانات کی اوپری منزل سے موری کا گندہ پانی اور دوسری فضولیات سڑک پر پھینکنے کے عادی ہیں۔اُس وقت ایک مزاحیہ نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے جب یہ کوڑا کرکٹ کسی بھی راہ گیر کے سر پر پڑتا ہے۔میونسپلٹی نے بدیراس صدیوں پرانی عادت کو روکنے کے لیے ایک قانون بھی منظور کیا ہے مگر مشرق میں عادتیں بہت دیر کے بعد ترک کی جاتی ہیں۔پچھلی بار جب یہ عادت میرے لیے دلچسپی سے زیادہ ناراضگی کا باعث بن گئی تو میں نے مالک مکان کو یہ قانون سمجھانے کے لیے بلوایا مگر میرے راستے میں ہر طرح کی مداخلت کی گئی۔اس شخص کے پڑوسیوں نے اس قانون شکن کی ہر طرح سے حمایت کی۔ پہلے انھوں نے کہا کہ انھیں مالک مکان کا نام معلوم نہیں۔پھر کہا کہ وہ چند ہفتے پہلے مر چکا ہے۔کئی دوسروں نے کہا کہ وہ یہاں نہیں ہے اور یہ کہ اس مکان میں صرف خواتین رہتی ہیں۔بہر حال میرا ایک دوست جو ایک سرکاری اہل کار تھا وہاں سے گزر رہا تھا۔پھر اسی کی مدد سے دیکھا گیا کہ مکان کا مالک تو زندہ ہے اور یہ بھی کہ وہ کوئی عورت نہیں بلکہ ایک مرد ہے اور وہ گھر میں موجود تھا۔اسے جب بلایا گیا تو ہم نے دیکھا کہ وہ ایک بڑا آدمی ہے جس کی داڑھی سرخ ہے۔مسلمان اپنے پیغمبر کی طرح (1) داڑھی کو لال رنگ سے رنگتے ہیں۔وہ ایک ڈیڑھ سالہ بچے کو ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ساتھ لایا اور کہنے لگا۔ ''صاحب کو ناراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ کوڑا کرکٹ کسی بالغ نے نہیں بلکہ اس بچے نے باہر پھینکا تھا''۔میں نے اسے جواباً کہ کیا میں کوئی معجزہ دیکھ رہا ہوں کیونکہ جس شخص کو میں نے یہ کچرا باہر پھینکتے دیکھا اُس کی داڑھی سرخ تھی اور وہ ہو بہو اسی لال رنگ کی تھی جس رنگ کی داڑھی والا بچے کو سنبھالے میرے سامنے کھڑا تھا۔میری یہ بات سن کر سارا مجمع ہنس پڑا اور داڑھی والا آسمان کی طرف دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگنے لگا اور التجا کی کہ اس معاملے کی رپورٹ میونسپل افسروں کے سامنے نہ لائی جائے۔اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ آئندہ وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔

یہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ یہاں اکثر مکانوں میں باورچی خانے سب سے اوپر کی منزل میں ہوتے ہیں اور وہاں موریوں یا گندے پانی کے نکاس کے لیے نالیوں کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ جب کسی کو سائیکل پر شہر کے اندر چلنا ہو تو اسے حد سے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے کیونکہ

یہاں کے شہریوں کو جلدی غصہ آ جاتا ہے۔ وہ اکثر سائیکل سوار کے سامنے ایک مضحکہ خیز انداز میں ناچنے کا ڈراما کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ انھیں کس سمت میں جانا چاہیے۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد سائیکل سوار اتنا تو سیکھ سکتا ہے کہ اسے ایسی صورت حال میں کس طرح سائیکل چلانا چاہیے۔ میں نے اس بارے میں یہ کچھ سیکھا ہے:

اگر سڑک پر کوئی بچہ نظر آئے تو پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا اس کے ساتھ کوئی محافظ ہے یا نہیں؟ اگر ایک چھوٹی بہن ننھے بچے کے ساتھ ہو تو میں سائیکل کو بریک نہیں لگاتا کیونکہ یہ بچی ہر حال میں بچے کی حفاظت کرے گی۔ وہ اسے یا تو ایک طرف لے جائے گی یا وہیں پر کھڑی رہے گی جہاں وہ ہے اور اس دوران وہ بچے کو اپنی بانہوں میں زور سے پکڑ کے رکھے گی۔ لیکن اگر ایک لڑکا محافظ ہے تو مجھے سائیکل کو روکنا ہوگا کیونکہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ لڑکا اپنی حفاظت کرے گا یا بچے کو کسی حادثے سے بچائے گا۔ اگر کوئی ماں یا عورت اپنے بچے کو ہمراہ لیے چل رہی ہو تو بھی مجھے سائیکل کو روکنا پڑے گا۔ کیونکہ عورت پہلے خود دوڑ کر سڑک کے کنارے چلی جائے گی اور پھر بچے کو پاس آنے کے لیے زور زور سے چلائے گی۔ اس وقت سائیکل سوار کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوگا کہ وہ کیا کرے؟ لہٰذا اس کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ وہ رفتار دھیمی کرے۔ اگر بچہ کسی مرد کی تحویل میں ہو تو تب بھی سائیکل کو روکنا ہی مناسب ہوگا کیونکہ یہ مرد اپنے لیے محفوظ جگہ کی طرف بھاگ جائے گا، وہ غصے سے ہانپتا بھی نظر آئے گا اور سائیکل کے آگے بیہودہ انداز میں ناچنے لگے گا۔ اگر دو مرد سڑک پر چل رہے ہوں تو سائیکل کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ حیران کن طریقے کا مظاہرہ کریں گے یعنی دائیں چلتا ہوا شخص بائیں طرف اور بائیں طرف کا مرد دائیں جانب دوڑے گا۔ جب یہ سارا تماشہ ختم ہوگا تو وہ تماشہ بینوں کے ساتھ مل کر اور ایک جگہ جمع ہو کر زور زور سے ہنسنے لگیں گے۔

سری نگر شہر میں کئی سال تک سائیکل چلانے کا یہ میرا تجربہ ہے، جس نے مجھے اپنے آپ کو بھی بچانا سکھایا ہے اور جس کی بدولت شہر کے باشندوں کو بھی میرے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔

البتہ کبھی کبھی ایسے واقعات سے تکلیف بھی پہنچتی ہے۔ ایک پھسلن والے دن دریا کے

کنارے ایک تنگ سڑک پر جہاں ایک عمر رسیدہ عورت اپنی مچھلیوں کے ٹوکرے میں مچھلیاں بیچ رہی تھی، میرا سائیکل پھسلا اور میں نے دیکھا کہ میں آنکھ جھپکتے ہی ٹوکرے کے اوپر گر پڑا ہوں۔ میں اس ٹوکرے میں آرام سے دبک گیا تھا اور میری ٹانگیں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جب تک کہ مجھے کسی مہربان کے ہاتھوں نے نہیں بچایا۔ مچھلی فروش عورت ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور وہ میری کسی بھی طرح مدد کرنا بھول گئی تھی۔ یہ عورت اسی جگہ سیڑھیوں پر بیٹھی ہوتی ہے اور جب بھی ہمارا سامنا ہو جاتا ہے تو ہم ایک دوسرے کو اپنی کھسیانی ہنسی سے گویا چڑاتے ہیں۔

ان سڑکوں پر اور بازاروں میں حیوانات اور پرندے انسانوں کے ساتھ عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ میں نے ایک نانوائی کو سر پر روٹیوں کا ٹوکرا اٹھا کر شان بے نیازی سے چلتے دیکھا کہ دم زدن میں ٹوکرا دھم سے زمین پر آ گرا اور گول گول روٹیاں کیچڑ بھری سڑک پر رقص کرنے لگیں۔ نانوائی نہایت غصے کی حالت میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ یہ کیا ہوا؟ یہ حرکت دراصل ایک چیل کی تھی جس نے اس کے ٹوکرے سے روٹی جھپٹ کر چھین لی تھی اور وہ اب اسے نوچ نوچ کر فضا میں اُڑ رہی تھی۔ جب اس چیل نے یہ کامیاب کرتب دکھایا تو میں اُس وقت نانوائی کے پیچھے سائیکل پر چل رہا تھا۔

دوسری بار میں خود اس ناگہانی چالبازی کا شکار ہوا۔ میں ایک بار ایک پہاڑی راستے پر دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک سینڈوچ تھا۔ میں اسے منہ میں ڈالنے والا ہی تھا کہ میرے دائیں گال پر ایک زوردار ضرب پڑی اور سینڈوچ میرے ہاتھ سے گیا۔ میں نے ارد گرد نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ ایک چیل اسے کھاتے ہوئے اوپر منڈلا رہی ہے۔ چیلوں نے مجھے بار بار اپنی چالاکی اور بے خطا نشانہ بازی سے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔

ان بازاروں میں برہمنوں کا مقدس بیل ایک الگ ہی نظارہ پیش کرتا ہے۔ بازار کے راستے پر چلتے وقت وہ اپنے سیاہ اور نرم کوہان کو ادھر اُدھر ہلاتا ہے۔ لگتا ہے کہ اسے بازار میں دستیاب ساری سبزیوں پر ملکیتی حق حاصل ہے اسی لیے وہ ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اپنی پسندیدہ سبزی کو سونگھ سونگھ کر چٹ کر جاتا ہے۔ اس کے راستے سے ہر شخص بھی پرے ہٹ جاتا ہے۔ اسے احساس ہے کہ اس کے لیے ہر ایک کے دل میں احترام ہے جس کا اشارہ اس کی

گستاخانہ آنکھوں سے ملتا ہے۔ کشمیر میں گائیں مقدس مانی جاتی ہیں۔ پہلے اگر کوئی گائے کو ذبح کرتا تو اسے موت کی سزا ہوتی۔

یہ حرکت کرنے والے کو پہلے اُبلتے ہوئے تیل میں ڈالا جاتا اور پھر اسے ایک کھمبے سے لٹکتے ہوئے بڑے کانٹے سے لٹکایا جاتا۔ ایک کرنل نے مجھے بتایا کہ جب وہ کشمیر میں تعینات تھا تو اسے یاد ہے کہ فتح کدل پل پر ایک کھمبا ٹانگا جاتا جس پر تیل میں اُبلی ہوئی لاش پرندوں کے کھانے کے لیے لٹکی ہوتی۔ اس مظلوم کو ایک گائے ذبح کرنے کی پاداش میں یہ سزا دی جاتی۔ چند سال پہلے تک گائے کو مارنے کی سزا عمر قید ہوا کرتی تھی جو اب سات سال تک محدود کر دی گئی ہے۔

ان بازاروں سے گزرتے وقت اگر انسان اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو وہ دیکھے گا کہ ہندو ایک گائے کی کس طرح عزت کرتے ہیں۔ یہ گائیں اگرچہ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ہوتی ہیں پھر بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہندو اپنے اوڑھنے کے شال سے گائے کو چھو کر اس کے اُس حصہ کو بوسہ دے گا جہاں اسے گائے نے چھوا ہوتا کہ گائے کا تقدس اس میں بھی سما جائے۔ اس گاؤ پرستی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب سرما کا موسم آتا ہے تو یہی گائیں فاقہ زدہ ہو کر مرنے کے قریب پہنچ جاتی ہیں۔ ان میں سے جو دودھ نہیں دیتیں یا بیمار ہیں انھیں برف پوش سڑکوں کی طرف دھکیلا جاتا ہے جہاں وہ برف کے نیچے کھانے کی کوئی شے حاصل کرنے کے لیے آوارہ کتوں سے نپٹتی ہیں۔ آخر کار جب وہ تھک جاتی ہیں تو بے سدھ ہو کر زمین پر گر جاتی ہیں اور پھر پرندے ان کی آنکھیں نکال لیتے ہیں اور کتے ان لاشوں کی ہڈیاں تک نوچ لیتے ہیں۔ یہ دل خراش واقعہ اگر کسی ہندو کے گھر کے باہر بھی پیش آئے تو بھی میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ وہی گائے پرست اسے بچانے کی ذرہ بھر بھی کوشش کرتا ہو۔ ہندؤوں کا یہ طریق عمل کسی مغربی شخص کے لیے نہایت تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس حالت کو برسوں پہلے ذہن سے اتار دیا اور اپنے مدرسے کے طلبا کے ساتھ ایک ایسا حل نکالا جو اکثر ہندو تھے۔

سری نگر کے غالب باشندوں میں سب سے زیادہ کتوں کی نسل ہے۔ جنھوں نے وقتاً فوقتاً اچھے کام سرانجام دیے ہیں اور یہ مخلوق تب تک مفید کام کرتی رہے گی جب تک کہ شہر میں صفائی اور

غلاظت صاف کرنے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو۔

جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ سری نگر میں صرف ایک فیصد لوگوں کے پاس فضلہ صاف کرنے کا کوئی بندوبست ہے۔ یہ لوگ اپنے اجداد کی طرح رفع حاجت کے لیے اپنے بزرگوں کی طرح کھلی جگہوں کا استعمال کرتے ہیں اور اس غلاظت کو یہی آوارہ کتے صاف کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے ان کی ضرورت باقی رہے گی۔ میونسپلٹی نے ایک حکم نامہ صادر کیا ہے کہ کوئی نیا مکان غلاظت کے اخراج کے معقول انتظام کے بغیر تعمیر کرنے کی اجازت نہیں ہوگی لیکن اس قانون کی عوام نے زبردست مخالفت کی۔

کثافت کے خوگر ان شہریوں سے اگر کوئی ان عادتوں کے بارے میں پوچھتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ ان سے عوام کی صحت عامہ کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے ہیں کہ انہی عادات کو لے کر ان کے آباواجداد خوشی خوشی جیتے رہے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے پرانے رواج اور حالات کو کیوں بدلیں؟ ان کے بقول آوارہ کتوں نے ہمیشہ اپنا کام اچھی طرح کیا ہے پھر ان کی خوراک کیوں چھینی جائے؟

ان بدبخت کتوں کی زندگی بھی ایک ذلیل زندگی ہے۔ چونکہ وہ کسی کی ملکیت نہیں ہیں لہٰذا انھیں پتھروں اور لاتوں سے نوازا جاتا ہے اور جب کبھی وہ خوراک کی تلاش میں دکانوں یا مکانوں کے قریب آجاتے ہیں تو ان پر ابلتا ہوا پانی ڈالا جاتا ہے۔ یہ کتے اکثر و بیشتر بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں اور جاڑوں میں تو ان کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ اگر ان کی صحیح طریقے سے نگہداشت کی جائے اور انھیں اچھا کھانا نصیب ہو تو وہ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں گے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ وہ کسی کے کھاتے میں شمار نہیں لہٰذا وہ آوارہ کہلاتے ہیں۔ گرمیوں میں وہ اکثر پاگل ہو جاتے ہیں اور موسم سرما کے دنوں میں وہ وحشی بن کر عورتوں اور بچوں کو کاٹتے ہیں۔ کوئی شخص شہر میں سے سائیکل پر سوار ہو کر نکل جائے تو وہ اس پر بھی حملہ کرتے ہیں لیکن اگر وہ زیادہ تعداد میں نہ ہوں تو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔

ان کتوں کے اپنے مخصوص غول ہوتے ہیں جن میں وہ مل جل کر رہتے ہیں۔ یہ ہر اس کتے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو انھیں اکیلا دکھائی دے۔

جب بھی کتوں نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو میں نے اپنے آپ کو ان سے بچانے کے لیے ان کی رہائشی جگہوں کا فائدہ اٹھایا ہے۔ میں نے انھیں دوسری جگہ تک آنے کی ترغیب دی۔ جب یہ وہاں تک آ گئے تو ان کی توجہ دوسری جگہ کے کتوں کی طرف پھر گئی اور اس طرح سے دونوں غول ایک دوسرے سے لڑتے رہے، وہ مجھے اور میری سائیکل کو بھول گئے اور میں بھاگ کر بچ نکلا۔

یہاں میں یہ بتاؤں کہ ہر شخص کو اپنے کتے کے بارے میں بھی خبر دار رہنا چاہیے کیونکہ ایک لومڑی نما پالتو کتا دو یا زیادہ آوارہ کتوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کئی انگریزی کتوں کی ان بے راہ رد کتوں نے تکا بوٹی کی ہے۔

مجھے امید ہے کہ زیادہ وقت گزرنے سے پہلے ہی سری نگر کے شہری اپنی عزت کرنا سیکھیں گے تا کہ انھیں ہزاروں کتوں کی اس لیے ضرورت نہیں پڑے گی کہ وہ ان کے شہر کو صاف ستھرا رکھیں گے۔

فٹ نوٹ:

(1) پیغمبر آخر زماں ﷺ پر کبھی بڑھاپا نہیں آیا۔ اللہ تعالی نے انھیں اس سے مبرا رکھا۔ صرف اُن کے سر کے تیرہ بال سفید ہوئے تھے البتہ موئے مبارک کا رنگ کالا تھا۔ اس حوالے سے یہ کہنا کہ وہ اپنی داڑھی کو لال رنگ سے رنگتے تھے صریحا غلط ہے۔

دسواں باب

تاجر، کوڑھی اور گداگر

مشرق کے شہروں کی طرح سری نگر کے دکانداروں کی بھی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی دکانوں کو سڑک تک پھیلاتے ہیں۔ شام کے وقت جب کوئی راہ گیر وہاں سے چلتا ہے تو اسے خطرہ لاحق رہتا ہے کہ وہ اس چھوٹی سی سیڑھی سے ٹکرا نہ جائے جو مالک دکان نے فٹ پاتھ سے اپنی دکان کے اندر تک کھڑی کی ہے۔

جب کوئی شخص ایک مصروف سڑک پر سائیکل سوار ہو کر یا کسی گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں سے چلتا ہے تو وہ لازماً دکانوں کے آگے رکھی ہوئی برتنوں کی ٹوکریوں کے ساتھ ٹھوکر کھائے گا۔

کہرے میں لپٹی ہوئی ایک صبح کو جب میں اپنے ٹٹو پر ایک تنگ سڑک پار کر رہا تھا تو سیرے ٹٹو کا پاؤں پھسل گیا اور میں دکاندار کی دکان کے اندر ڈھیر ہو گیا۔ اور ٹٹو اس کی دکان کے باہر گر پڑا۔ یہ نظارہ دیکھ کر دکاندار اور آس پاس کے سبھی لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تاہم مجھے اور میری سواری کو کوئی زک نہیں پہنچی۔

جب کوئی راہ گیر کسی دکان کے سامنے سامان خریدنے کے لیے ٹھہر جاتا ہے تو اس قسم کا لین دین عام طور پر دکان کے اندر ہوتا ہے اور باہر نہیں کیا جاتا ہے۔ دریں اثنا لوگوں کا ایک ہجوم

اس سودا بازی میں اپنا حصہ لینے کی خاطر جمع ہو جاتا ہے۔ان میں سے کوئی ایک شخص دکاندار سے اونچی آواز میں کہے گا۔''دیکھو! کوئی بے ایمانی نہیں کرتا!''۔لیکن وہ اسی لمحے دکان دار کو اپنی آنکھوں یا انگلیوں کی زبان سے کچھ اور ہی مشورہ دے گا جس کے معنی یوں ہوئے کہ اس کی جیبیں اچھی طرح سے ہلکی کر لینا۔

آنکھوں سے بات کرنے کا یہ طریقہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں جب مشرقی لندن میں وایٹ چپل میں کام کرتا تھا تو میرا ان اچکوں سے واسطہ پڑا تھا۔اب کے جو میں نے اپنے آپ کو ان مددگاروں کے بیچ پایا تو مجھے اپنے پرانے دوست یاد آ گئے۔

ان دکانوں میں اکثر کے مالک ہندو ہیں۔جن میں بقال، بزاز، خیاط اور نسوار اور دوا فروش تھے۔ان دکانوں میں پیتل کے برتن، پیالے اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے مجسمے بھی دستیاب تھے۔جن دکانوں میں پیتل، تانبے، لوہے یا لکڑی کی اشیا مہیا تھیں وہ ساری ہندوؤں کی تھیں البتہ قصائیوں کی دکانیں مسلمان ہی چلاتے تھے۔

ان بازاروں میں بہت کم کھانے پینے یا شراب کی دکانیں دکھائی دیتی ہیں۔اگر چہ شراب کی دکانوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔شرابی لوگ زیادہ تر مست ہونے کے لیے پیتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ منظر دیکھنا ہو تو شام کو کسی گندے شراب خانے کا میلا کچیلا پردہ اٹھائیے تو وہاں آپ کو دو تین شرابی بینچوں یا فرش پر لڑھکے ہوئے نظر آئیں گے۔

مجھے وہ وقت یاد ہے جب کوئی بھی شراب کی بوتل بغل میں لیے چلنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ عوام اس نشے کے خلاف تھے۔اس کے باوجود نشے کے عادی اپنی چادروں میں شراب کی بوتل چھپا کر لے جاتے ہیں۔سری نگر میں شاذ ہی کسی شخص کو نشے کی حالت میں دیکھا جاتا ہے اور اگر ایسا کوئی شخص دکھائی بھی دے بھی تو اسے حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

ایک دو سال قبل ایک ہندوستانی بابو نے مجھ سے اس بارے میں مدد طلب کی کہ میں ایک پرہیزگاری سوسائٹی قائم کرنے میں اس کا ساتھ دوں اور اس کے عوض وہ مجھے اس کا صدر بنانے کی دعوت دے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ ایسی سوسائٹی کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ملک میں پرہیزگاری نہ ہونے کے برابر ہے۔پیغمبر محمد ﷺ پر درود و سلام ہو جنھوں نے اپنے اُمتیوں پر

شراب حرام کی اور ہز ہائی نیس مہاراجہ کا بھی شکریہ کہ اس نے بھی شراب خانوں اور شراب خوری پر پابندی عائد کی۔

میں نے یہ بھی مناسب نہیں سمجھا کہ لوگوں کی بھرپور توجہ اس طرف مبذول کی جائے کیونکہ اس سے ان کی سوچ ایک غلط عملی راستے پر گامزن ہوسکتی ہے۔ لیکن میرا بابو دوست اس سے متفق نہیں ہوا۔ چند روز بعد وہ میرے پاس آکر بولا کہ اس نے سوسائٹی قائم کی ہے اور یہ کہ میں اسے چندہ دوں۔ اس کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کی میٹنگیں زور و شور سے جاری ہیں کیونکہ بابو لوگوں کو بہت باتیں کرنے میں مزہ آجاتا ہے۔

یہ سوسائٹی بننے کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد میرا یہی بابو دوست غم زدہ ہوکر مجھ سے ملا اور کہا کہ سوسائٹی کا خزانچی نہ صرف یہ کہ ساری رقم لے کر فرار ہو چکا ہے بلکہ وہ اپنے ساتھ وہ فرنیچر بھی لے گیا ہے جو اس تنظیم کی میٹنگوں کے لیے خریدا گیا تھا۔ یہ میرے لیے کوئی غیر متوقع خبر نہیں تھی۔ صرف چند دن پہلے کی ایک میٹنگ میں ایک ممبر نے کہا تھا کہ شراب خوری کے خلاف بات کرنا بیوقوفی ہے جب تک کہ وہ اس عادت کو اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں نہ پرکھیں۔ کیونکہ ہر ایک کو چاہیے کہ وہ کسی بھی موضوع پر بات کرنے سے پہلے اس کا بغائر مطالعہ کرے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شخص خود ایسے تجربے سے گزرا ہو تو وہ بہتر طریقے پر دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ پھر اس ممبر نے تجویز کیا۔ ''لہٰذا ہر رکن اگلی میٹنگ میں شراب کی ایک بوتل اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ جرمن برانڈی صرف ایک روپے میں ایک بوتل ملتی ہے۔ اور پھر ''میرے بھائیو! ہم سب ایک شاہانہ انداز میں مست و مخمور ہوجائیں گے۔ جب ہی ہم اپنے شرابی بھائیوں کا تلخ تجربہ ذہن نشین کر پائیں گے۔ مگر ہم اتنی بھی نہیں پئیں گے کہ ہر چیز کو ٹھوکر ماریں''۔

اس شورانگیز تقریر نے یہ اثر کیا کہ اگلی میٹنگ میں کوئی بھی ممبر خالی ہاتھ نہیں آیا۔ پھر جرمنی کی بنی ہوئی برانڈی پی کر وہ اپنے شرابی دوستوں کے سارے ذہنی مرحلوں سے خود بھی گزرے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ شہر میں ناپرہیزگاری زیادہ نہیں پھیلی ہے اور پرہیزگاری برابر قائم ہے۔ لہٰذا سوسائٹی کو غیر ضروری قرار دے کر اسے ختم کیا گیا۔

دراصل سری نگر میں اتنے کم شراب خانے ہیں کہ شہر کی خاموشی پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ اس وجہ سے بازار میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو۔ اہل کشمیر کو مغرب کے لوگوں پر اس سلسلے میں سبقت حاصل ہے۔

جو غریب کوڑھی اپنی متلون مزاجی کے ساتھ سڑکوں پر چلتے رہتے ہیں وہ عام طور پر دوسروں کی توجہ اپنی طرف پھیر لیتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ننگے ہی گھومتے ہیں اور اگر کبھی کوئی رحم دل انھیں اپنا کوئی کپڑا تن ڈھانپنے کے لیے پیش کرے تو وہ اسے چھیتڑوں میں بدل کر کبھی کبھی ان کو نذر آتش کر کے اپنے جسموں کو گرمی پہنچاتے ہیں۔ ایسا منظر میں نے جاڑے کے دنوں میں دیکھا ہے۔ یہ دیکھ کر اور بھی دکھ ہوتا ہے کہ کوڑھی عورتیں شیر خوار بچوں کو گود میں لیے پھرتی نظر آتی ہیں جس کی پرورش کا انھیں کوئی علم نہیں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ مرد اتنے کمینے اور خبیث ہوتے ہیں کہ وہ ان مجبور و بے کس عورتوں کو حاملہ کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کی مدد کو کوئی سامنے نہیں آتا۔ میں یہ امید رکھتا ہوں کہ ایک دن ارباب حل وعقد کو یہ احساس ہوگا کہ اس بے یار و مددگار مخلوق کے تئیں ان پر بھی کوئی فرض عائد ہوتا ہے۔

خوش قسمتی سے سری نگر میں سرکار کی طرف سے تعمیر کردہ کوڑھیوں کے لیے ایک پناہ گاہ موجود ہے جسے سی، ایم، ایس میڈیکل مشن کی تحویل میں دیا گیا ہے تاکہ ان مصیبت زدگان کی نگہداشت کی جا سکے۔ کوئی کوڑھی جب بھی کسی راہ گیر سے جا ٹکراتا ہے تو وہ اسے اپنے انگلیوں کے بغیر ہاتھ دکھا کر اس کی ہمدردی اور خیرات مانگتا ہے۔ لوگ انھیں انہی کی پناہ گاہ میں جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

مشرقی شہروں کی طرح سری نگر بھی بھکاریوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان میں سے اکثر پیشہ ور گداگر ہیں۔ چند ایک تو گھوڑوں پر سوار ہو کر بھیک مانگتے ہیں جس سے مجھے یہ انگریزی گیت یاد آجاتا ہے:

Hark! Hark! how the dogs do bark,
The beggers are coming to town,
Some in rags and some in nags
And some in velvet- gown.

یہ بھکاری ہر طرف دیکھے جاسکتے ہیں کیونکہ لوگ عام طور پر انھیں بھیک دے کر ثواب کماتے ہیں۔لیکن ان میں کئی گدا گر فریبی بھی ہوتے ہیں۔ میں ایک ایسے ہی بھکاری کو جانتا ہوں جو سالہاسال سے جسمانی طور معذور ہونے کا بہانہ کرتا رہا ہے۔وہ سڑکوں پر صرف ایک جانگی پہن کر رینگتا رہا ہے۔ بارش اور برف باری کے دنوں میں وہ چیختا چلاتا اور تھرتھراتا ہوا رو رو کر بھیک مانگتا ہے۔اس مصنوعی مرض کی بدولت وہ روزانہ اچھی خاصی رقم سمیٹ لیتا ہے۔ایک صبح میں نے اسے ایک گلی کے نکڑ سے نکلتے ہوئے دیکھا۔وہ پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا۔اُس وقت وہ اپنی بھکاری برادری کو بھول کر ایک عالم سرمستی میں مگن تھا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بھکاری خواہ شریف ہو یا کمینہ،لوگ انھیں برابر خیرات دیتے ہیں۔

چلیے اب ہم ان بھکاریوں کو بھول کر شہر کی دکانوں پر ایک نظر ڈالیں۔ یہاں ایک ایسی دکان ہے جو ہر ایک کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔یہ دکان ایک مسلمان نائی کی ہے جو ایک گنجے کے سر پر اُسترے سے پے در پے ضربیں لگا لگا کر اس کا خون بہا رہا ہے۔ پہلے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی کو برسر راہ قتل کیا جا رہا ہے۔مسلم فرقے میں یہ ایک رسم ہے کہ وہ سر کے بال منڈوا کر اسے چٹا کر دیتے ہیں۔اگر یہ کسی ہندو کا سر ہے تو وہ سارے بال کٹوا کر صرف کھوپڑی کے بیچ میں ان کی پتلی سی ایک لٹ (کشمیری: ژھوگ) بچا کے رکھتا ہے جسے ایک یا دو گانٹھوں میں باندھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے لیے یہ نشانی مقدس ہوتی ہے۔

کشمیریوں کی کھوپڑیاں اکثر و بیشتر مختلف امراض میں مبتلا ہوتی ہیں۔ان سروں پر ایک قسم کی پھپھوندی پھیل جاتی ہے جسے کشمیری میں 'کھرٗ' کہتے ہیں۔لہٰذا جب نائی استرا لے کر حجامت کرتا ہے تو وہ یہ کام خون بہائے بغیر نہیں کرسکتا۔کشمیر کے نائی اپنے استروں کو جراثیم سے پاک نہیں کرتے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ متاثرہ استرے سے بیماری ایک شخص سے دوسرے تک منتقل ہو جاتی ہے۔ نائی دانتوں کی بیماریوں کا بھی معالج ہوتا ہے۔ وہ اپنے پاس ایک لوہے کا کانٹا رکھتا ہے اور جب اسے بیمار کے دانت اور جبڑے کے بیچ ڈالا جاتا ہے تو امید کی جانی چاہیے کہ اگر کوئی شے باہر آجائے تو وہ ایک دانت ہی ہوگا۔ یہ نائی ایک ٹوٹے دانت کی مرمت کرنے یا اسے دوسرے کے ساتھ تار سے جوڑنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ میرے اسکول کے عملے میں ایک اہل کار کے اگلے دو

دانت اسی طرح جوڑے گیے تھے اور جب وہ بولنے لگتا تو مجھے اس کی بات سمجھنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

نائی شادیوں کے لیے میاں جی کا کام بھی کرتا ہے۔ وہ خاندانوں کے مابین شادیوں کا انتظام کرتا ہے۔ وہ اس لڑکی کے گھر جاتا ہے جس کی شادی کرنا مقصود ہو۔ اس کے بعد وہ لڑکے والوں کے گھر جاتا ہے جہاں وہ لڑکی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ اگر اسے لڑکے والوں کی طرف سے خاطر خواہ رقم دی جائے تو وہ لڑکی کی تعریفیں بھلا کر معاملے کو آگے بڑھائے گا۔ یہاں لڑکی کو اس کا شوہر شادی ہونے کے بعد تک نہیں دیکھتا۔ جب شادی کے بعد دلہا اپنی دلہن کو شبستان میں لے جاتا ہے تو وہ اس کا نقاب اٹھا کر یہ دیکھتا ہے کہ اسے زندگی کس کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس لمحے کئی دلہوں کو یعقوب کی طرح ایک زبردست جھٹکا لگ جاتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ جس خاتون کا یعقوب نے نقاب اٹھایا تھا وہ اُس کی محبوبہ راخیل نہیں تھی (1)۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ دلہوں نے اس وقت ناقابل برداشت اذیت اٹھائی ہے جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی بیگم ایک آنکھ سے کانی ہے یا اس کا چہرہ چیچک سے مسخ ہوا ہے۔ چیچک انسانی چہرے اور آنکھوں کو بگاڑ کے رکھتی ہے۔ سری نگر میں ہر کوئی چیچک کی بیماری میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ خاص کر جب وہ بچپن کی عمر کا ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ جتنے بچے سری نگر میں پیدا ہوتے ہیں ان میں سے نصف اسی بیماری سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ہم پھر دکانوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ان دکانوں میں سے جو نظروں کو اپنی طرف مرکوز کرتے ہیں وہ سوزن کاری کرنے والے فن کاروں کی ہیں۔ وہ یہ کام ریشم، کپاس یا اون کے کپڑوں پر کرتے ہیں اور ان میں ان کے رنگوں اور نقش و نگار کا انتخاب دلوں کو موہ لیتا ہے۔ یہ کاریگر اپنے بیٹھنے کے لیے رنگین نشستوں کا انتخاب کرتے ہیں جو سرخ، زرد اور نیلے رنگوں کی ہوتی ہیں۔ کشمیری مسلمان کاریگر کبھی سور کی کھال کے گدے پر نہیں بیٹھیں گے اور ہندوؤں کے لیے تو ہر قسم کا چمڑا ایک پھٹکار کے موافق ہوتا ہے۔ جب ایک راہگیر سڑکوں اور دکانوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا جاتا ہے تو اُس کی نظریں خود بخود مکانوں کی ان کھڑکیوں کی طرف اٹھتی ہیں جنھیں مقامی زبان میں پنجرہ کہتے ہیں۔ اکثر بازاروں میں مکانات اس طرح سڑک کی طرف باہر نکلے ہوئے ہیں کہ

چھت پر وہ زمین کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ ایسا چوروں اور آگ سے بچنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ مکانات آپس میں اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ صرف ایک کھمبا ہی انھیں ایک دوسرے سے کسی حد تک دور رکھتا ہے تاکہ یہ دوسروں پر گر نہ جائیں۔ اگر آپ اپنی نظروں کو اور اونچا اٹھائیں گے تو آپ کو کبھی نہ پگھلنے والا برف دکھائی دے گا۔ پہاڑوں کے اس نظارے نے بار بار دلوں کو سرشار کیا ہوگا۔ جب بھی کوئی شخص کیچڑ اور غلاظت سے بھری سڑکوں پر گندگی کو روندا ہوا چلتا ہے تو اسے انہی برف پوش پہاڑوں کی طرف دیکھنا چاہیے تاکہ اس کا سفر پرسکون بن سکے۔

سری نگر میں دیگر شہروں کی طرح سماج کے مخصوص طبقوں اور تاجروں کے لیے علاقے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹھٹھیرے برہمنوں کے آس پاس تانبے کے برتنوں کو مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہوئے ایک شور انگیز اور گندے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں بیحد خوبصورت اقسام کے برتن اور پرانی طرز کی تانبے کی اشیا موجود رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ٹھٹھیرے ان نقل شدہ چیزوں کو سینکڑوں سال کی پرانی چیزیں جتلا کر انھیں انتہائی مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ ان دکانوں میں ایک جگ بہت جاذب نظر ہوتا ہے۔ اس کی شکل ایک بطخ کی سی ہوتی ہے جسے کشمیری میں بطخ یا مادہ بط کہتے ہیں۔ اسے عام طور پر آگ بھڑکانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس کے اندر پانی بھر کر اسے انگاروں پر رکھا جاتا ہے اور ابلتے ہوئے پانی سے جو بخارات نکلتے ہیں وہ حسب ضرورت کسی سخت چیز کو نرم کرنے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔

ٹھٹھیروں کے علاقے کے نزدیک ایک بہت بڑی جامع مسجد ہے جسے کم از کم ایک بار ضرور دیکھنا چاہیے۔ یہ مسجد جو سری نگر میں سب سے بڑی مسلم عبادت گاہ ہے، 1404 میں سکندر بُت شکن نے بنوائی اور اس میں ایک بہت بڑے مندر کے پتھر استعمال کیے گئے جسے بادشاہ تاراپیڈا نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ مسجد تین بار نذر آتش ہوئی۔ اس کی موجودہ تعمیر شہنشاہ اورنگ زیب نے 1674 میں مکمل کروائی۔ اس جگہ کو بدھ مت کے پیروکار بھی مقدس سمجھتے ہیں اور اب بھی لداخ اور دوسرے مقامات سے آنے والے بودھ یہاں آتے ہیں۔

شہر کے اسی حصے میں آپ کو وسط ایشیا سے آئے ہوئے بہت سارے سیاح نظر آئیں گے۔ چند سیاحوں نے اس عظیم شہر کو پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے لہٰذا وہ کسی حد تک گھبرائے

ہوئے دکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے چوروں کے قصے اپنے دوستوں سے سن لیے ہیں جن کو لوٹا گیا اور یہ کہ چوروں کے برعکس لٹنے والوں کو پولیس پکڑ کے لے جاتی ہے۔ اس طرح ان کی ساری کمائی لٹ جاتی ہے جو وہ چیزوں کی خریداری کے لیے ساتھ لائے تھے۔

یہاں ایک دیہاتی کو اس کے لباس اور انداز کلام سے فوراً پہچانا جاتا ہے۔ وہ عام طور پر بازار میں پہنچنے تک اپنے جوتے سر پر اٹھائے چلتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جوتوں کو چلنے کے لیے استعمال کرنے سے وہ جلدی گھس جاتے ہیں۔ عورتیں بھی اپنے سروں پر کوئی نہ کوئی بوجھ اٹھائے ہوتی ہیں جس میں کھانا پکانے کے برتن اور دوسرا گھریلو سامان ہوتا ہے۔ اس طرح سے جب وہ اپنے آقاؤں اور مالکوں کے پیچھے چلتی ہیں تو انھیں ایک خاص انداز سے چلنے کا گر سیکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔

علی الصباح جب شیر گجری شہر میں داخل ہوتا ہے تو وہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دودھ فروش کئی میل دور گاؤں سے نپی تلی رفتار سے آتے ہیں اور ان کے کندھوں پر دودھ سے بھرے تین برتن ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ جن کے توازن کو دیکھ کر دوسرے کی کمر میں گویا درد سا ہوتا ہے۔

یہ گمان بھی کیا جاسکتا ہے کہ تین چار میل تک اس دودھ کو لیے جانے کے عمل میں یہ مکھن میں تبدیل ہوا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ ننگے پاؤں اور ہلکی رفتار سے چل کر دودھ کو جوں کا توں گاہک تک پہنچاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ شہر میں داخل ہونے پر انھیں پولیس کے سپاہیوں نے روک کر کہا کہ وہ دودھ کا ایک حصہ انھیں دیں وہ یہ جھوٹ بھی بولتے ہیں کہ انھیں ایک بہت بڑے افسر نے دودھ وصول کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ اگر اس موقعے پر کوئی خدا دوست شخص انھیں بچانے آیا تو ان کی خلاصی ہو سکتی ہے مگر عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص پولیس سے دور ہی رہنا چاہتا ہے۔ اس طرح یہ وردی پوش ڈاکو بے رحمی سے ان بے چاروں کو لوٹتے ہیں۔

ایک اور موقعے پر میں نے چار سپاہیوں کو ایک دودھ فروش پر جھپٹتے دیکھا۔ ان بیوقوفوں نے یہ غلطی کہ انھوں نے اپنے آپ کو برطانوی ریزیڈنٹ کے اہل کار جتلاتے ہوئے کہا کہ وہ ایسا ریزیڈنٹ ہی کے حکم سے کر رہے ہیں۔ بعد میں انھیں ملک کے سب سے بڑے حاکم کا نام غلط

طریقے سے استعمال کرنے پر پچھتانا پڑا۔

شہر میں چلتے چلتے کبھی کبھی کوئی دلچسپ صورتِ حال بھی درپیش آتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ اسی کی تصویر کشی کرے گا:

ایک بار دو دیہاتی شہر میں داخل ہو ہی چکے تھے کہ ایک نیلی وردی والا انھیں سادہ لوح سمجھ کر ان سے اونچی آواز میں کہنے لگا کہ وہ ایک دکان سے اُس کی ایک بہت بڑی الماری کو اٹھائیں۔ اس موقعے پر دو اشخاص نے اس وردی پوش سے کہا کہ یہ بے چارے کام سے شہر میں آئے ہیں لہٰذا انھیں جانے دیا جائے۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ دریں اثنا دیہاتی گھبرا گئے تھے کیونکہ انھیں پتہ نہیں تھا کہ الماری میں کیا کچھ ہے؟ میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا وہ وردی والے کا کام کریں گے؟ پہلے تو وہ مجھے گھور گھور کے دیکھتے رہے پھر وردی والے کو غالباً کمزور جان کر مجھ سے کہنے لگے کہ وہ یہ کام نہیں کریں گے۔ شاید انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک لہراتا ہوا چابک بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے وردی پوش سے کہا کہ وہ اپنا سامان خود اٹھالے۔ وہ مان گیا مگر الماری اتنی بھاری تھی کہ اسے اٹھاتے اٹھاتے اس کی کمر ٹیڑھی ہوگئی پھر کچھ دیر تک وردی پوش اور الماری کے درمیان ایک قسم کی ہاتھا پائی کا سماں بندھ گیا۔ مجھے اس وقت تُرکی کے وہ مزدور یاد آگئے جو قسطنطنیہ میں بھاری بوجھ تلے دبے نظر آرہے تھے۔ ان کے ساتھ میری ہمدردی واضح تھی لیکن نیلی وردی والے کے لیے میرے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔

انسانی نقطۂ نظر سے سری نگر ایک نہایت دلچسپ شہر ہے کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ آگے کیا ہوگا؟ خاص کر اگر کوئی کسی کونے کی دکان کے سامنے آجائے۔ میں نے اس شہر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی قابلِ توجہ واقعہ دیکھا ہوگا۔

فٹ نوٹ:

(1) حضرت یعقوب اور اُس کی ایک اور بیوی راخیل کا یہ واقعہ بائبل کے باب پیدائش کی آیات 35-29 میں بیان کیا گیا ہے، جس کے مطابق یعقوب کو جب راخیل نامی عورت سے عشق ہوا تو ان کی شادی کی رات کو راخیل کے باپ لیبان نے اس کی جگہ اس کی بڑی بہن لیا کو نقاب

پہنا کرا سے حجلۂ عروسی میں بھیج دیا۔ جب یعقوب نے دلہن کی نقاب الٹ دی تو اسے راخیل کی جگہ اس کی بڑی بہن دیکھ کرا چنبھا ہوا۔ لیبان نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے یعقوب سے کہا کہ وہ حفظ مراتب کی خاطر پہلے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا تھا اور یہ کہ بعد میں وہ راخیل کو بھی اپنی زوجیت میں لے سکتا ہے۔ راخیل سے شادی کے بعد اس سے یعقوب کے بیٹے یوسف اور بنجمن پیدا ہوئے۔

گیارھواں باب

لباس اور فیشن

سری نگر شہر کے لوگوں کے بارے میں اگر اچھی خاصی واقفیت حاصل کرنا مقصود ہو تو کسی سواری کے برعکس پیدل چلنے سے یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ مشرق کے باسی مغربی باشندوں کے مقابلے میں اصولی طور پر سُست رفتار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ بالمشافہ ملاقات سے ان کی عادات و اطوار کی جانکاری ہوتی ہے۔ مثلاً یہ لوگ کس طرح الگ الگ انداز میں اپنی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ اس کا تعلق ان کے پیشوں سے ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف مذاہب اور ذاتوں سے متعلق لوگوں کا بھی دستار پوشی کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک برہمن پگڑی کو اس طرح باندھے گا جیسے اس نے ماتھے پر ایک ہینڈ ایڈ لگا رکھا ہو۔ قصائی بھی پگڑی چیر کے باندھتا ہے جس کا کپڑا برہمنی دستار سے زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ کچھ فرقوں کے لوگ ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں باندھتے ہیں جن میں ہانجی اور ترکھان شامل ہیں۔ کچھ تو اپنی پگڑیوں کے کونے اپنے سر کے پیچھے کلغی کی طرح اوپر کی طرف نکالتے ہیں۔ جبکہ کئی شہری دستاروں کی لٹ اپنی پیٹھ کے پیچھے سے لٹکا لیتے ہیں۔

پگڑی یا دستار سر کو ڈھانپنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس سے گرمیوں میں سر ٹھنڈا رہتا ہے اور سرما میں اس سے گرمی حاصل ہوتی ہے۔ یہ سر کو کسی چوٹ سے بچانے کے لیے خود کا بھی کام کرتا

ہے۔مزید برآں اس سے چہرے کی شباہت قابل دید بن جاتی ہے۔اگر کوئی شخص بدصورت ہو تو پگڑی باندھ کر وہ بھی قبول صورت دکھائی دے گا۔اس کے فوائد بے شمار ہیں اور میں نے یہاں اُن میں سے صرف چند ایک ہی کا ذکر کیا ہے۔اگر ایک ٹٹو اپنے سوار کو زمین پر پٹک دے تو سوار اپنی پگڑی کی لمبائی کے سہارے اپنے آپ کو سنبھالے گا جو کسی وقت سولہ گز لمبی ہوتی ہے۔اسی طرح کوئی شخص درخت پر چڑھنے کے لیے کبھی کبھی اپنی پگڑی ہی کا استعمال کرتا دکھائی دے گا۔وہ پگڑی کے سرے سے ایک پتھر باندھ کر اسے درخت کی کسی شاخ پر لٹکا کر خود اسی پگڑی کے سہارے اوپر چڑھ سکتا ہے۔یہ کنویں میں سے کوئی چیز نکالنے کے کام بھی آتی ہے اور ایک بار تو یہ دیکھ کر میں من ہی من میں ہنسنے لگا جب ایک لمبی پگڑی والے ایک بااثر شخص نے اپنے نوکر سے کہا کہ وہ اپنی پگڑی کا کونا اُسے تھما دے تا کہ وہ اپنی بہتی ہوئی ناک کو پونچھ ڈالے۔

حال ہی میں میں نے دیکھا کہ میرے شاگرد اپنی پگڑیوں کو خلق خدا کی خدمت میں بھی استعمال کرتے ہیں۔اگر انھیں کوئی زخمی شخص نظر آئے تو وہ اپنی پگڑی کا ایک حصہ کاٹ کر اسے مضروب کا زخم بند کرنے کے کام میں لائیں گے۔اس سے کسی بھاگتے ہوئے جانور کو پکڑنے یا ناؤ کھینچنے کی خاطر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اب میں یہی کہوں گا کہ بقول امریکی کہاوت: ''کشمیری پگڑی ایک صاحب ٹوپی ہے''۔

کشمیریوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے صرف پگڑی ہی کافی نہیں بلکہ یہاں مسلمان اور ہندو الگ الگ پوشاک پہنتے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ ان کا ایک مشترکہ قومی لباس ایک لمبا ڈھیلا ڈھالا چوغہ، پھیرن، ہے لیکن اس کی تراش مختلف ہوتی ہے۔پھیرن کو بہر حال ایک بدزیب پوشاک ہی کہا جا سکتا ہے۔کہتے ہیں کہ جب افغانوں نے کشمیر پر قبضہ کیا تو انھوں نے کشمیریوں کے کردار کے پیش نظر انھیں بھی عورتوں کا لباس پہننے پر مجبور کیا۔(1) برہمن مرد کا پھیرن برہمن عورت اور مسلمان مرد اور عورت سے مختلف ہوتا ہے۔اس کی آستین لمبی ہوتی ہے جو مرد کے بازو سے بھی دراز ہوتی ہے۔میں نے ابھی تک اس درازیٔ آستین کا راز دریافت نہیں کیا ہے مگر میں نے دیکھا ہے کہ ہندو عورتیں پیتل کے پیالوں میں گرم چائے پیتے وقت اس کا استعمال کرتی ہیں۔یا جب وہ آگ پر رکھا ہوا کوئی برتن اتارتی ہیں یا جب انھیں چڑا یا ٹٹو کی لگام جیسی کوئی گندی

شے پکڑنا ہو۔اسے وہ اپنے مخالف کو ہرانے کے لیے بھی کام میں لاتی ہیں جب وہ اسے گھوم گھما کر اس کے منہ پر مارتی رہتی ہیں۔ان کا یہ حملہ ایک قسم کا ظریفانہ عمل ہوتا ہے۔

پھیرن اُن کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہے جو کانگڑی کا استعمال کرتے ہیں۔جب وہ فرش پر بیٹھتے ہیں اور پھیرن کے تلے اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ کانگڑی کو دباتے ہیں تو یہ ایک خیمے کی شکل اختیار کرتا ہے۔جو پرانے تُرکی حمام کی یاد دلاتا ہے۔میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب کوئی بچہ پیچھا کرنے والے سے بچنا چاہتا ہے تو وہ ماں کے پھیرن میں آسانی سے چھپ جاتا ہے اور ماں قسم کھا کر کہتی ہے کہ اس نے بچے کو نہیں دیکھا لہٰذا وہ اسے کہیں اور تلاش کرے۔میں نے ایک مرتبہ ایک پورے قد و قامت کے مرد کو بھی اسی طرح ایک خاتون کے پھیرن کے اندر چھپتے ہوئے دیکھا۔

کشمیری ہندو اپنے گھر میں یا باہر کوئی غیر مطلوبہ چیز یا موزے نہیں پہنتا۔وہ اپنے پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں پہنے ہوئے نظر آئے گا جس میں وہ گھاس کی چھوٹی رسی کا ٹکڑا باندھ کر اسے اپنے انگوٹھے اور اس کی ساتھ والی انگلی کے بیچ پھنسا کر چلے گا یا لکڑی کا ایسا ہی دستہ اس کام کے لیے تیار کرے گا۔چمڑا ہندوؤں کے لیے مکروہ شے ہے اسی لیے وہ لکڑی کے دستوں کو ترجیح دیتے ہیں جب تک کہ ان کا بیوپار اُن سے بہت زیادہ تیز رفتاری کا متقاضی نہ ہو جس میں انھیں فی گھنٹہ ڈیڑھ میل طے کرنا پڑے۔اس صورت میں انھیں چمڑے کے جوتوں سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔

کسی کشمیری ہندو کا بیت الخلاتب تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کے بدن پر اس کی ذات کے نشانات ثبت نہ ہوں جو سرخ، زرد یا دونوں رنگوں یا سرمئی رنگ کے ہوتے ہیں۔رنگوں کی یہ لپائی اس کی پیشانی کے وسط سے نیچے کی طرف کھنچتی ہوئی اس کی ناک تک پہنچتی ہے اور اس کے گلے پر بھی اس کے نشانات ہوتے ہیں۔ان تین رنگوں سے مراد ہندو دیوتاؤں کی تثلیث یعنی شو، برہما اور وشنو ہے۔اس کے علاوہ برہمن کی گردن سے ایک میڈل لٹکا ہوتا ہے جس پر اس کی تقدیر کا خلاصہ کندہ ہوتا ہے۔اس سے اسے ستاروں کے منفی اثرات، خبیث ارواح اور نظر بد سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔اس میڈل پر کسی ہندو دیوتا یا دیوی یا کسی ستارے یا جادوئی شبیہ کا عکس بنا ہوتا ہے۔

ہر ہندو ایک دھاگا یعنی زُنار پہنتا ہے۔ جسے وہ بائیں کندھے سے دائیں بغل کی طرف باندھ لیتا ہے۔ یہ کپاس کے تین پتلے دھاگوں کو بل دے کر تیار کیا جاتا ہے اور اسے ہندو کی شادی تک ایسے ہی رکھا جاتا ہے جب اس کے ساتھ کپاس کا مزید دھاگا جوڑا جاتا ہے۔ اس دھاگے کو سال میں سوائے تین بار کبھی جسم سے الگ نہیں کیا جاتا۔ ایک، جب ہندو کا جنم دن ہوتا ہے، دوسرا شوراتری کے تیوہار پر اور پھر ہندوؤں کے نئے سال کے موقعے پر یہ اتارا جاتا ہے جب پجاری ایک نیا دھاگا پہنا دیتا ہے۔ اس دھاگے کو ہر روز دھولینا چاہیے اور اس دوران گایتری کی مدح میں ایک منتر پڑھ لینا ضروری ہے۔ اگر دھاگا ٹوٹ جائے تو اسے جوڑا نہیں جاتا نہ ہی اس میں کوئی گانٹھ لگائی جاتی ہے۔ کیونکہ پرانا گانٹھ مقدس ہے اور اسے جلایا جاتا ہے اور دھاگے کو پھینک دیا جاتا ہے۔ نیا دھاگا پجاری سے ہی لیا جاتا ہے جس کی لمبائی غیر شادی شدہ کے لیے ایک ہاتھ کی چوڑائی سے چھبیس گنا زیادہ ہونی چاہیے۔ شادی شدہ شخص کے لیے اس سے دوگنی لمبائی کا دھاگا ہونا لازمی ہے۔

ان لوگوں میں ایک فیشن کا عام طور پر رواج ہے جس کی طرف غور سے دیکھے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ جب یہ اپنا کوٹ یا پاجامہ ایک سوتی تھان سے سلواتے ہیں تو ہر تھان پر نیلے رنگ میں لکھا ہوا کوئی نہ کوئی نشان ان کو بہت اچھا لگتا ہے۔ کبھی یہ ایک انسان کی شکل دکھاتا ہے اور کبھی کسی حیوان کا چہرہ اس پر نمایاں ہوتا ہے یا اس کپڑے پر اس کی لمبائی کے گز درج ہوتے ہیں۔ کشمیری ان نشانوں کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا درزی بھی ان کے تفننِ طبع کی خاطر ان نشانوں کو واضح طور پر دکھاتا ہے۔ کبھی آپ کو کسی کتے کا منہ یا اسے بنانے والے کا نام نیلے رنگ میں کوٹ کے پچھلے حصے پر نظر آئے گا۔ اگر وہ کوئی سرکاری ملازم ہو تو اس کے لباس پر واضح الفاظ میں ''36 گز'' لکھا ہوگا۔ اس سے وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایک فربہ جسم کا مالک ہے جس کے لباس پر چھتیس گز کپڑا خرچ ہوا ہے۔

ہندوؤں کی عورتیں تیز رنگوں کے کپڑے پسند کرتی ہیں جو نارنگی یا ارغوانی ہوتے ہیں۔ اس سے واقعی آس پاس کا ماحول بھی رنگین ہو جاتا ہے۔

فٹ نوٹ:

(1) معلوم نہیں کہ مصنف یہاں کشمیریوں کے کردار سے کیا معنی اخذ کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بے رحم افغان قابضوں نے نہتے کشمیریوں پر جو بہیمانہ ظلم وستم ڈھائے ان کے سامنے چنگیز اور ہلاکو خاں کی انسان کشی بھی شرمندہ ہو سکتی ہے۔

بارھواں باب

برہمن اور سادھو

جب کوئی برہمن سرکار کے کسی محکمے میں نوکری کرنے لگتا ہے جو اُس کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے تو وہ بابو کی طرح دکھنے کی غرض سے تنگ پائنچوں والا پاجامہ پہن لیتا ہے۔ اگر وہ واقعی صحیح طور پر بابو کہلائے جانے کا خواہش مند ہے تو وہ اپنے تنگ پاجامے کو اپنی ٹانگوں سے بھی بہت زیادہ لمبا بنا کر پہنے گا یہاں تک کہ جب اسے پاجامہ اتارنا ہو تو وہ ایک کاغذ گھٹنوں کی طرف سے اس کے پائنچوں میں ڈال کر اسے نیچے کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھیرن کے بجائے وہ کوٹ اور صدری یا واسکٹ پہنے گا جن کا رنگ عام طور پر کالا ہوتا ہے۔ صدری کے نیچے وہ ایک سفید کرتا پہنتا ہے جو پاجامے کے اوپر سے باہر لٹکا ہوگا۔ یہ رواج ضروری ہے کیونکہ اس سے اُسے جیبی رومال آسانی سے ہاتھ آ سکتا ہے۔

اسے اپنی سہولت کے لیے پاجامے کے لپیٹوں کو گھٹنوں کے پاس تہہ بہ تہہ اوپر کی طرف موڑنا پڑتا ہے۔ وہ اگرچہ ایک قمیض ہی پہنتا ہے لیکن وہ شاذ و نادر ہی نیکٹائی یا کالر کا استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح وہ مشرقی جوتے اور موزے پہنتا ہے۔

جب برہمن کلرک شام کو گھر جاتا ہے وہ دن کا لباس اُتار پھینکتا ہے اور پھر اپنے آباؤ اجداد کی پوشاک پہنتا ہے۔ کیونکہ وہ انہی کپڑوں میں اپنے گھر میں بیٹھا محسوس کرے گا۔ برہمن جب

کپڑے پہنتا یا اُتارتا ہے تو وہی اس کے اندرون کی عکاسی کرتی ہے۔گھر میں وہ مکمل طور پر عادات، رسوم اور عقائد کے حوالے سے ایک مشرقی شہری ہے اور جب وہ دفتر میں ہوگا تو وہ ہر لحاظ سے مغربی انداز ہی اختیار کرے گا۔لیکن یہ تبدیلی اس کے لیے ایسی ہی حقیقت کی حامل ہے جیسی اس کے بابو والے لباس کی اہمیت ہوسکتی ہے۔میں ان کی اس اداکاری پر پھولے نہیں سماتا اور وہ بھی اس فن کو زور وشور سے بنائے رکھے ہوئے ہیں۔

اس قبیل کے کشمیریوں نے میرے ہم وطنوں کو بھی کئی بار شیشے میں اُتارا ہے جب وہ ان کی چاپلوسی اور مصنوعی خوش آمد کے جال میں پھنسے ہیں۔خود میں بھی ان فریبیوں کی چالبازی سے نہیں بچ سکا ہوں۔ان کی اس نقلی طرز زندگی کی وجہ سے انگریز سیاحوں کو بار بار مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔یہ کسی حد تک ایک تکلیف دہ امر ہے کہ جہاں کشمیر میں ایماندار اور نیک خصلت لوگ بیکسی میں مبتلا ہیں وہاں یہ چور اچکے عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے ہیں حالانکہ اُنھیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے تھا۔

میں اس پس منظر میں ایک واقعے کا ذکر کروں گا جہاں میں فریب کاری کے جھانسے میں آنے سے صاف بچ نکلا۔

ایک دن صبح کے وقت ایک جٹادھاری ہندو سادھو میرے پاس آگیا۔وہ لمبے قد اور دبلی پتلی جسامت کا تھا،اس کی انگلیوں کے ناخن حد سے زیادہ لمبے تھے اور اس کے سرخ بالوں نے اس کے چہرے کا ہالہ بنا کر اسے ایک ایسی پُر اسرار شخصیت بنایا تھا گویا لال لال شعاعوں کے بیچ سورج کے عکس میں کوئی عجیب سا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔وہ آتے ہی مجھ سے بولا کہ اُسے عیسائی مذہب کے ساتھ دلچسپی ہے اور میری تعریفیں کرتے ہوئے اس نے مجھے ایک بہت بڑا خدا پرست اور نیک انسان کہا۔بالآخر اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے بائبل کا ایک نسخہ دوں جس کا وہ بغور مطالعہ کرنے کا متمنی ہے۔اس نے مجھ سے یہ درخواست بھی کی کہ میں بھی وقت نکال کر اس کے ساتھ بیٹھ کر بائبل کا مطالعہ کرکے اس کی وضاحت میں اس کی رہنمائی کروں۔ میں نے بہر حال سادھو کی خواہش کو رد کیا کیونکہ میرے خیال میں اس کے دل میں بائبل سے زیادہ کچھ اور ہی تھا۔اس نے جب دیکھا کہ میں اس کی باتوں میں آنے والا نہیں اور اسے جانے کو کہا تو وہ چلا گیا۔چند روز بعد وہ

پھر آ گیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کی بجائے سیدھے مطلب کی بات کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اگر اس نے اپنے بیٹے کو مشن اسکول میں داخل کیا تو کیا میں اسے وظیفہ دے سکتا ہوں؟ میں نے درجواب کہا کہ بھلا میں اس کے بیٹے کو کیوں وظیفہ دوں گا؟ ۔ "کیونکہ میں ایک خدائی شخص ہوں اور میں دن بھر ایک چنار کے درخت تلے بھگوان کی پوجا کرتا رہتا ہوں۔ لہٰذا میں اپنے کنبے کو پال پوس نہیں سکتا"۔

میں نے جواباً کہا کہ اگر تم واقعی خدائی شخص ہو تو تمھارا اولین فرض یہ ہے کہ تم اپنے بال بچوں کی پرورش کرو۔ اس نے کہا۔ "نہیں۔ میں نے ان سب کو چھوڑ دیا ہے۔ اور میں چنار کے نیچے صرف مالک کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں"۔

میں نے صاف لفظوں میں اس سے کہا کہ میں ایسی زندگی کا معترف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک خاوند یا باپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی نگہداشت کرے۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور بار بار وظیفے کے لیے اصرار کرتا رہا۔ مختصراً میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے بچے کو وظیفہ دے سکتا ہوں بشرطیکہ وہ سارا دن ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر برباد نہ کرے اور کوئی کام ڈھونڈ کر اپنے گھربار کو سنبھالے۔

وہ اس پیش کش سے غالباً مطمئن نہیں ہوا اور چلا گیا۔ کوئی ایک سال بعد ایک قد آور شخص جس نے داڑھی اچھی طرح بنائی تھی اور جو بابو کے لباس میں تھا۔ اس نے چمڑے کے جوتے بھی پہن رکھے تھے۔ اس نے ایک زہر خندہ کے بعد مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی۔ میں تھوڑی دیر تک شش و پنج کے عالم میں سوچتا رہا کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟ پھر مجھے اس کی چال ڈھال اور انداز کلام یاد آ گیا اور میں پہچان گیا کہ یہ وہی وظیفہ طلب سادھو ہے۔ اس کی جٹائیں غائب ہو چکی تھیں۔ اب وہ محکمۂ باغات میں ایک کلرک ہو گیا تھا اور اپنی ماہانہ کمائی سے اس کے گھر کا خرچہ آسانی سے پورا ہوتا تھا۔ چونکہ اس نے میری بات مان لی تھی اور اب میں نے بھی اس کے بیٹے کو وظیفہ دے کر اسکول میں داخلہ دلایا۔ یہ لڑکا غیر متوقع طور پر ذہین ثابت ہوا۔ اس نے بعد میں کالج میں داخلہ لیا۔ اب وہ پولیس میں ہے اور اپنی ماں کی خاطر خواہ طور پر دیکھ بھال کرتا ہے جبکہ میرا سادھو دوست اس دنیا سے دور چلا گیا ہے۔

سادھوؤں کی بات چلی تو میں بتاؤں کہ ہندوستان سے ہر سال جولائی کے مہینے میں یہ لوگ ٹڈی دل کی طرح کشمیر آتے ہیں۔اور سری نگر سے ہوتے ہوئے امرناتھ گپھا کی جانب سفر کرتے ہیں جسے یہ زندگی کا آقا کہتے ہیں۔یہ گپھا شہر سے میلوں دور ایک پہاڑ پر تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔سادھو لوگ سینکڑوں کی تعداد میں زرد اور نارنجی کپڑے پہن کر یا مادرزاد ننگے یہاں آتے ہیں اور انھوں نے جسموں پر بھبھوت رمائی ہوتی ہے۔

شہر میں انھیں دس یا زیادہ افراد کے گروہوں میں چلتے دیکھا جا سکتا ہے۔یہ اپنے شنکھ زور زور سے بجاتے ہیں اور لوہے کے سرخ ترشول ہوا میں لہراتے ہیں۔ان کے ہاتھوں میں پیتل کے کاسہ ہائے گدائی ہوتے ہیں۔جب یہ شہر میں ہجوموں کی شکل میں داخل ہوتے ہیں تو کبھی اپنے ساتھ کالرا اور وبا بھی لاتے ہیں جس سے ہزاروں لوگ موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

ایک بار وہ یہ بیماری اپنے ہمراہ لائے تو جب ڈاکٹر نیو نے ان میں سے ایک سے بات کی تو وہ بولا۔"دیکھیے ہر ایک کو کسی نہ کسی وقت مرنا ہے۔میں مروں گا۔آپ مر جائیں گے۔ہم سبھی مر جائیں گے تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

میں نے انھیں وبا کے ماحول میں دیکھا ہے جب ہر ایک کو تسلی اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ ننگے سادھو زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے چیختے چلاتے گھر گھر جاتے ہیں اور خیرات جمع کر لیتے ہیں۔یہ عورتوں کو یہ کہہ کر ڈراتے ہیں کہ اگر انھوں نے ٹھیک ٹھاک طریقے سے انھیں بھیک نہیں دی تو وہ مر جائیں گی۔ان کی شکل وشباہت ہی ایسی بھیانک ہوتی ہے کہ عورتیں اُن کے راکھ میں لپے ہوئے بال اور بھنگ اور افیون سے مخمور آنکھیں دیکھ کر خوف سے لرز اٹھتی ہیں۔ہندو اس غرض سے ان کی بہت عزت کرتے ہیں مبادا وہ انھیں کوئی بددعا دیں۔سادھوؤں کی عزت افزائی میں ان پڑھ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے ہندو بھی پیش پیش رہتے ہیں۔راجے مہاراجے ان پر پانی کی طرح پیسہ بہادیتے ہیں۔ایک اجتماع میں ایک صاحب نے انکشاف کیا کہ ان پر سالانہ ایک کروڑ تیس لاکھ پاؤنڈ خرچ کیے جاتے ہیں۔

ایک رات میں ہندوؤں کی ایک اصلاحی میٹنگ سے ایک پڑھے لکھے ہندو کے ساتھ واپس لوٹ رہا تھا کہ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا میں رام چند نام کے ایک خدائی ہندو شخص کو

جانتا ہوں؟ جب میں نے اس شخص سے لاعلمی ظاہر کی تو وہ کسی حد تک مایوس ہوا اور میں نے یہ بھی کہا کہ میں نے ایسے کسی شخص کی نیک نامی کا کوئی ذکر نہیں سنا ہے۔ وہ بولا۔ ''یہ شخص بہت پہنچا ہوا ہے اور میں ہمیشہ اس کے پاس مشورہ حاصل کرنے کے لیے جاتا ہوں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ رام چند کس لحاظ سے خدائی شخصیت ہے؟ کیا وہ غریبوں کی مدد کرتا ہے یا کیا بیواؤں کو ان کی مصیبت سے نکالتا ہے؟ تو اُس نے کہا۔ ''ارے نہیں، چونکہ وہ آقا کا آدمی ہے لہٰذا وہ کچھ نہیں کرتا۔ میں نے پھر سوال کیا۔ ''پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خدائی شخص ہے؟'' '' کیونکہ وہ تین منٹ تک اپنی سانس کھینچ کے رکھ سکتا ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگا کہ میں نے اس حیران کن خبر سے کیا اثر لیا ہوگا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے اس اطلاع سے کوئی بشاشت نہیں ہوئی۔ البتہ ایسی خبر سے میں واقعی شاد ہوتا اگر مجھ سے کہا جاتا کہ یہ نام نہاد بزرگ تین منٹ تک پانی میں سانس کھینچ کر کسی ڈوبتے ہوئے شخص کو بچالیتا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس نہ تو کوئی مشورے کے لیے جائے گا اور نہ ہی کوئی اسے پیسہ دے گا۔

معاف کیجیے میں نے جتنے بھی سادھو دیکھے ہیں ان میں سے کسی نے مجھے ذرہ بھر بھی متاثر نہیں کیا جب میں نے انھیں کیلوں کے بستر پر لیٹے یا اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے ہاتھوں کے ناخن بڑھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں واقعی چند ایک خدا کے محبوب بندے ہیں جو دوسروں کا بے ہنگم شور وغل خاموشی سے سن کر اصلیت کی کھوج لگا کے ہی دم لیتے ہیں۔

ایک ایسا ہی سادھو کشمیر آیا جس کے ساتھ اس کے چیلے بھی تھے۔ زرد لباس میں ملبوس اس شخص نے یورپ اور امریکہ سمیت کئی ممالک کا سفر کیا تھا اور اس نے اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے دورۂ کشمیر کے موقعے پر برہمنوں کی ایک جماعت اس لیے اس کے درپے تھی کہ وہ ایک برہمن مدرسہ قائم کرنے کے سلسلے میں ان کی اعانت کرے۔ لہٰذا انھوں نے اسے ایک بہت بڑے مندر میں ایک عوامی میٹنگ میں بلایا تاکہ اس کی حمایت مدرسے کی تعمیر کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ اس میٹنگ میں اپنی تقریر میں صدر نے مشن اسکول کے بارے میں چند مخالفانہ الفاظ بیان کیے جنھیں اس شخص نے صحیح مان لیا اور وہ بھی مشن اسکول کے خلاف بولنے لگا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر

نے جب یہ ماجرا سنا تو وہ اس سادھو سے ملنے گیا اور اسے بذاتِ خود مشن اسکول میں آنے کی دعوت دی تا کہ وہ بنفسِ نفیس وہاں کی صورت حال دیکھ لے۔ اس نے یہ دعوت قبول کر لی اور اپنے ایک چیلے کے ساتھ اس درس گاہ میں آیا جو اسی اسکول کا طالب علم تھا۔ اُس نے یہاں جو کچھ دیکھا اس سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ اس نے مندر میں برہمنوں کی ایک میٹنگ بلائی اور اپنی تقریر میں مشن اسکول کی طرز پر تعلیم دینے کی تلقین کرتے ہوئے برہمن اسکول قائم کرنے کی مخالفت کی اور تمام والدین سے کہا کہ وہ اپنے بچوں کو مشن اسکول ہی میں داخل کروائیں۔ بعد میں اس نے صدر کو بلا کر اسے تنبیہ کی کہ وہ مشن اسکول کے خلاف بیان کردہ الفاظ واپس لے اور معافی مانگ لے۔

میں ایک سادھو کی بات کروں گا جو ایک شاندار طریق کار کا حامل تھا۔ یہ واقعہ مجھے ایک بزرگ خاتون نے بتایا۔ واقعہ مئی 1857 میں ہندوستانیوں کی بغاوت کے وقت کا ہے۔ یہ خاتون اُس وقت 17 سال کی ایک بچی تھی۔ وہ اُن دیگر آٹھ لوگوں کے ہمراہ تھی جو دہلی سے بھاگ کر میرٹھ پہنچنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ سارا دن چھپے ہوئے تھے اور اب انھوں نے غروب آفتاب کے وقت سفر دوبارہ شروع کیا تھا۔ وہ پکڑے جانے سے بچنے کے لیے عام سڑک سے دور ہی تھے کہ ان کی ملاقات ایک جنگل میں ایک سادھو سے ہوئی۔ اُس نے ان لوگوں کا ناگفتہ بہ حال دیکھا جو ایک ہفتے سے اسی بھاگم بھاگ کے عالم میں تھے۔ اُس نے ان پر رحم کھا کر انھیں کھانا کھلایا۔ ابھی انھیں سادھو کی صحبت میں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باغیوں کی ایک جماعت نے انھیں دیکھ لیا۔ گھوڑوں پر سوار وہ سادھو کے پاس پہنچے اور اسے حکم دیا کہ وہ فوراً بھگوڑوں کو ان کے حوالے کرے۔ سادھو نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ اُس نے ان لوگوں کو اپنی جھونپڑی میں چھپا رکھا تھا اور اس نے باغیوں سے زوردار آواز میں کہا کہ اگر ان میں جرأت ہے تو وہ چھپے ہوئے افراد کو ڈھونڈ ھ نکالیں اور سادھو کی بد دعا کے شکار ہو جائیں۔ باغی سادھو کی اس بات سے خوف زدہ ہو گئے اور اس طرح انگریزوں کی جانیں بچ گئیں۔ بزرگ خاتون نے مجھے بتایا کہ سادھو کی اس انسان نوازی کی بدولت اس کے دل میں ایسے خدا دوست بزرگوں کی بہت زیادہ عزت ہے اور وہ ہر اُس سادھو کو خیرات دیتی ہے جو اس کے پاس آتا ہے۔

کشمیر وارد ہونے والے سادھوؤں میں اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہندوستان سے گرمیوں میں یہاں آتے ہیں جب کہ کشمیری سادھو عام طور پر ایک درخت کے نیچے یا کسی مقدس جگہ پر بیٹھتے ہیں۔ یہاں ان کے عقیدت مند ان کے پاس آتے ہیں جنھیں وہ عجیب قسم کے مشورے دیتے ہیں۔ مدرسوں کے طلبا امتحان میں پیش ہونے سے پہلے اپنی کامیابی کے لیے آشیرواد پانے کی غرض سے ان سے ملتے ہیں۔ وہ صرف انہی کو کامیابی کا وعدہ دلاتے ہیں جو انھیں اچھی خاصی رقم پیشگی دیتے ہیں۔ دوسروں کو وہ اسی صورت میں کامیاب ہونے کی امید دلاتے ہیں اگر وہ ایک مخصوص جگہ کے ارد گرد کئی بار طواف کریں یا دانش کی دیوی کی اُس مندر میں پوجا کریں جو سری نگر سے دس میل دور ہے۔ آپ کئی طلبا کو اس مشورے کی پابندی کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں جو فی الحقیقت ایک اچھا مشورہ ہے کیونکہ اس کی بدولت طالب علم دن رات اپنے مطالعہ میں محو رہتے ہیں۔ راتوں کو جاگتے رہنے کے لیے وہ اپنے سر کے بالوں کی اوپری لٹ چھت کے ساتھ کسی رسی اور کیل سے باندھ کر رکھتے ہیں تاکہ نیند سے ان کا سر بھاری نہ ہو۔ لہٰذا بیس میل چلنے کی ورزش ایک اچھی سرگرمی ہے اگر چہ سادھوؤں کو خود اس کے فوائد کا کوئی علم نہیں ہے۔

ایک طالب علم کے بارے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ امتحان سے پہلے تھکاوٹ سے چور چور ہو چکا تھا کیونکہ سادھو نے اسے ہاری پربت کی پہاڑی کے ارد گرد رات کے اندھیرے میں تین بار چکر لگانے کی صلاح دی تھی۔ دن کی روشنی میں یہ ورزش بیکار تصور کی جاتی ہے اور یہ صرف سات راتیں گزارنے کے ساتھ برابر دورانِ شب ہی کی جاتی ہیں۔ اس طالب علم کی حالت قابلِ رحم تھی اور سادھو نے اس کے دیے ہوئے پیسے بھی نہیں لوٹائے تھے۔

ان سادھوؤں پر لوگوں کا غیر متزلزل یقین اس بات کے پیشِ نظر واقعی حیران کن ہے کہ انھیں بار بار بے وقوف بنایا جاتا اور لوٹا جاتا ہے۔

اب ہم ان سادھوؤں کو درختوں کے نیچے خدا کو یاد کرتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور بازار میں لوگوں پر ایک آخری نگاہ ڈالیں گے۔ ابھی تک میں نے مردوں کی بات کی ہے جو بازاروں میں اِدھر اُدھر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اونچے طبقے کی خواتین گھروں سے باہر نہیں آتیں وہ سر سے پاؤں تک ایک سفید رنگ کا برقعہ پہن کر گھروں سے نکلتی ہیں جس میں سے دیکھنے کے لیے رنگ دار

دھاگوں سے بنی چار مربع انچ کی ایک جالی ہوتی ہے۔ کسی ہنگامی حالت کے پیش نظر عورتوں کو دن میں بھی باہر آنا پڑتا ہے۔ عورتوں کے لیے دوسرے مردوں کو دیکھنا ممنوع ہے۔ اگر ان کے سامنے سے کوئی مرد گزرے تو وہ ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیتی ہیں۔ چہرے کو شال سے ڈھانپتی ہیں اور دیوار کی طرف منہ کر لیتی ہیں۔ انھیں ہر وقت تاکید کی جاتی ہیں کہ وہ غیر مردوں کو دیکھتے ہی ان کے لیے راستہ چھوڑ دیں۔ دوسری طرف بہت کم مرد عورتوں کے احترام میں انھیں راستہ دیتے ہیں البتہ اگر برہمنی بیل یا گائے ان کے سامنے آئے تو وہ انھیں اور آوارہ کتوں کو دیکھ کر ڈر کے مارے ایک طرف ہٹ کر انھیں آگے بڑھنے کا موقعہ دیتے ہیں کیونکہ گائے بیلوں کے سینگ اور کتوں کے نوکیلے دانت ہوتے ہیں۔ جب کوئی مضبوط جسم اور موٹی توند والا چلتا ہے تو اسے کسی کا گمان بھی نہیں ہوتا لیکن اگر اس کے سامنے بیل جیسا کوئی اس سے بھی زیادہ ڈھیل ڈھال والا شخص گزرے تو اس کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

اوسط جسامت والا میرا ایک دوست پل کے بیچوں بیچ چل کر اسے پار کر رہا تھا کہ اسے مقابل کی طرف سے ایک ہٹا کٹا افغان آتا ہوا دکھائی دیا اور وہ بھی پل کے بیچوں بیچ چل رہا تھا۔ جب وہ آمنے سامنے آ گئے تو ان میں سے کسی نے بھی پرے ہٹ کر آنے والے کو راستہ نہیں دیا۔ پھر ان کے جسم ایک دوسرے سے ملے اور یکا یک اوسط جسم والے نے دیکھا کہ اسے افغان نے اپنے بازو میں دبوچ لیا تھا۔ جو شان بے نیازی سے اس شخص کو ٹانگوں سے کھینچ کر آگے چل رہا تھا۔ جب وہ پل کے سرے پر پہنچا اس نے اس شخص کو راستے کے ایک طرف گویا سڑک پر پٹک دیا۔ ایسی صورت حال میں اوسط جسامت کے شخص نے اس طرح اپنے چہرے پر آثار ظاہر کیے جیسے وہ اس واقعے سے محظوظ ہوا ہو۔

سری نگر میں مجھے گندگی اور سڑکوں کی بدبو سے نفرت ہے مگر انسانی نقطۂ نظر سے یہ ایک دلچسپ شہر ہے اور مجھے یہاں کے لوگوں اور اُن کے مزاح سے خاصا لطف آتا ہے۔ اس شہر کے حالات میں بہتری آنے کے امکانات روشن ہیں۔ حال ہی میں کئی معقول لوگ میونسپلٹی میں گئے ہیں جہاں وہ اس غرض سے صدر کی حمایت کر رہے ہیں کہ تعصب، ذات پات اور بے ایمانی کا قلع قمع کرنے کی اس کی مساعی کی حمایت کی جائے۔ لیکن ابھی یہ کام ایسا لگتا ہے گویا ایک گاڑی کو اس

کے چاروں پہیوں میں بریک لگا کر کھینچا جائے اور چار گھوڑوں میں سے صرف ایک ہی گھوڑا آگے بڑھنا چاہتا ہو۔ پھر بھی اب صورت حال پہلے سے بہتر ہے کیونکہ اُس وقت خود کو چوان بھی گاڑی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ چلیے ہم بھی اُمید پر زندہ رہیں!

تیرھواں باب

ہندوؤں کے رسوم ورواج

ایک ہندو عورت جب حاملہ ہوتی ہے تو بچے کو جنم دینے سے چند ہفتے پہلے اسے دہی سے بھرے چند برتنوں کے ساتھ سسرال بھیجا جاتا ہے۔ یہ دہی شوہر کے رشتہ داروں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر عورت کا باپ اس کے لیے نئے کپڑے بنواتا ہے۔

بچے کی پیدائش کے چھٹے دن عورت کو گرم پانی سے نہلایا جاتا ہے۔ اس پانی میں طبی اثرات والی جڑی بوٹیاں ملائی جاتی ہیں۔ پھر اس کے میکے کے رشتہ دار اس سے ملنے آجاتے ہیں۔

پہلے گیارہ دن تک اس گھر میں رشتہ داروں کو کھانے پینے کی اجازت نہیں۔ البتہ چند قریبی رشتہ دار اس شرط سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس گھر کو چھوت کے جراثیم سے آلودہ اور گندہ مانا جاتا ہے۔

بچے کی پیدائش کے گیارھویں دن زچہ کو نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ جو اس کے لیے اس کے خاوند نے تیار کیے ہیں۔ نوزائیدہ کو بھی ایک نام دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام ہوتا ہے۔ پجاری بچے کا زائچہ تیار کر کے لاتا ہے اگر بچہ لڑکا ہو تو اس کے عوض اُسے اچھی رقم دی جاتی ہے۔ زائچہ گولائی میں لپٹا ہوا کاغذ ہوتا ہے۔ جس پر بچے کے لیے موافق یا غیر موافق

ستاروں کا حال درج ہوتا ہے۔اس موقعے پر گھر کی سب سے عمر رسیدہ عورت بھوج پتر کے چند ٹکڑے لا کر انھیں گول شکل میں لپیٹتی ہے۔ پھر ان ٹکڑوں کو نذر آتش کیا جاتا ہے جنھیں ہر حاضر شخص کے سر کے اوپر کئی بار گھمایا جاتا ہے اور عورت یہ گیت گنگناتی رہتی ہے:

یہ ایک نیک شگون ہے
بھگوان کرے
یہ شبھ گھڑی بار بار آئے

بچے کی مُوتراشی کے لیے کوئی خاص وقت متعین نہیں ہے۔اس موقعے پر رشتہ داروں کو دعوت دی جاتی ہے اور گھرانے کا پجاری بھی اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ماں کے لیے نئے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں اور بچہ سمیت رشتہ دار اور نائی کو بھی بخشیش دی جاتی ہے۔

بچے کی پیدائش کے پندرہ دن کے اندر اسے زُنار باندھنے سے قبل سارے مکان کی صفائی اور سفید چونے سے لپائی کی جاتی ہے۔اسے گھر ناوی کہتے ہیں۔اس تقریب کے بعد عورتیں رشتہ داروں کو دعوت پر بلاتی ہیں جہاں انھیں نیک شگون کی خاطر پیسے دیے جاتے ہیں۔اس تقریب کے سلسلے میں راتوں تک گانے کی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔

زنار باندھنے کی رسم سے دو دن پہلے حنابندی کی تقریب ہوتی ہے جس میں بچے اور اس کی رشتہ دار خواتین کے ہاتھ سرخ رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔اس موقعے پر موسی یا چاچی رسم کی ادائیگی کے لیے بخشش وصول کرتی ہے۔

زنار یعنی مقدس دھاگا باندھنے سے ایک دن پہلے ہمسایوں اور قرابت داروں کو دعوت دی جاتی ہے۔ ہر شخص میزبان کو آٹھ آنے یا ایک روپیہ شگون کے لیے دیتا ہے اور ایک بھیڑ کو دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے لیے کاٹا جاتا ہے۔اس موقعے پر عورتیں رات دن بغیر کسی وقفے کے گانا گاتی رہتی ہیں۔وہ قطاروں میں بٹ کر باری باری گاتی ہیں۔انھیں اعلیٰ قسم کی ضیافتیں کھلائی جاتی ہیں۔ سارا انتظام انہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔موسی یا چاچی سب سے زیادہ اہم کام سرانجام دیتی ہے۔رسم کی تکمیل کے لیے منڈپ تیار کیا جاتا ہے اور پجاری ویدوں کا پاٹھ کرتے ہیں۔اس دوران عود مسلسل جلایا جاتا ہے۔رات کے وقت بچے کو دریا کے کنارے پر چند رسوم کی ادائیگی کے

لیے لایا جاتا ہے۔ اس دوران اُس کی غیر حاضری میں اس کی خواتین رشتہ دار گھر کے صحن میں ناچتی گاتی ہیں۔ اور دیکھنے والوں کو انھیں حسب استعداد ایک پیسہ یا اس سے زیادہ پیسے دینے پڑتے ہیں۔ یہ رسم بچے کی عمر گیارہ سال کی ہونے سے پہلے منائی جاتی ہے۔

ہندوؤں میں شادیاں میاں جی طے کرتے ہیں جو اول درجے کے دروغ گو ہوتے ہیں۔ زنار باندھنے کی رسم کے وقت مکان کو پھر لیپا جاتا ہے۔ ان رسوم کو عام طور پر تین دنوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں حنا بندی، دیوا گن اور شادی شامل ہیں۔ اس حوالے سے عورتیں ہی سارا کام کرتی ہیں۔ شادی کے اہم دن کو لگن کہتے ہیں۔ اس روز شادی کی بارات دلہن کے گھر جاتی ہے اور منڈپ پھر تیار کر کے عود جلایا جاتا ہے۔

پجاری ویدوں کا پاٹھ کرتے ہیں اور میاں بیوی کو قسمیں دلوائی جاتی ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا بدن اور روح ساتھ ساتھ باندھ کر رہیں گے اور یہ کہ منتروں کے ذریعہ ان کے جسم اور ارواح جڑے ہوئے ہیں۔ انھیں اس دنیا یا دوسری دنیا میں کبھی الگ نہیں ہونا ہے۔ عورت کو اُردنگی یعنی مرد کے بائیں کا نصف حصہ کہتے ہیں۔ شادی کی رسوم ختم ہونے کے بعد باراتیوں کو لذیذ کھانا کھلایا جاتا ہے جس میں صرف سبزیاں پکائی جاتی ہیں۔ پھر وہ دلہن کے ساتھ اس گھر سے چلتے ہیں۔ جب وہ دلہے کے گھر پہنچتے ہیں تو اُس کی بہن ان پر دروازہ بند کرتی ہے۔ یہ دروازہ تب تک نہیں کھلتا جب تک کہ اس کے ساتھ نقدی یا جنس کی شکل میں کسی تحفے کا وعدہ نہیں کیا جاتا۔ شام کے وقت دُلہا دلہن دونوں کو دلہن کا باپ بلاتا ہے۔ وہ دُلہے کو چند روپے دیتا ہے پھر دونوں کو اسی رات واپس بھیجا جاتا ہے۔ دُلہن ایک ہفتہ سسرال میں رہتی ہے پھر میکے آ کر وہاں بھی کچھ عرصہ گزارتی ہے۔ دلہن کا باپ جب بھی اپنی بیٹی سے ملنا چاہے تو اسے ہر بار نقدی رقم دینی پڑتی ہے۔ اگر دلہا دلہن بالغ ہیں تو وہ شوہر اور بیوی کی طرح رہ سکتے ہیں اگر ایسا نہیں ہے تو دلہن سونے کے کام والی ٹوپی پہن کر الگ کمرے میں سوتی ہے جب تک کہ وہ سن بلوغت کو نہ پہنچے۔ اُس وقت ایک اور رسم انجام دی جاتی ہے جس میں پجاری کو شامل نہیں کیا جاتا۔ اِسے زوجگی یا باقاعدہ شادی کہا جاتا ہے۔ اس موقعے پر بھی دلہن کے باپ کو داماد کو اپنے گھر بلا کر اُسے پیسے دینے کے علاوہ کھانا بھی کھلانا ہوتا ہے۔

میاں بیوی کو دوسروں کے سامنے آپس میں بات چیت کرنے کی اجازت دلہے کے باپ کے انتقال سے پہلے یا بچے ہونے تک نہیں ہوتی۔اس کے بعد دلہن اپنی ساس اور نند کی تابعدار ہوتی ہے اور اسے انہی کے احکام کی تعمیل کرنے کا حکم ہے۔اگر نند اس سے زیادہ عمر کی ہوئی تو اسے علی الصباح جاگ کر سارا کام کرنا پڑتا ہے جس میں مکان کی صفائی، پانی بھرنا، کھانا پکانا اور متفرقات شامل ہیں۔بیویاں عام طور پر اپنے خاوندوں کے لیے پُر شفقت اور تابعدار ہوتی ہیں۔بچے عموماً بڑوں کی سنتے ہیں لیکن مغربی تعلیم نے انھیں مجزاتی اثر سے متر انہیں رکھا ہے۔ بچے زیادہ آزادی چاہتے ہیں جبکہ والدین اُمّی ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے۔

ایک ہندو کے مرنے پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

شو یعنی میت کو گرم پانی سے نہلا کر ایک نئے کپڑے میں لپیٹا جاتا ہے۔گھر کے باہر ایک مختصری رسم ادا کی جاتی ہے۔اس رسم میں متوفی کے بیٹے، بھائی یا کسی قریبی رشتہ دار کی موجودگی لازمی ہے۔اس رسم کے بعد شو کو ایک چارپائی پر رکھ کر شمشان گھاٹ کی طرف لے جاتے ہیں۔جو اس ارتھی کے ہمراہ ہوتے ہیں وہ 'شو،شو،شمبھو' کا پاٹھ کرتے ہیں جس کا مطلب ہے اے بھگوان! جو امن کا داتا ہے، ہمارے گناہوں کو بخش دے!

جب شو کو دور لے جایا جاتا ہے تو پجاری گھر کے اندر زمین کا ایک چھوٹا سا حصہ آٹے سے ڈھکتا ہے اور اس پر ایک ٹوکری رکھ کر اس کے اندر ایک چراغ جلاتا ہے۔اس سے وہ باور کرنا چاہتا ہے کہ جسم اور روح کس طرح مٹی کے نشان میں تبدیل ہوئے ہیں جو آٹے پر لکھا گیا ہے۔اس کے بعد شو کو ایک خاص طریقے سے چتا پر رکھا جاتا ہے۔پھر سوگواران واپس لوٹتے ہیں، دریا میں نہاتے ہیں، دریا کے کنارے تھوڑی سی آگ جلاتے ہیں، سات بار اس کے گرد طواف کرنے کے بعد اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

تیسرے دن متوفی کا بیٹا اپنے باپ کی راکھ اور چند ہڈیاں جمع کر کے لاتا ہے جنھیں پھول کہا جاتا ہے۔انھیں گنگا یا گنگہ بل (یعنی ایک جھیل میں بہائے جانے تک گھر ہی میں رکھا جاتا

ہے۔ گنگہ بل جھیل کے بارے میں یقین ہے کہ اس کے پانی میں بھی گنگا کی خاصیت موجود ہے۔

جب کسی مردہ ہندو کی ارتھی کو شمشان گھاٹ لے جایا جاتا ہے تو اسے ایک جگہ لٹایا جاتا ہے اور جو مختصر رسومات ادا کی جاتی ہیں انھیں یہاں پر مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

پہلے پہل تین الگ الگ جگہوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جن پر کلوشہ نام کے چراغ رکھے جاتے ہیں۔ اس جگہ آٹھ بھیروؤں کی دُہائی دی جاتی ہے جو رُودرا یعنی موت کے دیوتا کے خدمت گار ہیں۔ کائنات کی آٹھویں قوت یعنی چیت شکتی نویں قوت بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دو جگہوں پر آگ جلائی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک کو ویدک اور دوسرے کو شیوک اگنی سادھان شکتی کہتے ہیں۔ اس آگ میں نذرانے ڈالے جاتے ہیں اور مُردے کے نروان یعنی مکمل سکون کے لیے پرارتھنا کی جاتی ہے۔

پھر آگ جلانے کی جگہ سے تھوڑی دوری پر ایک اور جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اسے صاف کیا جاتا ہے اور اس پر ایک منڈپ کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ اس جگہ کا احاطہ رنگین دھاگوں سے کیا جاتا ہے جو گٹھیوں سے چار اطراف میں باندھی جاتی ہیں۔ اس جگہ پر چراغ جلائے جاتے ہیں اور منتروں کی وساطت سے اجداد کی روحوں کو جگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر چتا پر شو رکھا جاتا ہے جس کا سر جنوب کی طرف کیا جاتا ہے کیونکہ ہندو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ پتر لوک یعنی آباو اجداد اسی طرف رہتے ہیں۔

اس کے بعد سب سے بڑا لڑکا یا قریبی رشتہ دار لکڑی سے تیار کردہ چتا کو آگ لگا دیتے ہیں۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اس وقت تک مرنے والے کا بھوت اس کے فانی باقیات پر منڈلاتا رہتا ہے اور وہ ان کے لیے ماتم کرتا ہے جنھیں اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ پھر اس کے پیارے بیٹے کو باپ کی چتا کو آگ لگانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ جب شو جل کر راکھ میں بدل جاتا ہے تو لوگ اس جگہ سے واپس گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

ایک عمر رسیدہ کشمیری ہندو وفات پائے تو اس کا ماتم کرنے کے لیے پیشہ ور نوحہ خوانوں کو معاوضہ دے کر بلایا جاتا ہے۔ ان میں اکثر خواتین ہی ہوتی ہیں۔ علی الصباح جب رشتہ دار اور خاص کر بڑا بیٹا مذہبی رسومات کی انجام دہی میں مصروف ہوتے ہیں تو رشتہ دار خواتین ایک کمرے

میں جمع ہو جاتی ہیں اور پیشہ ور نوحہ گر کی سربراہی میں زور زور سے نوحہ کرتی ہیں۔ یہ سلسلہ پہلے دس دن تک جاری رہتا ہے اور اسے وان کہتے ہیں۔

اگلے دس دن تک بوڑھے متوفی کے لیے دریا کے کنارے رسومات انجام دی جاتی ہیں۔ وہاں پر پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے اور چاول کے گول نوالے دان دیے جاتے ہیں۔ شام کو پجاری ایک کتاب سے وہ حصہ پڑھتا ہے جس میں اعراف، جنت اور جہنم کی تصویر کشی کی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بچھڑی ہوئی ارواح کا عالم بالا میں دوبارہ جنم لینے سے قبل اُن کا حال بھی بیان کیا جاتا ہے۔ دسویں دن مرحوم کے بیٹے اپنی داڑھیاں مونڈ لیتے ہیں۔

گیارھویں روز منتروں کی باطنی قوت سے مرنے والے کی روح کو اُس کے اجداد کی دنیا میں بھیجا جاتا ہے تب تک اسے آوارہ گردی ہی نصیب ہوتی ہے۔

بارھویں دن ایک خاص رسم کا اہتمام ہوتا ہے جس سے آتما کی خواہشات کو پورا کیا جاتا ہے جو اب اس دنیا کے رشتوں سے آزاد ہو چکی ہے۔

تیرھویں دن ماتم کرنے والے داڑھیاں مونڈتے ہیں اور صاف یا نئے کپڑے پہنتے ہیں۔ ماتم کے پہلے بارہ دنوں میں کوئی غیر شخص اس ماتم زدہ گھر میں کھاتا یا پیتا نہیں ہے کیونکہ اُسے لاگ کا کارن سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد پہلے پندرہ روزہ، پھر ماہانہ اور آخر میں ایک سال کے بعد رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ ان مواقع پر شرادھ کرنے والے بیٹے کی حاضری ضروری مانی جاتی ہے۔ مرحوم کے نام پر پانی ایک خاص طریقے سے چھڑکا جاتا ہے اور چاول کے گول نوالے دان کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مکان کے بیچوں بیچ آگ جلائی جاتی ہے۔

مرنے کے بعد ہندوؤں کے باردیگر جنم لینے کے بارے میں دو الگ الگ نظریے بیان کیے جاتے ہیں:

1۔ ہندو دھرم میں یہ یقین ہے کہ جب آتما پرانے جسم کو چھوڑتی ہے تو اسے دوسرا جسم دیا جاتا ہے جو انسانی، حیوانی یا کسی سبزی کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس پر کرم کا قانون نافذ ہوتا ہے یعنی مرنے والے نے اپنی زندگی میں کتنے اچھے یا برے کام کیے ہوں گے۔

2۔ آتما کو آلائشوں سے پاک ہونے کے لیے ارواح کی دنیا میں منتقل کیا جاتا ہے جہاں اسے ایک اور جسم دیا جاتا ہے جس میں اسے کچھ عرصے تک رہنے کی اجازت ہوتی ہے۔ پھر اس کی اخلاقی قدر و قیمت کے مطابق اسے اونچے اور بہتر مقامات کی طرف رجوع کرنے دیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے مخصوص رواج: کوئی ہندو صبح کو گھر سے نکلے اور اگر کوئی بوڑھی یا بدشکل عورت یا ایک کتا یا گدھا اس کے مقابل سے آجائے تو اسے یا تو واپس لوٹنا ہوگا یا وہ زبردست پریشانی میں مبتلا ہوگا جو اس کی بدقسمتی سے اسے لاحق ہوئی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ ان بیہودہ باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں یا یہ بہانہ بناتے ہیں کہ وہ ان کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

پونڈ (کشمیری) یا چھینک: توہم پرستوں کے سامنے اگر کسی نے چھینک ماری تو وہ کوئی کام ہاتھ میں نہیں لیں گے۔ چند شرارت پسند دوسروں کو چڑانے کے لیے اپنے نتھنے میں گھاس کا ایک تنکا ڈال کر جان بوجھ کر چھینکیں گے۔

کووؤں، الوؤں اور چیلوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے جبکہ بلبلوں اور چڑیوں کو اچھی قسمت والی سمجھا جاتا ہے۔ بلبل کو ایک قاصد پرندہ مانا جاتا ہے جس کی چہچہاہٹ کو مہمان کی آمد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب کوئی شدید بیمار ہو جائے تو اس کے رشتہ دار ایک قربانی دینے کی قسم کھاتے ہیں۔ پجاری کے سامنے ایک موٹا تازہ دُنبہ لایا جاتا ہے جو مریض کا باپ اس کے سپرد کرتا ہے۔ پھر یا تو اسے مارا جاتا ہے یا کسی جنگل میں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن ایسا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اس قربانی کو ہندو اصطلاح میں راز ہ کٹھ کہتے ہیں۔

جب چیچک کی بیماری پھوٹتی ہے تو اس کی وجہ اس وبا کی دیوی شتلی ماں کی ناراضگی بتائی جاتی ہے۔ کسی کے جسم پر چیچک نمودار ہونا ایک خطرناک صورت حال کا اعلان ہوتا ہے لہٰذا متاثرہ کی ماں قسم کھاتی ہے کہ اس بلا کے ٹلنے کے بعد وہ ایک بکری یا گدھی دیوی کو نذر کرے گی۔ مگر اب تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ وہم معدوم ہوتا جا رہا ہے جو اسے دفع کرنے کے لیے ٹیکے کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح بے چاری شتلی دیوی کو شکست فاش نصیب ہو رہی ہے۔

سورج یا چاند کو گرہن لگ جائے تو ہندو برت (روزہ) رکھتے ہیں۔ گرہن کے دوران

شرادھ کرتے ہیں اور چاول اور روپے خیرات میں بانٹتے ہیں۔اس موقعے پر حاملہ عورتوں کو باہر جانے یا کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں۔اس تعلق میں کہا جاتا ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو حاملہ کے ہونے والے بچے کے جسم پر داغ نکلے ہوں گے۔مرد اگر کام سے فارغ ہیں تو وہ زیادہ وقت پوجا میں گزارتے ہیں۔گرہن سے پہلے جو کھانا تیار کیا جاتا ہے، گرہن کے بعد اسے استعمال نہیں کیا جاتا کیونکہ مانا جاتا ہے کہ اس دوران سورج یا چاند سے ناپسندیدہ ذرّات خارج ہوتے ہیں۔

سورج گرہن یا چاند گرہن کے بارے میں دو طرح کے نظریات موجود ہیں:

1۔ایک یہ کہ راہو یا کیتو جو دو ستارے ہیں سورج یا چاند کو نگلنے کی تاک میں لگے ہوتے ہیں۔

2۔یہ محض ایک سایہ ہوتا ہے جسے چھایاماتر کہتے ہیں۔

ایک اور عقیدہ سنسکرت جاننے والے رکھتے ہیں۔اولین نظریہ صرف ان کا ہے جو روایت یا لوک ادب پر یقین رکھتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں تحصیل ناگام (قدیم نام: ناگاراما) میں زمین کا ایک کریوہ دامودر اُدھار کے نام سے موجود تھا۔وہاں کے بادشاہ دامودر کے بارے میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ آج تک موجود ہے۔کہتے ہیں کہ بادشاہ نے اس جگہ ایک شہر بنایا۔یہاں تک پانی لانے کے لیے اس نے ایک بڑا باندھ تعمیر کروایا جسے گُڈاستین کہتے تھے۔اسے ایک مافوق الفطرت طاقت نے بنوایا تھا۔ایک دن جب بادشاہ اس میں نہانے کے لیے گیا تو اس کی ملاقات چند بھوکے برہموں سے ہوئی جنھوں نے اس سے کھانا مانگا۔بادشاہ نے ان سے کہا کہ وہ نہانے سے پہلے ان کی التجا قبول نہیں کرے گا۔برہموں نے اسے بد دعا دی اور وہ ایک سانپ بن گیا۔تب سے آج تک اس بدنصیب بادشاہ کو لوگ سانپ ہی کی شکل میں دیکھتے ہیں جو پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر در بدر پھر رہا ہے۔اس کے لیے کی گئی بد دعا زائل نہیں ہوگی جب تک کہ وہ ایک دن میں پڑھی گئی پوری کی پوری رامائن نہ سنے چونکہ یہ ممکن نہیں لہٰذا اس کے حق میں معافی کی کوئی امید بھی نہیں۔کہا جاتا ہے کہ کئی برہموں نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی مگر وہ سبھی ناکام رہے۔لوگ اس حکایت سے سارے کشمیر میں اچھی طرح واقف ہیں۔نزدیکی گاؤں کے باشندے اُس طرف

اشارہ کرتے ہیں جسے سترس ٹینگ اُدھار یا دامودر کے محل کا مقام کہتے ہیں۔

مسلمانوں کے رواج: ان کی شادیاں عام طور پر ایک میاں جی طے کرتا ہے جونشانی (بندھن) کے لیے کوئی موزوں دن مقرر کر لیتا ہے۔ اس روز مہندی، سونا اور چاندی کے زیورات میاں جی کے ہاتھوں دلہن کو بھیجے جاتے ہیں۔ دلہن کا باپ دلہے کے باپ اور اس کے ساتھیوں کو دعوت پر بلاتا ہے۔ اسی دن نکاح خوانی یا شادی کا معاہدہ کیا جاتا ہے اور مہر مقرر ہوتا ہے۔ نکاح کی دستاویز دلہن یا دلہے کی باہمی مرضی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی لہٰذا ان دونوں کی ترجمانی ان کے نزدیکی رشتہ دار کرتے ہیں۔ دلہن کا باپ قاضی، مسجد، پولیس اور دیگر لوگوں کو پیسے دیتا ہے۔ اگلے دن دلہن کا باپ روٹیاں اور پکا ہوا گوشت دلہا کے باپ کو بھیجتا ہے۔

اس نکاح خوانی کے چند روز بعد شادی کی باقاعدہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اگر لڑکے کی شادی ہو تو یہ تین دن تک جاری رہتی ہے اور لڑکی کی صورت میں دو دن تک شادی کا جشن منایا جاتا ہے۔ حنا بندی پہلے ہی دن ہوتی ہے پھر دونوں فریقین دوستوں اور رشتہ داروں کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ مہندی اور زیورات دلہن کو بھیجے جاتے ہیں۔ اس تقریب پر جن خواتین کو ضیافت کی دعوت دی جاتی ہے وہ اپنے ہاتھ پاؤں مہندی سے رنگتی ہیں۔ عورتیں اس خوشی کے موقعے پر شب و روز خوب چہکتی، مہکتی اور گا گا کر وجد میں آجاتی ہیں۔ اس کے بعد شادی (کشمیری میں ہنہ دول) کی تقریب ہوتی ہے جس میں دلہن کے باپ کی طرف سے دلہے اور اس کے ساتھیوں کو بھرپور ضیافت کھلائی جاتی ہے۔ شادی کی بارات عام طور پر شام کے وقت دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ مشعل بردار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی مشعلوں کو مختلف رنگوں میں رنگا ہوتا ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں یا ہانجیوں کی شادیوں کے دن باراتی ایک جلوس کی شکل میں دن ہی کو تقریباً سارے شہر اور بڑے بازاروں کا چکر لگاتے ہیں۔ ان کے ہمراہ ایک کشمیری بھانڈ ہوتا ہے جو یہ بتانے کے لیے بہت زیادہ شور و غل مچاتا ہے کہ یہ کسی بہت بڑی شخصیت کے بیٹے کی شادی کا دن ہے۔

دلہن کے گھر میں مہمانوں کے استقبال کی خاطر ایک بہت بڑے ہال کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس میں قالینوں کا فرش کیا جاتا ہے اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے جاتے ہیں۔ دلہے کے لیے ایک مسند تھوڑی سی اونچائی پر سجایا جاتا ہے۔ قاضی سے شادی کی رسم مذہبی طور پر انجام

دیتی ہے۔وہ دولہے کے سامنے اپنی نشست سنبھالتا ہے۔قاضی نکاح کی دستاویز پڑھتا ہے اور دلہن کے لیے مہر کی رقم طے کی جاتی ہے۔اس کے بعد قرانی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے اور قاضی دلہے دلہن دونوں کو ان کی ازدواجی زندگی میں ان کے مذہبی، اخلاقی، سماجی اور دنیوی فرائض اور ذمہ داریوں سے کماحقہ آگاہ کرتا ہے۔اس کے ساتھ ہی قاضی لڑکے اور لڑکی سے تین بار سوال کرتا ہے کہ کیا انھیں ایک دوسرے کو اپنا جیون ساتھی بنانا منظور ہے؟ دلہن کو دلہے کے باپ کی طرف سے کپڑوں کا تحفہ دیا جاتا ہے۔پھر ہر ایک پر شیرینی نچھاور کی جاتی ہے جس کا ایک حصہ تقسیم کیا جاتا ہے اور باقی مجلس میں حاضر لوگ اٹھا اٹھا کر جمع کرتے ہیں۔

اس معاملے پر کشمیری مسلموں کا فرقہ بٹا ہوا ہے۔کچھ کہتے ہیں کہ یہ شیرینی تقسیم کی جانی چاہیے اگر چہ دوسروں کا خیال ہے کہ اسے پھینک دینا چاہیے۔اس تضاد نے کسی حد تک اس فرقے میں فکری اختلاف پیدا کیا ہے۔

دلہن دلہے کے گھر میں سات دن تک رہتی ہے۔اس دوران دلہن کے باپ کو اپنے سمدھی کے لیے نئے کپڑے اور ضیافتیں بھیجنا ہوتی ہیں۔شادی کے تیسرے دن خشک چائے، کھانڈ اور روٹیاں دلہے کو بھیجی جاتی ہیں جنھیں دلہے کے دوستوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پانچویں دن بھی پکا ہوا گوشت اور نان بھیجے جاتے ہیں۔ساتویں روز بہت زیادہ مقدار میں پکا ہوا گوشت اور خاص طور پر گھی میں تیار کردہ ڈھیر ساری میٹھی روٹیاں بھیجی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ نئے ملبوسات دلہے کی بہنوں کے استعمال کے لیے بھی کپڑے بھیجے جاتے ہیں۔یہ تحفے بے حد اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ اسی پر دلہن کے مستقبل کی خوشحالی کا دارومدار ہوتا ہے۔دُلہے کی بہنوں کو اگر یہ تحفے نہ دیے جائیں تو دلہن کی زندگی اجیرن کی جاتی ہے، اسے طرح طرح کے طعنے دیے جاتے ہیں اور سسرال میں اسے کبھی سکھ نصیب نہیں ہوتا۔دلہے کے لیے بھی ایک قیمتی تحفہ بھیجا جاتا ہے جو عام طور پر ایک اعلیٰ قسم کا پشمینے کا شال ہوتا ہے۔

جب کوئی مسلمان بسترِ مرگ پر ہوتا ہے تو اس کے رشتہ دار اور وہ سارے جو وہاں حاضر ہوں اس کے سرہانے بیٹھ کر کلمہ پڑھتے ہیں اور اگر ممکن ہو تو مرنے والے سے بھی کلمہ پڑھنے کو کہا جاتا ہے۔اس شخص کی موت کے فوراً بعد اس کی آنکھوں اور منہ کو بند کیا جاتا ہے۔پھر رشتہ دار

نزدیکی مسجد سے ایک تابوت لاتے ہیں جس پر اس کی میت کو رکھا جاتا ہے جبکہ اس کا چہرہ آسمان کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ پھر میت کو گرم پانی سے نہلایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر غسل دینے کے کمرے میں زمین پر سوراخ بنایا جاتا ہے تاکہ پانی ہر طرف پھیل نہ جائے۔ میت کو کوئی بھی واقف کار غسال غسل دے سکتا ہے۔ دریں اثنا کفن تیار کیا جاتا ہے جو تین حصوں لفافہ، ازار اور قمیض پر مشتمل ہوتا ہے۔ مردے کو اسی کفن میں لپیٹا جاتا ہے۔ پھر اس پر خوشبوؤں کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ میت کو تابوت میں رکھنے کے بعد اُس پر ایک کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ جو عام طور پر کسی زیارت گاہ سے لایا جاتا ہے۔ پھر جنازے کو کندھوں پر اٹھا کر کسی زیارت گاہ کے سامنے رکھا جاتا ہے تاکہ اس کا چہرہ شمال کی طرف ہو۔ وہیں پر جنازہ پڑھا جاتا ہے جو چار جزؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے حصے میں خدا کی شان اور اس کے پیاروں کی مدح سرائی کی جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں پیغمبرﷺ کی تعریف وتحسین ہوتی ہے۔ تیسرے جزو میں مرحوم کے گناہوں کے لیے معافی کی التجا کی جاتی ہے اور آخری حصہ بھی حاضرین کے لیے دعائے خیر کے لیے وقف کیا جاتا ہے۔ اس جنازے کا اختتام اللہ اکبر کی تکبیر سے ہوتا ہے۔ میت کو قبر کے دہانے پر لے جایا جاتا ہے اور تابوت سے کپڑا ہٹایا جاتا ہے جو قبر کھودنے والے کو دیا جاتا ہے۔ میت کو قبر میں اس طرح لٹایا جاتا ہے کہ اس کا سر کعبہ کی طرف ہو۔ بعد میں قبر کو مٹی سے بھرا جاتا ہے اور تابوت مسجد کو لوٹایا جاتا ہے۔

وفات کے بعد آنے والے جمعہ تک رشتہ دار اور احباب ہر صبح مقبرے پر جا کر قرآنی آیات اور مرحوم کا فاتحہ پڑھتے ہیں۔ وہ مرحوم کے گھر جاتے ہیں جہاں چائے اور روٹی کی شکل میں ان کی تھوڑی بہت خاطر داری کی جاتی ہے۔ مُلا اس موقعے پر اپنا اہم حصہ ادا کر کے خاصا معاوضہ وصول کرتا ہے۔ قبر کھودنے والے کو ہر دن کھانا دیا جاتا ہے اور جمعہ کو اسے کچھ تیل بھی دیا جاتا ہے۔ مرحوم کی قبر پر پھر رشتہ دار اور دوست حاضری دیتے ہیں جبکہ وفات پانے والے کے بیٹے یا بیٹی کو زیب تن کے لیے پوشاک دی جاتی ہے۔

مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ میت کو قبر میں اتارنے کے بعد نکیر اور منکر نام کے دو فرشتے اس کے پاس آ کر یہ سوال کرتے ہیں:

1۔ تمھارا خدا کون ہے؟

2۔ تمھارا پیغمبر کون ہے؟

3۔ تمھارا مذہب کیا ہے؟

اگر مُردے نے ان سوالات کے صحیح جواب دیے اور کہا کہ اللہ میرا خدا ہے۔ محمدؐ میرا پیغمبر ہے۔ اسلام میرا مذہب ہے، تو وہ خدائی رحم دلی کا مستحق ہوتا ہے اور اسے جنت کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کا جواب غیر مطمئن ہے تو اس صورت میں خدا کی ناراضگی اس کے حصے میں آتی ہے اور اسے جہنم میں عذابِ الٰہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مسلمان اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ جہنم کے اوپر ایک راستہ ہے جسے صراط کہتے ہیں۔ یہ ایک بال سے بھی پتلا اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اسے ہر ایک کو پار کرنا ہوگا۔ نیک اور باایمان لوگ اسے پار کریں گے مگر گناہ گاروں کو اس سے نیچے دھکیل کر جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

جب کوئی شخص اپنے دشمن سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک ایسے برہمن پجاری کی خدمات حاصل کرتا ہے جو کالا جادو جانتا ہو۔ اس کام کے عوض وہ بھاری معاوضہ طلب کرتا ہے۔ برہمن اپنے شکار کو مثالی شکل دینے کی خاطر مٹی یا موم کا ایک پتلا بناتا ہے جس میں کیل یا تلوار سے جسم کے اُس حصے میں چھید کیا جاتا ہے جہاں اسے ایک مہلک زخم لگانا مقصود ہو۔ یہ کام خفیہ طور پر چھومنتر کے ذریعہ انجام کیا جاتا ہے اور بعد میں پتلے کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے۔

پادری ٹی۔ آر۔ واڈے نے اپنی ڈائری میں اس بارے میں اُن افراد کے حوالے سے لکھا ہے جو اس پادری اور دوسرے پادری رابرٹ کلرک اور برطانوی ریزیڈنٹ سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ ان تینوں کے خاتمے کے لیے تین جگہ آگ جلائی گئی لیکن غیر متوقع طور پر تینوں لمبی عمر پا کر دنیا سے اُٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ چھومنتر کی سازش کسی نہ کسی طرح ناکام ہو گئی تھی۔

دوسری جانب مجھے ایک ایسے امیر اور طاقتور شخص کے بارے میں معلوم ہوا جو اسی جادو کے ذریعہ اپنے سے بھی زیادہ طاقتور اور دولتمند شخص کو موت کی نیند سُلانا چاہتا تھا۔ یہ شخص واقعی کچھ عرصے کے بعد معدے میں زبردست تکلیف کی وجہ سے مر گیا۔ مجھے اندازہ ہے کہ برہمن پجاریوں نے اس کامیابی پر جشن منایا ہوگا اور یہ بھی کہ ایک اچھی خاصی رقم اُن کے ہاتھ لگ گئی ہوگی۔

مجھے ایک ایسا ہی واقعہ یاد آتا ہے۔ایک صاحب دل شخص چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کی جائیداو کے بہت بڑے حصہ کا وارث بن جائے لیکن کسی اور کا بیٹا اس کے راستے کا کانٹا بن گیا۔لہٰذا اس نے چند پجاریوں سے رابطہ کیا۔انھوں نے اسے بتایا کہ وہ ایک دیوی کو اپنے ملک میں لائے اور اسے ایک مندر میں رکھے۔پھر اسے دیوی کی پوجا کے ساتھ ساتھ اس میں نقد رقومات کو بھی شامل کرنا ہوگا۔لیکن یہ پوجا تب تک کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جب تک کہ وہ مطلوبہ لڑکے کی قمیض، چند بال اور انگوٹھے اور انگلیوں کے ناخن نہ لائے جنھیں وہ دیوی کے چرنوں میں رکھے گا۔

اس شخص نے یہ ساری شرائط پوری کیں۔دیوی کو اس کے مندر میں لایا گیا اور اس کی پوجا کی گئی۔دیوی نے یہ قمیض اور ناخن خود پر لگائے اور بھاری رقم بھی تقسیم کی گئی۔

پھر جب مقررہ وقت آ گیا اور موت کا فرشتہ بھی آ گیا لیکن وہ دولتمند شخص ہی کو ساتھ لے گیا اور مطلوبہ لڑکا بچ گیا جو ابھی زندہ ہے۔مجھے یہ سوال کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ پجاریوں نے ملک الموت کی غلطی کے بارے میں کس طرح صفائی پیش کی ہوگی؟

اہل کشمیر حد سے زیادہ توہم پرست ہیں۔لہٰذا وہ ایک دوسرے کو تیز نگاہوں سے جانچتے اور اس کے دل میں اترنے میں لگے رہتے ہیں۔

اس مرحلے پر میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ سری نگر کے باسی زبردست پریشانی میں مبتلا ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ شہر میں حیوانی شکل وصورت کی ایک بلا وارد ہوئی ہے جسے اگرچہ کسی نے نہیں دیکھا ہے البتہ کئی لوگوں کا بیان ہے کہ اسے دیکھا گیا ہے۔اب وہ ایک دوسرے سے کہتے پھرتے ہیں کہ اس بلا نے بچوں اور عورتوں پر حملے کیے ہیں جن میں ان کے چہروں اور چھاتیوں کو نوچ لیا گیا ہے۔یہ رات کے وقت گھروں میں داخل ہوتی ہے۔کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دریا سے نکلتی ہے۔اور اس کی شکل ایک بڑی بلی سے ملتی جلتی ہے۔نتیجے کے طور پر ہر گھر والا سر شام ہی دروازے بند کرتا ہے۔اور پھر ٹین اور دوسرے برتن بجا بجا کر حیوان کو بھگانے لگتے ہیں۔اس حوالے سے جو لوگ ایسی بلاؤں پر یقین رکھتے ہیں ان کی راتیں جاگتے جاگتے گزرتی ہیں۔

چند سال پہلے یہ بار۔ پھیلی کہ دریا میں کوئی خطرناک بلا چھپی ہوئی ہے۔اس افواہ سے اسکول گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند کیے گئے۔ہم جب واپس سری نگر لوٹے تو پتہ چلا کہ خوف

کے مارے دریا میں کسی نے نہانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ میں نے طلبا سے پوچھا کہ کیا وہ اس بلا کو ہلاک کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ تیار ہیں۔ میں نے ان سب سے کہا کہ وہ مجھے شہر کے تین نیل تک تیرنے کے لیے علی الصباح تین بجے امیرا کدل یعنی پہلے پل پر ملیں اور ساتویں پل یعنی صفا کدل تک تیرتے رہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر بلا کا وجود واقعی صحیح ہے تو غالباً چند لڑکے اس کی بھینٹ چڑھ جائیں گے مگر شہری بچ سکیں گے۔

بعد دوپہر تین بجے ایک سو تیس لڑکے دریا میں کود پڑے۔ یہ نظارہ دیکھنے کے لیے لوگ دریا کے کناروں اور گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے کہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ اگلی صبح شہر باش دریا پر کپڑے دھور ہے اور نہار ہے تھے۔ کیونکہ یہ فرضی معاملہ ختم ہو چکا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بلا پہلی بلا کی نسل سے ہے۔ وہ پھر بھی اسکول کے طلبا کا انتظار کرتے ہیں جو چھٹیوں کے بعد واپس لوٹ کر آئیں گے۔

چودھواں باب

کشتی بنانے کا کام

کشمیری کشتیاں بنانے میں منفرد مہارت رکھتے ہیں اور اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ میں نے ہمیشہ کشتیوں اور کشتیاں بنانے میں دلچسپی لی ہے لیکن میں نے کشمیری جیسی کشتیاں اور کہیں نہیں دیکھی ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ کشمیری کشتیاں بنانے والے اپنے فن کو نوح کے زمانے سے متعلق بتاتے ہیں۔ جب کوئی چاول سے بھری ان بڑی کشتیوں کو دیکھتا ہے تو اسے بچپن میں نظروں کے سامنے آیا ہوا کشتی نوح کا غیر معمولی منظر پھر دکھائی دیتا ہے۔ اور اسے پھر ایک بار یہ خیال آتا ہے کہ اس کشتی کے پچھلے دروازے سے نوح پیغمبر بذات خود نکل کر باہر آئے گا۔ ایسا خاص طور پر اُن دنوں میں ہوتا ہے جب کشمیر میں سیلاب آیا ہو اور سارا ملک پانی میں ڈوبا ہوا ہو۔

جب میں پہلی بار کشمیر آیا تو اُس وقت لکڑی کاٹنے کا آرا موجود نہیں تھا۔ سارا کام کلہاڑیوں اور تیشوں سے کیا جاتا تھا۔ کشتی ساز دیودار کے جنگلوں میں جا کر ایک بہت بڑے درخت کا انتخاب کر لیتا تھا جو ایک سو فٹ اونچا اور تین سے چار فٹ چوڑا ہو۔ اس درخت کو گرا کر اس کے دو حصے کیے جاتے تھے۔ پھر ان دونوں حصوں کی تراش خراش کر کے انھیں کشتی کے حجم کے برابر کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں دیودار جیسے درخت کی لکڑی کا ضیاع نہایت قابل افسوس تھا لیکن آرا نہ ہونے کی

وجہ سے یہ کام اسی طرح کیا جاتا تھا۔

ان حصوں کے سروں پر چھید کیے جاتے جن میں ایک جنگلی درخت کی شاخوں سے بنی رسی ڈال کر انھیں میلوں کا فاصلہ طے کر کے دریا تک گھسیٹا جاتا تھا۔ یہ حصے پانی میں دو تین سال تک ڈبوئے رہتے تاکہ ان میں مطلوبہ سختی اور مضبوطی پیدا ہو سکے۔ ان دو حصوں سے کشتی کے اطراف بنانے کا کام لیا جاتا تھا جن میں سے ہر ایک ستر فٹ لمبا ہوتا تھا۔ کشتی سازوں کو اس کا فرش اور چھت وغیرہ بنانے کے لیے مزید تین یا چار درختوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے لیے آروں سے کٹے ہوئے لکڑی سے یہ درخت بدرجہا بہتر مانے جاتے تھے کیونکہ ان سے بنی کشتیاں کم از کم چالیس سال تک سالم اور صحیح رہتی تھیں اور ان پر روغن چڑھانے یا تار کول ملنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ اب جو کشتیاں بنتی ہیں وہ قیمتی لکڑی سے آروں کے کارخانوں سے نکلتی ہیں اور وہ پہلے کی بنی ہوئی کشتیوں سے کم پائدار ہوتی ہیں۔

کشتی بنانے والا جب لکڑی کے ترشے ہوئے حصوں کو کنارے تک گھسیٹ کر لے جاتا ہے تو وہ زمین کا ایک ہموار ٹکڑا ڈھونڈ کر کشتی کی اصل تعمیر کا کام شروع کرتا ہے۔ یہاں سے وہ بغیر کسی دباؤ کے کشتی کو کھینچ لیتا ہے۔

کشتی کی دوسری قسموں میں بحو اور کوتھبار ہیں جو معمولی قسم کی رہائشی کشتی یعنی ڈونگے یا شکاروں سے بنائے جاتے ہیں۔ ان کا فرش تین حصوں میں بنتا ہے جبکہ ڈونگوں اور شکاروں کا فرش صرف ایک ہی حصے پر مشتمل ہوتا ہے۔

بحو کی تعمیر کے حوالے سے زمین کا ایک ٹکڑا منتخب کیا جاتا ہے۔ اس پر چار یا پانچ شہتیر ایک قطار میں بچھائے جاتے ہیں۔ جو کشتی کے اُن تعمیری حصوں کے لیے ایک بنیاد کا کام انجام دیتے ہیں جنھیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنا مقصود ہو۔ پھر ان شہتیروں کو لوہے کے جوڑوں یا کیلوں سے جوڑا جاتا ہے۔ یہ جوڑ تین سے چار انچ چوڑے ہوتے ہیں تاکہ ان کی پکڑ مضبوط ہو۔ انھیں تپتے لوہے کی شکل میں کوٹا جاتا ہے۔ پھر ان پر فوراً پانی ڈالا جاتا ہے تاکہ ان کی حدت سے لکڑی جل نہ جائے۔ جب وہ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے کو ساتھ ساتھ جکڑ رکھا ہے۔ ان جوڑوں کے درمیان بارہ انچ کی دوری رکھی جاتی ہے اور جہاں

کہیں کوئی دراڑ نظر آئے اسے کیلوں سے بھرا جاتا ہے۔ جب اس کے فرش پر کام ہوتا ہے تو دوسرے لوگ فرش کے ٹکڑوں کو یکجا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

جب کشتی اپنی عمر کا وقت پورا ہونے پر سڑ جاتی ہے تو اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر ان سے ایک چھوٹی ناؤ بنائی جاتی ہے۔ اس طرح جب بھی چھوٹی کشتیاں خستہ ہو جاتی ہیں تو بعد میں وہ جلانے کے کام آتی ہیں۔

میں نے کشمیر میں اپنے قیام کے دوران کم از کم پچاس کشتیاں بنتی دیکھی ہیں جن میں شکاروں سے لے کر ہاؤس بوٹ تک سبھی جسامت اور درازی کی کشتیاں شامل ہیں۔

جب میں 1891 میں وارد کشمیر ہوا میں نے دیکھا کہ یورپی طبقے کا ایک بوٹ کلب ہے۔ اس کا سیکریٹری کرنل سارٹوریس کشمیر سے جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس کی جگہ پُر کروں اور چند اچھی کشتیاں بناؤں۔ اگر چہ مجھے کشتی سازی کا بہت کم علم تھا میں نے ہر قیمت پر ایسا کرنے کی ٹھان لی۔ پھر چند ایسے دوستوں کی مدد سے جو کشتی سازی کا فن جانتے تھے میں نے نجاروں کو لایا جنھوں نے کشتیاں بنائیں اور پانچ پاؤنڈ خرچ ہو گئے گر چہ ان پر روغن چڑھانے پر اس سے زیادہ خرچہ آ گیا۔

مجھے یاد ہے کہ اس کام میں مجھے مشکلات بھی درپیش آئیں۔ ایک دن کوئی ترکھان کام پر نہیں آیا اور اگلے چند دنوں تک یہی صورت حال رہی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پولیس ترکھانوں کی پکڑ دھکڑ میں لگی ہے کہ انھیں گلگت بھیجا جائے جہاں انھیں ایک زیرِ تعمیر پل پر کام کرنا تھا۔ اس سفر کے لیے کوئی ترکھان تیار نہیں تھا کیونکہ انھیں گلگت تک کی سڑک کا حال بد معلوم تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کئی ایسے لوگ جنھیں گلگت بھیجا گیا پھر کبھی لوٹ کے واپس نہیں آئے۔

پولیس میرے استاد ترکھان کو پکڑنے کے لیے آئی لیکن وہ بھاگنے میں کامیاب ہوا اور جھیل ڈل میں ایک کشتی میں چھپ گیا۔ پولیس نے اس کی بیوی کو یرغمال بنانے کے لیے اسے حراست میں لیا۔ چونکہ یہ شخص بہادر تھا، وہ اپنی بیوی کو چھڑانے کے لیے نکلا۔ اسے پکڑا گیا۔ چند روز بعد وہ میرے پاس کام کے لیے آ گیا۔ ایک عمر رسیدہ ترکھان تھا اور اس نے مشکل سے سفر طے کیا ہوگا۔ اس کے بعد دوسرے ترکھان سے بھی محروم ہوا کیونکہ اسے پکڑا گیا اور گلگت لے جایا گیا۔

ان ساری دقتوں کے باوجود ہمارا کام چلتا رہا۔ پھر میں نے تین چھوٹی کشتیاں اور ایک آرام دہ رہائشی کشتی مہیا کی جسے رندان کہتے ہیں۔

چونکہ میں ان کشتیوں سے مطمئن نہیں تھا لہٰذا جب میں انگلستان گیا تو وہاں میں نے آکسفورڈ میں دو چپوؤں والی ایک اور کشتی دریائے ٹیمز پر بنوائی۔ جسے میں نے کشمیر بھجوانے کی کوشش کی۔ پھر میں نے اس کشتی کو اپنے ساتھ لایا تا کہ میرے دوست بھی ایسی ہی کشتیاں تیار کریں۔ پھر ہم کشمیر کی جھیلوں میں کئی ایسی خوبصورت انگریزی کشتیاں ڈالیں گے۔ لیکن مجھے یہ جان کر نا امیدی ہوئی کہ بجائے اس کے کہ وہ اسے ایک مثالی کشتی قرار دے کر مزید ایسی کشتیاں اپنے ترکھانوں سے بنواتے، ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے کہا۔ ''ارے واہ! کیا شاندار کشتی آپ کو ملی ہے۔ کیا آپ یہ مجھے عاریتاً دے سکتے ہیں؟'' اس ردعمل کے پیش نظر میں نے پھر آٹھ چپوؤں والی ایک کشتی لائی کیونکہ یہ میرا خواب تھا کہ میں ایسی ہی کشتیوں کو جھیل ڈل کے دل نشین پانیوں پر جھومتے ہوئے دیکھوں۔

صنوبر کے درختوں کے جنگلوں میں چھٹیاں منانے کے دوران میں ایک ایسے درخت کی تلاش میں لگ گیا جس کا تنا شاخوں سے لدا ہوا نہ ہو، جو زمین سے تیس فٹ کی اونچائی پر تراشا ہوا ہو اور جس کی لمبائی ساٹھ فٹ ہو۔ مجھے گانٹھوں سے پاک تنا چاہیے تھا۔ آخر کار مجھے ایسا درخت مل ہی گیا۔ میں نے محکمۂ جنگلات سے اسے خریدنے کی اجازت حاصل کر لی۔ درختوں کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کاٹے جانے کے بعد نیچے گرانے کے برعکس زمین ہی میں ایستادہ رہنے سے زیادہ مضبوطی پاتے ہیں۔ میں نے بھی اس درخت کی احاطہ بندی کر کے اسے دو سال تک جوں کا توں رہنے کے لیے چھوڑ دیا۔ جب میں دوسری بار چھٹیاں منانے کشمیر آیا تو میں نے چند لکڑ ہاروں کو کام کے لیے بلایا اور جنگل کے اہل کار کو اس درخت سے کم از کم تیس فٹ صاف اور بہترین لکڑی کا حصہ نکالنے کے لیے کہا۔

اس درخت سے تیس فٹ لمبا تنا اور باقی حصے بارہ فٹ کے چپو بنانے کے لیے کاٹنے کی اجازت لے کر میں نے لکڑ ہاروں پر ہی اعتبار کیا ہوتا لیکن مجھے کچھ وقت کے لیے اسے روکنا پڑا۔ جب میں اُس جگہ پہنچا جہاں یہ درخت گرایا گیا تھا اور جب میں اس کے چپوؤں کے حصے

بارہ بارہ فٹ میں کٹے ہوئے دیکھنے لگا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یا تو لکڑ ہارے کا حافظہ کمزور ہے یا کوئی اور بات ہے کیونکہ ہم نے کئی بار جنگل کی خاک چھانی تھی تاکہ ہمیں مطلوبہ درخت مل سکے۔ پھر اس کی تار بندی بھی کی تھی اور وہ اسے سوکھ جانے کے لیے سال بھر دیکھتا رہا۔ اب جبکہ ہمیں ساٹھ فٹ کی دوڑ نے والی تختہ نما کشتی تیس فٹ کے بنیادی تختے پر مطلوب تھی۔ اس نے اسے چپوؤں کے لیے بارہ فٹ کی لمبائی میں کاٹا تھا جو میرے گھر کے درخت سے بھی حاصل کی جاسکتی تھی۔ لکڑ ہارا کم گو تھا لہٰذا اس نے میرے اس اعتراض کا جواب ہی نہیں دیا کہ اسے ایک ایسا ہی ثابوت درخت میرے لیے تلاش کر کے اپنی حماقت کا ازالہ کرنا چاہیے۔ وہ مجھے گھورنے لگا۔ پھر اس نے اپنی پگڑی سر سے اوپر اٹھائی اور سر کھجاتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ''صاحب! آپ میرے ساتھ آیئے''۔ میں وادی کی نچلی طرف اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہاں اس نے مجھے ایک درخت دکھایا جسے کاٹا گیا تھا اور جو میرے مطلوبہ درخت کے برابر کا قطر کا تھا۔ اس پر شاخیں بھی نہیں تھیں اور نہ اس میں کوئی گانٹھ دیکھی گئی۔ اس درخت کو کاٹ کر اسے چیرنے والوں کے لیے تیار کیا گیا۔ ہمیں لکڑی چیرنے والوں کو بیس میل دور سری نگر سے لانا پڑا۔ بالآخر سانچے تیار کیے گیے اور درخت کو ہمارے گھر تک دو سال کے لیے مضبوطی پانے کی غرض سے لے جایا گیا۔

گرمیوں میں میری پانچ ہفتے کی چھٹیاں جلدی آگئیں اور میں نے آٹھ کشتیاں بنانے کا ارادہ کیا مگر میرا ایک دوست بھی دریا میں ایک بڑی موٹر کشتی بنا رہا تھا اور اُس نے میرے ترکھان کو کام پر لگایا تھا۔ پھر جب اُسے جنگل میں میرا کام کرنے کی خاطر فراغت ملی تو میرے دوست نے اسے ایک اور ہفتہ اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ وہ اپنی کشتی اس کاریگر کے بغیر مکمل نہیں کرسکتا تھا۔ یہ ہفتہ بھی گزر گیا۔ لیکن اس نے پھر ایک اور ہفتے کی مہلت مانگی۔ اس بار میں نے دبے لہجے میں انکار کیا اور اب میرے پاس کشتی تیار کرنے کے لیے صرف تین ہفتوں کا وقت باقی رہ گیا تھا۔

اب تک موسم خوشگوار تھا۔ اس میں تبدیلی آگئی اور پھر برابر تین ہفتوں تک پانی برستا رہا۔ چونکہ کشتی کھلے آسمان تلے بنائی جارہی تھی یہ کام زبردست مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے جاری رکھا گیا۔ بہر حال کشتی تیار ہوگئی اور سولہ آدمیوں کی مدد سے اسے جنگل سے بیس میل دور

سری نگر میں دریا تک لے جایا گیا۔ اب میرا یہ خوبصورت خواب شرمندۂ تعبیر ہو چکا تھا۔

ہر کشتی کی ایک اپنی انفرادیت ہوتی ہے اور اس کی ہر ایک کو تعریف اور عزت کرنی چاہیے۔

اس مخصوص کشتی میں دوسری دوڑنے والی کشتیوں کی مقابلے میں ایک خاصیت یہ تھی کہ اس نے ایک بار سارے کے سارے کشتی رانوں کو پانی میں دھکیل دیا جس سے ایک مزاحیہ صورت حال پیدا ہو گئی۔

ہم جھیل پر کشتی رانی کی تربیت پا رہے تھے اور ہم نے ایک خاتون معالج کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ وہ بیچ میں نشست پر بیٹھ گئی اور میں اس کے عقب میں کھڑے ہو کر چپو چلانے والوں کو تربیت دیتا رہا۔ میں انھیں یہ بتا رہا تھا کہ اگر سامنے سے اچانک دوسری کشتی ٹکرائے جانے کی حالت میں آجائے تو کشتی کو کیسے فوراً روکا جا سکتا ہے اور نیم تربیت یافتوں کے لیے یہ آسان کام نہیں۔ مجھے اس بات کا علم تھا اور میں نے آرام سے کشتی کی رفتار کم کر کے اسے چلایا اور جہاں صاف راستہ نظر آیا تو اسے تیز رفتار سے آگے بڑھایا۔ اس طرح ہم اس رفتار میں بھی بغیر کسی دقت کے روک سکتے تھے۔

اب ایک آخری آزمائش باقی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ انھیں ہوشیار رہنا چاہیے اور جب ان کو اشارہ ملے تو بہ یک وقت اپنے سارے چپو پانی میں ڈبو دیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ میری بات سمجھ چکے ہیں۔ میں نے انھیں حکم دیا۔ ''تیار رہو! تیار رہو! چلاؤ چلاؤ! زور زور سے''۔ اب ہم دوڑ رہے تھے۔ میں نے انھیں دوبارہ ہدایت دی۔ ''آہستہ آہستہ اور رُک جاؤ''۔ لیکن ان میں سے سبھی اُس لمحے کام نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشتی اُلٹ گئی۔ وہ سبھی لڑھک گئے۔ میں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو چکا تھا اور میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

اب میں بھی ان کے ساتھ جھیل میں غائب ہو چکا تھا۔ یہ ایک تکلیف دہ صورت حال تھی کیونکہ میرے منہ میں ہوا کی نالی میں پانی بھر چکا تھا۔ میں مشکل سے باہر آسکا۔

پانی میں تین کشتی ران کنارے لگنے یا ناؤ میں سوار ہونے کے لیے غوطے کھا رہے تھے اور باقی بھی ادھر اُدھر تیر رہے تھے۔ ہم نے کشتی کو مضبوطی کے ساتھ روکا اور پھر ایک امدادی ناؤ آگئی جس نے ڈاکٹر کو کنارے پر لے جا کر اُس کی جان بچائی۔ پھر ہم نے ناؤ کو صحیح انداز میں پلٹا۔ اس میں بھرا

ہوا پانی ہاتھوں سے باہر پھینکا اور ایک ایک کر کے اپنی نشستوں تک پہنچ گئے۔ پھر میں نے حکم دیا۔ ''تیار ہو جاؤ۔ کیا تم تیار ہو؟ چلو کشتی کو آگے بڑھاؤ''۔ پھر ہم خدا خدا کر کے محفوظ جگہ پر پہنچ گئے۔

بعد میں ہم اپنے کشتی رانوں کو مزید تربیت دینے میں لگ گئے اور ہمیں مطلوبہ نتیجہ بھی حاصل ہوا۔ لیکن ہم نے اس کشتی پر سواریوں کو نہیں بٹھایا کیونکہ اُن کی موجودگی کو شاید ہمارے کھیون ہار سنبھالنے کی پوری صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

مدارس کے لیے کشتیاں بنانے کے لیے میں نے دو کشتیاں تیار کیں جن میں پندرہ کشتی ران سما سکتے تھے لیکن عام شکاروں اور کشمیری طرز کے چپوؤں کے برعکس مجھے ان کی شکل وصورت اور پیڈل تبدیل کرنے تھے کیونکہ کشتی بان نہ صرف پیڈل بلکہ یہ کشتیاں بھی چرا سکتے تھے اور انھیں بازیافت کرنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنی طرز کی کشتیاں بنائیں جن میں پیڈل کینیڈا کی کشتیوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ مقامی کشتی بان انھیں چرا نہیں سکتے تھے کیونکہ انھیں ان کا استعمال نہیں آتا تھا اور ان کے غلط استعمال کی بنا پر آسانی سے پکڑے جا سکتے تھے۔ خیر، فی الحال ہماری جائداد محفوظ ہے۔

اس دریا پر ہاؤس بوٹوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جن میں زیادہ تر یورپی لوگ رہتے ہیں۔ کسی یورپی کو کشمیر میں زمین خریدنے یا مکان بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ گلمرگ میں چند مکانوں اور سرکاری اہل کاروں اور سری نگر میں ایسی ہی عمارات کے سوا یہی ہاؤس بوٹ ان کے لیے گھر بنتے ہیں جو یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ یہ بوٹ ہر طرح کی شکل وصورت اور حجم کے ہوتے ہیں جن میں ڈونگوں سے لے کر دریائے ٹیمز کی کشتیوں جیسی بڑی بڑی کشتیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان میں چند ایک بے حد خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کی جاتی ہیں۔ مسٹر کینارڈ نے سب سے پہلے ہاؤس بوٹ بنایا تھا۔ اگرچہ اُس نے یہ بوٹ تیس سال پہلے بنایا یہ اب بھی مضبوط ہے۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اسے بہترین دیودار کی لکڑی حاصل ہوئی۔ اس کے برعکس مسٹر کینارڈ کے بعد بھی ایسے بوٹ تعمیر کیے گئے جو اب ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بوٹوں کی تعمیر نا اہل کاریگروں کے ہاتھوں ہوئی جنھیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک مضبوط کشتی کے لیے کس قسم کی گول اور مضبوط لکڑی درکار ہوتی ہے۔

ایک کشتی کے ڈھانچے کو چابک دستی سے تیار کرنا نہایت مشکل ہے جو ان چاول ڈھونے

والی کشتیوں سے زیادہ مضبوط ہوسکتا ہے۔ اگر چہ بوجھلدی کشتیاں زیادہ پائدار ہوتی ہیں کیونکہ ان میں چھت کے نیچے لمبی لمبی شہتیر یں نصب کی جاتی ہیں۔ لیکن ہاؤس بوٹوں میں ایسا نہیں کیا جاتا کیونکہ کسی بھی شخص کا سر اس میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جاتے وقت چھت سے ٹکرا سکتا ہے۔ اسی طرح چھت خمیدہ ہونے کی وجہ سے کمرتوڑ اور گویا نشے میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس سے اس کی شکل ناپسندیدہ بن جاتی ہے اور یہ کسی حد تک ناقابل استعمال ہو جاتی ہے۔

میں نے اور میری بیوی نے ایک ہاؤس بوٹ میں اپنی اولین رہائش گاہ کے طور پر قیام کر لیا جو بہت ہی خوبصورت تھا۔ ہم لہروں کے درمیان چلتے رہے تا کہ تازہ ہوا ہمیں چست وشاداب رکھے۔ اس سے ہمارے ذہن ودل بھی کسی فکری آزمائش سے پاک رہے۔

مجھے اس بات سے مکمل سکون نصیب ہوا کہ ہمارے درمیان تیس سے چالیس گز کا گہرا پانی تھا۔ میں نے اس غرض سے کنارے پر ایک چھوٹی سی کشتی رکھوائی تا کہ اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو اسی ناؤ پر سوار ہوکر آجائے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اکثر ناآزمودہ کاروں کو کشتیاں کھینا نہیں آتا یا وہ ناؤ چلاتے وقت دکھائی دینے کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اس کام کو ان دنوں نچلے طبقے کا کام سمجھا جاتا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے میری یہ کارروائی کیسی تھی میں اس واقعے سے اس کی مثال پیش کروں گا:

میرے نوکر نے ایک بار مجھے اطلاع دی کہ ایک برہمن مجھ سے ملاقات کی خواہش رکھتا ہے۔ میں نے اس سے کہا وہ برہمن سے کہے کہ وہ کنارے پر کھڑی ناؤ میں بیٹھ کر میرے پاس آجائے۔ لیکن برہمن اس تجویز کو ماننے سے رہا۔ اُس نے میرے کشتی رانوں سے کہا کہ وہ اسے مجھ تک پہنچائے مگر انھوں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرا۔ لہٰذا میرا ملاقاتی وہی کچھ کرنے پر مجبور ہوا جو ایک عام کشتی ران کرتا ہے۔ اُس نے ناؤ لے لی اور ایک انجانے کی طرح اسے میری طرف کھینے لگا۔ چونکہ وہ کشتی رانی سے قطعاً ناواقف تھا اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وسط میں دریا کی لہریں ذرا شور انگیز ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کشتی کا توازن سنبھال نہیں سکا اور دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی سرتوڑ کوشش کی، وہ مدد کے لیے چلانے لگا لیکن دریائی لہروں نے اسے اور کشتی دونوں کو نگل لیا۔ وہ نظروں سے پوری طرح غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے

بمشکل کشتی کو پانی سے نکالا اور اسے کسی ایسے ہی دوسرے متوقع ملاقاتی کے لیے دوبارہ کنارے پر لگا دیا۔

میں یہاں یہ کہوں کہ پھر ایک ملاقاتی، جس نے ناؤ چلانا سیکھ لیا تھا، مجھ سے ملا اور کئی بار میرے گھر پر بھی آ گیا وہ ایک مصروف شخص ہے اور میں اس کی دیانت داری کی وجہ سے اُس کی بے حد عزت کرتا ہوں۔

ایک ہاؤس بوٹ خواہ وہ زمین پر ہو یا پانی میں ہو یہ ایک خاص نوعیت کی رہائش گاہ ہے۔ آپ اسے حسب منشا جہاں چاہیں لے جاسکتے ہیں۔اس کی حرکت میں اس کے ایک ہی جگہ ٹھہرنے کے برعکس کئی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جب یہ چلتا ہے تو محسوس ہی نہیں ہوتا اور اس کی رفتار ہر قسم کے ہچکولوں سے محفوظ ہے۔آپ کو صرف پانی کی لہروں کی دھیمی آواز ہی سنائی دے گی۔ ہاؤس بوٹ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے تو آپ کو اس کے لیے کوئی تگ و دو نہیں کرنی پڑے گی آپ اپنی منتخب جگہ کا نام لیں اور بوٹ اسی سمت میں رواں دواں ہوگا۔

موسم سرما میں ہاؤس بوٹ نسبتاً گرم رہتا ہے۔اس کے کمرے چھوٹے ہوتے ہیں جنھیں آسانی سے گرم رکھا جاسکتا ہے۔البتہ گرمیوں میں یہ مقابلتاً آرام دہ نہیں ہوتا۔آپ اگرچہ کسی درخت کے سائے میں اسے لے جاسکتے ہیں لیکن اس میں یہ خطرہ ہے کہ اس موسم میں برف پگھل جانے کی وجہ سے پانی کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور جب رات کو یہ سطح عام طور پر اونچائی اختیار کرتی ہے تو ہاؤس بوٹ کے اس درخت سے ٹکرائے جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے جس سے بوٹ یا تو ٹوٹ سکتا ہے یا پانی میں ڈوب جاتا ہے۔لہٰذا بوٹ کے لیے ایک درخت کے انتخاب سے پہلے اس خطرے کا بغور جائزہ لیا جانا چاہیے۔

ایک دفعہ سیلاب کے دوران میرا ہاؤس بوٹ ڈوبنے ہی کو تھا کیونکہ یہ توت کے ایک بھاری بھرکم درخت کی شاخ تلے آ کر دب سا گیا تھا۔لیکن یہ حادثہ میرے کشتی ران اسماعیل کی پھرتی سے ٹل گیا۔ وہ بوٹ کی چھت پر ایک آرا لے کر چڑھ گیا اور اس شاخ کو کاٹ کر پھینک دیا۔ اگر یہ واقعہ رات کے وقت پیش آتا تو ہمارا خاتمہ ایک حقیقت بن جاتا۔

پندرھواں باب

مُہمّات

ایک مغربی باشندے کے لیے کسی مشرقی شخص کو سمجھنا آسان نہیں جب تک کہ وہ کچھ عرصے تک ساتھ ساتھ نہ رہیں کیونکہ ان کی آپسی آشنائی بالکل مصنوعی لگتی ہے۔ ہم میں سے اکثر انھیں نوکروں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چند ایک کو ہم کلرک کہتے ہیں جنھیں ہم دفتروں میں دورانِ کار دیکھتے ہیں۔ پھر محض گنتی بھر کے لوگ سماجی تقریبات میں نظر آتے ہیں جن میں عوامی تفریحی مواقع یا ایک دوسرے کے گھر جانا شامل ہے۔ اس کے باوجود صرف چند ایک یورپی لوگ ہی ہندوستانیوں کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر حقیقت میں انھیں اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہو تو ایسا صرف اُن کے گھروں میں جا کر ہی ہوسکتا ہے جہاں وہ زندگی اپنی اصل صورت میں گزارتے ہیں۔

پہلے پہل میرے لیے اپنے اہل کاروں یا شاگردوں کے گھروں میں جانا ممکن نہیں تھا۔ ایسا صرف اس وقت ممکن تھا جب ان میں سے کوئی مجھے چائے کی پیالی پینے کے لیے بلاتا یا اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو جاتا۔ میں نے انھیں دس میل دور جنگل میں ایک مکان تک مہم جوئی کے لیے کہا۔ یہ بیس افراد کی جماعت تھی اور جب مجھ سے کہا گیا کہ ان کے والدین راضی نہیں ہوں گے تو میں نے از خود سارے انتظامات کیے۔ ساتھ ہی مذہبی برہموں نے بھی کہا تھا کہ یہ مہم کوئی محفوظ

سرگرمی نہیں کیونکہ جہاں وہ برہمنوں کی حیثیت میں جنگل میں جائیں گے تو وہاں یہ بھی خدشہ ہے کہ وہ عیسائی بن کر لوٹیں گے۔ ان برہمنوں کو وہم تھا کہ میں انھیں اپنی خوراک استعمال کرنے کو کہوں گا اور اس طرح ان کی ذات پات کی انفرادیت کو توڑ دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت کے بارے میں برہمنوں کے اور میرے خیالات مختلف تھے۔

لہٰذا اولین کام یہ تھا کہ برہمنوں کے اس تذبذب کو دور کرکے اُن کی ذہنی صفائی کا مرحلہ طے کیا جائے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ مہم طلبا اور ان کے مدرسوں کی اخلاقی اور جسمانی صحت کے لیے اس لحاظ سے نہایت مفید ثابت ہوسکتی ہے کہ ہم گندے شہر سے نکل کر جھیلوں اور پہاڑوں کی طرف رخ کریں گے اور وہاں ان کے پھیپھڑوں میں تازہ ہوا اور ان کی روحوں میں تر و تازہ خیالات بھر دیں گے۔

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں ایک بارہ چپوؤں والی کشتی بناؤں جسے چلا کر ہم برہمنوں پر سبقت حاصل کرسکتے ہیں۔ اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہم نے مختلف مواد جمع کیا۔ ہم نے سری نگر سے چالیس میل دور دیودار کا ایک درخت پایا جس سے ہمیں بنیادیں تیار کرنی تھیں۔ ہم اسے اسکول میں لائے۔ پھر ہم نے تانبے کے چپوؤں کے لیے کلکتہ افراد بھیجے اور ہم نے سرکاری افسروں سے توت کا درخت کاٹنے کی اجازت حاصل کرلی جس سے ہمیں اس کی پسلیاں تیار کرنی تھیں۔ کیونکہ توت کا درخت کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر جب سارا سامان مہیا ہوا تو نجاروں کو بلا کر اسکول کے صحن میں کشتی بنائی گئی۔

اسکول کا عملہ اور طلبا اس کشتی کی تیاری کا عمل دیکھتے رہے اور وہ میری طرح اسے پانی میں لے جانے کے لیے اتنے ہی بیتاب نظر آرہے تھے۔ وہ اس کے کھیون ہاروں میں بھی شامل ہونے کے خواہاں تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایسٹر کی چھٹیوں میں ہم کشتی کو مانسبل جھیل تک لے جاکر وہاں دس دن کا کیمپ لگائیں گے۔ آخر کار یہ دن بھی آگیا مگر کشتی ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی ہم نے اسے ایک دن اس وجہ سے شام گئے آٹھ بجے اندھیرے میں نکالا کہ ہر ایک اسے جلد سے جلد کھینا چاہتا تھا۔

اگر مجھے اچھی طرح یاد ہے تو میں کہوں گا کہ اس میں ہم کل ملا کر بیس لوگ سوار تھے۔ لیکن

ہمیں فوراً ہی انھیں زمین پر اتارنا پڑا کیونکہ اس کے تختے وقت کی کمی سے پھولے نہیں تھے اور ان میں سے پانی رس رہا تھا۔ بہر حال ہم اس سفر سے بخوبی لطف اندوز ہوئے۔ کھانے کی میز پر بیٹھنے اور بستروں میں گھسنے تک ہمارے سامنے سولہ میل کا سفر باقی تھا۔ لہٰذا کشتی رانوں نے دوسرا راستہ لیا اور دوسروں نے پانی کی سطح نیچے رکھنے کی کوشش کی۔ نصف شب کو ہم دریا کے کنارے پر اپنے کیمپ پر پہنچے اور کھانے کے لیے بروقت موجود ہونے پر خوش تھے۔

اگلے دن ہم نے دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ مزید چار میل کا سفر طے کیا اور پھر ہم مانسبل کی خوبصورت جھیل میں پہنچ گئے۔ ہم خوش قسمت تھے کہ ہمارے وہاں پہنچتے ہی تازہ ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے کشتی رانوں کے چہرے دیکھ کر خود بھی خوشی ہوئی۔ یہ اُن کا کشتی رانی کا پہلا تجربہ تھا جس میں خوشی، جذبات اور خوف بھی شامل تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم طوفانِ باد و باراں میں گھر گئے۔ کشتی رانوں کے چہروں سے ساری بشاشت غائب ہوگئی اور وہ ''رام رام'' اور ''شوشِو'' پکارنے لگے۔ ایک طرف چند ایک نے تو پانی میں چاول ڈالے تاکہ دیوتا خوش ہو جائیں اور کچھ تو رونے بھی لگے۔ انھیں ایسا لگا کہ اُن کا آخری وقت آ گیا ہے۔ ہم کنارے کی طرف جانے لگے اور میں نے چلا کر پکارا۔ ''وہ سبھی جو بزدل ہیں اور کنارے پر اترنا چاہتے ہیں وہ اپنے ہاتھ مضبوطی سے اوپر اٹھائیں''۔ میرا گمان تھا کہ اپنے بارے میں لفظ بزدل سُن کر وہ ہاتھ نہیں اٹھائیں گے مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا اور ان میں سے تقریباً ہر ایک نے اپنے ہاتھ بلند کیے۔ میں نے بہر حال انھیں کنارے پر چھوڑا اور صرف تین بہادروں کو ساتھ رکھا۔ جب باد و باراں کا حملہ کم ہوا، ہم خود بھی اِتراتے ہوئے کنارے پر آ گئے۔

کشتی ہم پر مہربان تھی اور اب پانی کا رسنا بھی بند ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اور میرے کئی کشتی ران ساتھی بوٹ کے وسط میں آرام کی نیند سوئے۔ ہم نے کشتی کو جھیل میں ڈال دیا اور پانی کی دھیمی لہروں کی خوش کُن آواز میں محوِ خواب ہوئے۔ ایسا پہلی بار ہُوا تھا کہ یہ لوگ گہری نیند سوئے تھے اور رفتہ رفتہ ان کے ذہنوں سے تیز ہواؤں کا خوف بھی زائل ہو چکا تھا اور وہ ایسی آفاتی قوتوں کو پناہ دینے والے شیطانوں اور بھوتوں کی نادیدہ گھبراہٹ پر بھی قابو پا چکے تھے۔

اگلے دن ہم نے اُس پہاڑ پر چڑھنے کا منصوبہ بنایا تھا جو جھیل کے کنارے پر ہی سامنے

کھڑا تھا۔اس موقعے پر پہاڑوں کے بارے میں میرے ساتھیوں نے بتایا کہ ان میں کس طرح دیوتاؤں نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ جس کی بنا پر ان کے اندر پناہ گاہوں میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس رات انھوں نے کیسے خواب دیکھے کیونکہ ظاہری طور پر وہ ذہنی تذبذب میں مبتلا نظر آرہے تھے۔ ہم صبح ہونے سے پہلے ہی جاگ پڑے، کھانا کھایا اور علی الصباح ساڑھے چار بجے روانہ ہوئے۔

ہمارا کھانا ساتھ اٹھانے کے لیے ایک قلی ہمارے ساتھ ہولیا۔ ہم پہاڑ کی اونچائی پر ساڑھے آٹھ بجے پہنچ گئے۔ جونہی ہم چوٹی پر قدم رکھنے کو تھے تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی آگے بڑھنے کے لیے آمادہ نہیں تھے کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہ دیوتاؤں کی پناہ گاہوں کی طرف جارہے ہیں۔ یہاں پر ایک عمودی چٹان تھی۔ جب ہم یہاں پہنچے تو میں نے اعلان کیا کہ ہم چوٹی پر پہنچ چکے ہیں اور ہم دیوتاؤں کی سرزمین میں ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم ان کو پکڑ لیں کیونکہ دیوتا انہی چوٹیوں پر رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ واقعی وہاں قیام پذیر ہوں تو ہم انھیں دیکھیں گے۔ میں نے اس گروہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک دائیں طرف جائے گا اور دوسرا بائیں جانب آگے بڑھے گا۔ اس طرح ہم دیوتاؤں کو پکڑنے کے قابل ہوں گے۔ دونوں جماعتوں کے افراد نے زبردست جوش اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ قدم بڑھائے مگر مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس چیز کی تلاش میں نکلے ہیں؟

چونکہ ایک جماعت چٹان کی پچھلی طرف چل رہی تھی انھوں نے قدموں کی آوازیں سن لیں۔ جس سے ان کے دلوں کی دھڑکن ڈر کے مارے تیز ہوگئی لیکن یہ دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی کہ جن قدموں کی آوازیں انھیں سنائی دی تھیں وہ دراصل دوسری جماعت کے افراد کے پاؤں کی آواز تھی۔ پھر انھوں نے اعتراف کیا کہ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی ان کے دامن کی طرح دیوتاؤں کے وجود سے خالی تھیں۔ انھوں نے اس خوشی میں ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور اس دریافت پر بے حد خوش نظر آئے۔ لیکن دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا کھانا لے جانے والا قلی اس بات سے متفق نہیں تھا۔ اس کا دل چوٹی پر پہنچنے سے پہلے ہی ڈوب چکا تھا اور ہم نے اسے شام کو

کیمپ میں پہنچنے سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم نے کھانے کے سلسلے میں اس قلی کا کوئی خیال نہیں رکھا تھا۔ اس مہم نے ہماری جماعتوں کی بھوک اتنی بڑھادی کہ وہ بار باران پہاڑوں پر چڑھنے پر آمادہ نظر آئے۔ اس طرح برہمن پجاریوں کو ہماری دریافت سے واقعی تکلیف ہوئی ہوگی۔

دوسری بار ہم دواور جھیلیں تارسااور مارسا (1) دیکھنے نکلے جولڈاہ (2) اور ہارون دریاؤں کے آب گاہ رقبوں سے نکلتی ہیں۔ یہ چڑھائی نہایت پسندیدہ ہے۔ تیسرے دن بارش اس زور سے ہوئی کہ ہم دوپہر تک اپنا کیمپ نصب نہیں کر سکے۔ ہم نے اپنا کیمپ پہاڑ کے دامن پر نصب کیا جہاں ہم واپسی پر شام کو پہنچنا چاہتے تھے۔ دریں اثنا ہم نے جھیلوں تک پہنچنے کے لیے خشکی پر راستے بنائے تھے۔ ان تک ہم پانچ بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکے۔ جب ہم نے ان چڑھائیوں پر اپنے واپسی کے راستے تلاش کیے تو پتہ چلا کہ ابھی ہم پہاڑیوں کی چوٹی پر ہی ہیں۔ اندھیرا چھا گیا اور ہم راستہ بھول گئے۔ اس کے علاوہ ایک زوردار ہوائی طوفان نے ہمیں گھیر لیا۔ اس طرح ہم گویا اس طوفان کی زد میں آئے تھے۔ ہم پانی سے پوری طرح بھیگ گئے۔ یہ ایک تاریک رات تھی اور راستہ بارش سے پھسلن سے بھر چکا تھا۔ ہماری رفتار بے حد سست پڑ چکی تھی اور ہم نیچے اترنے کے لیے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ میں ہر دس منٹ کے وقفے سے رک کر دیکھتا رہا کہ کیا ہم سب ساتھ ساتھ ہیں۔ اس طرح ہم نے ساری رات اسی طرح منزل تک بمشکل پہنچنے میں گزاری۔

اگلی صبح ہم ایک گاؤں میں پہنچے اور وہاں کے چند دیہاتیوں کو جگایا تا کہ وہ ہمیں ہمارا کیمپ تلاش کرنے میں مدد دیں۔ انھوں نے ہماری رہنمائی کی اور ساڑھے چھ بجے ہم نے اسے آخر کار ڈھونڈ نکالا۔ ہم زیادہ دیر تک یہاں آرام نہیں کر سکے کیونکہ اگلے دن اسکول میں پڑھائی بحال ہونی تھی اور ہم بہر حال راتوں رات سری نگر پہنچنا چاہتے تھے۔ ہمیں سڑک کے ذریعہ سولہ میل اور پانی پر پچیس میل کا سفر طے کرنا تھا۔ ہم نے اپنی کشتیاں دریا میں اتاریں اور ہم مطلوبہ مقام تک چار بجے بعد دوپہر پہنچ گئے۔

میں جس کشتی میں سوار تھا وہ نصف شب کو سری نگر پہنچی لیکن بارہ چپوؤں والا کاٹنے کا اوزار ریتیلے کناروں میں اٹک گیا اور پھر میں اگلی صبح نو بجے وہاں پہنچ گیا۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ

مدرس برابر دودنوں اور دوراتوں تک ضروری آرام کیے بغیر چل رہے تھے۔اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے وقت پر حاضر تھے۔میرے دل میں ان کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی اور میں نے سارے اسکول میں ایک دن کی چھٹی کا اعلان کر دیا۔حق بات تو یہ ہے کہ میں خود اس چھٹی کا خواہش مند تھا کیونکہ مجھے آرام دہ نیند کی سخت ضرورت تھی۔

سری نگر میں ایک دریا جہلم کے ساتھ ملتا ہے جسے دودھ گنگا یا دودھ کی گنگا کہتے ہیں لیکن اسے اس کے منبع سنگ سفید سے مناسبت دی جاتی ہے جو پیر پنچال کے پہاڑوں میں سے رواں ہوتا ہے۔برہموں نے مجھ سے کہا کہ یہ دریا ایک سفید پتھر سے اچھل کر باہر آ جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ ایک معجزاتی خصوصیت کا حامل ہے۔لہٰذا یہ تجویز کیا گیا کہ ہمیں اس کے منبع تک پہنچنا چاہیے تا کہ ہم بچشم خود دیکھ سکیں کہ کیا یہ واقعی سفید پتھر سے نکلتا ہے۔اس حوالے سے ہم نے سنگِ سفید تک پہنچنے کی خاطر ایک جماعت تیار کر لی۔ہم جولائی کے مہینے میں وادی میں گرمی کی شدت کو خیر باد کہنے پر خوش تھے اور چاہتے تھے کہ ہم اپنے آپ کو برف اور یخ کی سرزمین میں تر وتازہ کر لیں۔

یہ مہمات ایک شخص کو اُن لوگوں کے اندرون کا حال جاننے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں جن کا روزمرہ سری نگر میں گزرتا ہے کیونکہ رات کو آگ کے ڈھیر کے آس پاس اور تاریکی میں خیموں میں قیام کر کے لوگ اپنا دل کھول کر بات کرتے اور حق گوئی سے کام لیتے ہیں۔اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ اُن کی شناسائی بہتر طور پر قائم ہو جاتی ہے۔اسی طرح چڑھائی کے دوران مشکلات اور خطرات ہمارے لیے قدرِ مشترک بن جاتے ہیں جس سے ہماری دوستی زیادہ دیرپا صورت اختیار کرتی ہے۔

ان مہموں سے میں نے خاص طور پر ایک بات سے بشاشت حاصل کر لی ہے، وہ یہ کہ کس طرح مدرس اور طلبا اُن مصائب میں بھی اطمینانِ قلب کی حالت میں رہتے ہیں جن میں بھوک، سردی اور تھکاوٹ شامل ہیں۔یہ لوگ ان تکالیف کو خاموشی اور بہادری سے برداشت کرتے ہیں جن میں کبھی کبھی مزاحیہ صورتِ حال بھی پیدا کی جاتی ہے اور وہ قہقہے لگاتے ہیں۔

پہلی رات کو ہم نے جنگل میں اپنا خیمہ نصب کیا اور دوسرا مرگ کے نزدیک برف پر کھڑا کیا۔تیسرے روز ہم سنگِ سفید یعنی منبع تک پہنچ چکے تھے۔یہاں دیکھا گیا کہ دریا ایک گلیشیر سے

برآمد ہورہا تھا جو خالص سفید ہونے کے برعکس کسی حد تک بھورے رنگ کا تھا۔ یہ رنگ اس پر ساتھ ملنے والے ملبے کی ملاوٹ سے چڑھ چکا تھا۔

میری جماعت اس بات سے شاداں تھی کہ اس نے سنگِ سفید اور سفید دودھ دریا کا منبع دیکھا تھا لیکن ان کو اندیشہ تھا کہ ان کے پجاری اس حقیقت کو نہیں مانیں گے اگر وہ ان سے یہ کہیں گے کہ دریا دراصل ایک برفانی تودے سے اور کسی معجزاتی عمل سے خارج نہیں ہوتا ہے(3)۔

اب ہم سولہ ہزار فٹ ایک اونچی چوٹی کے پاس تھے جسے ٹاٹی کُٹی کہتے ہیں۔ ہم نے اس پر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر تک چڑھنے کے بعد ہم نے اپنے آپ کو ایک چاقو کی دھار جیسے کونے پر پایا جس پر جو بھی چڑھ گیا وہ اسے کبھی نہیں بھول پائے گا۔ ہم اس پر چل نہیں سکتے تھے اور ہماری دونوں ٹانگیں اس کے دونوں طرف لٹکی ہوئی تھیں۔ ہم سات سات افراد پر مشتمل دو جماعتوں میں منقسم ہوئے اور ہم نے ایک دوسرے کو رسیوں سے باندھ لیا۔ کچھ فاصلے تک ہمارے لیے یہی ایک راستہ تھا کہ ہم اس تیز دھار والے حصے پر آگے بڑھیں۔ ہم نے اپنے جسموں کا بوجھ ہاتھوں پر اٹھایا تھا کیونکہ یہ حصہ واقعی نہایت تکلیف دہ تھا۔ اس لیے ہمیں پاؤں کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو بھی استعمال کرنا پڑا جو بہر حال ایک آسان سفر نہیں تھا۔ ہمارے لیے اس خطرے کے پیش نظر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوا اور ہم شکست خوردہ لوگوں کی طرح واپس لوٹ گئے۔ چونکہ اس چوٹی کو مہم بازوں نے سر کیا ہے مگر انھوں نے ہماری ناکام حکمت عملی کو ہرگز نہیں اپنایا ہوگا۔

سری نگر واپس آنے پر ہماری جماعت کے برہمن ارکان نے اپنے پجاریوں کو بتایا کہ دودھ گنگا کا دریا سنگ سفید سے نہیں بلکہ ایک گلیشیر سے نکلتا ہے۔ مگر پجاریوں نے حسب عادت ان کے ساتھ اتفاق نہیں کیا اور دونوں فریق یہی سمجھتے رہے کہ ان ہی کا موقف صحیح ہے۔

اسکول کی طرف سے منعقدہ یہ مہمات کئی لحاظ سے فائدہ مند ہیں۔ ان کی بدولت جسمانی تندرستی اور روح کی برجستگی کے علاوہ ایک دوسرے کو احسن طریقے سے جاننے پہچاننے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں اور ایک انسان کو تو بہر حال آخر دم تک کچھ نہ کچھ سیکھنا ہی پڑتا ہے۔

آپ کو کشمیر میں شاذ ہی کوئی ایسا شخص نظر آئے گا جو اپنے ملک کی دل نشین خوبصورتیوں کا معترف ہو۔ اسے ایک طرف پھول پسند ہیں اور ان باشندوں کے ہجوم در ہجوم موسم بہار میں

گلستانوں میں شہر میں گھومتے نظر آتے ہیں تا کہ انھیں ان پھولوں سے ذہنی حظ حاصل ہو لیکن یہاں جو پہاڑ ہیں، ان کی تہہ در تہہ چٹانیں ہیں، مرگیں ہیں اور ان کے لازوال رنگ اور سائے ہیں، ان کی طرف ان کی توجہ کبھی نہیں جاتی۔

میں ایک صبح بہار کو دریا کے کنارے اپنے سامنے پھیلی ہوئی سبز وادی، پہاڑیوں کے دامن میں شمشاد کے درخت اور برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں کا نظارہ دیکھ رہا تھا، جو آنکھوں کو خیرہ کرنے والی سفیدی سے منور تھیں کہ ایک شخص نے جو پاس سے گزر رہا تھا مجھ سے سوال کیا۔ ''صاحب! آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''یہ شاندار پہاڑ''۔ وہ بولا۔ ''صاحب! یہ تو ہمیشہ سے یہیں پر موجود تھے؟''

ہمیں اسی پر بس نہیں کرنا ہے۔ ہمیں ان کی آنکھیں کھولنی ہیں تا کہ وہ اس دیدہ زیب ملک کو دیکھ سکیں جس میں وہ رہائش پذیر ہیں۔ انھیں اس پر ناز کرنا چاہیے، اس کی توقعات کے مطابق جینا چاہیے اور اسی طرح کی باتوں کو ذہن نشین کرنے میں دوسروں کی مدد کرنی چاہیے۔

اسی طرح یہاں حیوانوں کی بھی ایک دنیا ہے، جس سے ماسوائے چند شکاریوں اور پہاڑوں پر رہنے والے دیہاتیوں کے لوگ ناواقف ہیں۔ میں نے کبھی کسی کشمیری لڑکے کو پرندوں کے انڈے جمع کرتے نہیں دیکھا ہے۔ انھیں یا تو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم یا وہ اس طرف توجہ دینا نہیں چاہتے۔ میں نے ایک بار ایک کلغی دار کبوتر کا انڈا ہاتھ میں پکڑ کر اپنے سامنے ایک سو پچاس طلبا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ایک انڈا ہے۔ جب میں نے کہا کہ وہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر یہ ایک پالتو پرندے کا انڈا نہیں ہے۔ ان میں سے سوائے ایک مسلم لڑکے کے کوئی صحیح جواب نہیں دے سکا جس نے کہا کہ یہ کلغی دار کبوتر کا انڈا ہے۔ کیونکہ اس نے ایسے ہی انڈے ایک گھونسلے میں دیکھے تھے۔ پھر یہ طلبا گویا کئی باتیں سیکھنے کا ارادہ ظاہر کرنے لگے۔ پھر ہماری دوسری مہم کے دوران ہمیں حیوانوں اور پرندوں کے بارے میں باتوں کا پتہ چلا۔

عقاب بھی ہمیشہ دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں اور ان کی شاندار حرکات کا نظارہ کرتے ہوئے کبھی تکان محسوس نہیں ہوتی۔ ایک شخص جب اونچائی پر ہو تو وہ ہزاروں فٹ نیچے کی جانب دیکھ کر دیکھتا ہے اور عقابوں کو بلندیوں کی طرف پرواز کرتے دیکھ کر وہ دیکھتا ہے کہ عقاب کبھی اپنے پر

نہیں پھیلاتا سوائے اس وقت کے جب اسے ہواؤں کی مخالف سمت میں اپنی پرواز کو متوازن رکھنا ہو یا اسے آس پاس ہی کسی اور عقاب کی جانب لپکنا ہو۔ اپنی اڑان کے دوران وہ برابر اونچائی پر چڑھتا رہتا ہے۔ عقاب کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے پروں کو ہلائے بغیر ہواؤں کی رفتار کو اپنے موافق کرتا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آجاتی ہے کہ خدائے جاوداں کی طاقت کس طرح زمینی قوتوں کو ایک روحانی فیضان بخشتی ہے۔ ہمیں بھی عقابوں کی طرح اوپر جانے کی خواہش کو اپنانا چاہیے تا کہ خدا کی قوت سے ہم بلندیوں کو چھو سکیں۔ عقاب ہمیشہ پرواز کرتا رہتا ہے۔ میں نے ایک بار اسے اپنے شکار پر جھپٹتے دیکھا جب میں ایک دوست کے ہمراہ پیر پنجال پر تھا اور تقریباً پندرہ ہزار فٹ کی اونچائی پر چل رہا تھا۔ میں عقاب سے کوئی پانچ سو فٹ نیچے تھا۔ اچانک اس نے اپنے پروں کو سمیٹا اور وہ ایک تیر کی طرح نیچے آ گیا لیکن اپنی نادانستگی کی وجہ سے شکار اس کے ہاتھ نہیں آ سکا۔

اپنی ساری مہمات کے دوران ہم ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ ہم ہر دن کا بھرپور استفادہ کریں اور نئی نئی باتوں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ مقصد یہی تھا کہ ہمارے طلبا کی آئندہ نسلیں شجاعت اور ہمت کی مالک بن سکیں۔ اس سے قبل کسی طالب علم کے باپ نے ایسی مہم بازی نہیں کی تھی لہٰذا ہماری خواہش کے مطابق نئی نسل کو گئی گزری باتوں پر سبقت حاصل کرنی تھی اور نئی نئی باتوں کو وجود میں لانا تھا۔

ایک دفعہ چودہ افراد نے کوثر ناگ کی خوبصورت جھیل کی طرف ایک مہم کا انتظام کیا جو پیر پنجال پر جڑواں برہمن چوٹیوں سے دس ہزار فٹ نیچے ایک برفانی تودے کے دامن میں واقع ہے۔ یہ جھیل تین میل لمبی اور ایک میل کا تین چوتھائی حصہ چوڑی ہے۔ اس کا رنگ سبز زمرد کا ہے اور یہ بہت گہری ہے۔ اس پر موسم گرما میں برفانی ٹکڑے تیرتے رہتے ہیں۔

یہ جنگلوں اور گھاس والی مرگوں سے ہوتی ہوئی ایک خوش کن مہم تھی جہاں قدم قدم پر ہم نے نہ صرف پھولوں کے قالین بچھے دیکھے بلکہ یہاں کھمبیاں اس قدر بہتات میں اُگی تھیں کہ اگر ہمارے چودہ کے چودہ ساتھی بھی انھیں لے جاتے پھر بھی وہاں ان کی اچھی خاصی مقدار باقی رہتی۔ اس دن ہم پینتالیس میل چلے اور پھر ستانے لگے۔

ایک اور مرتبہ سارے اسکول نے سری نگر اور واپسی کی تیس میل کی ایک دوڑ میں حصہ لیا۔ کشتی رانوں نے سری نگر سے پامپور تک کشتیوں کو چلایا، پھر وہ چپوؤں کے سہارے واپس لوٹے۔ اس مہم میں ایک سولڑکوں نے حصہ لیا۔ یہ ریکارڈ دو دن تک سری نگر سے اسلام آباد تک اور پھر واپس تین کشتیوں کی دوڑ نے توڑ دیا۔ یہ دوطرفہ فاصلہ چھیانوے میل کا تھا۔ کیا موسم نے ہماری مدد کی یا نہیں؟ یہ تو میں نہیں جانتا البتہ ہم نے واقعی آنے والے دوستوں کے لیے یہ ریکارڈ قائم کر دیا۔

اب میں مہمات پر یہ باب جھیل ولر کی ایک مہم پر پایۂ تکمیل کو پہنچادوں گا۔

ایسٹر کے موقع پر ہمیں حسب معمول دس دن کی چھٹی ملی اور ہماری رسم کے مطابق ہم نے رضا کاروں کو اس ولر جھیل کے کیمپ میں شمولیت کے لیے کہا جس کے یہ معنی تھے کہ اس خوبصورت مگر خطرناک جھیل میں ایک ماہ تک صحت بخش زندگی گزار سکیں۔ یہ جھیل چودہ میل لمبی اور سات میل چوڑی ہے۔ ہم سری نگر سے بارہ چپو والے بوٹ میں تیس میل نیچے کی طرف چلتے گئے۔

ہم یہ امید باندھے ہوئے تھے کہ اوپر والا ہماری حفاظت کرے گا جیسا کہ اس نے دوسرے مواقع پر کی تھی۔ وہ اپنے ہوائی بادبانوں کو سمیٹ لے گا تا کہ ہم اس مہم کو آرام اور کامیابی کے ساتھ انجام تک لاسکیں۔ بہر حال وہ ہم پر مہربان رہا۔ میں یہاں ایک اور مہم کو دوہراؤں گا۔

بارہ مولہ میں، جو اٹھارہ میل دریا کی سمت میں ہے، پانی سے ملبہ نکالنے کی بڑی بڑی مشینیں بنائی جارہی تھیں۔ اس خبر سے ہمیں ایک طویل دریائی سفر کی تحریک ملی۔ ہم سورج طلوع ہونے کے فوراً بعد روانہ ہوئے اور ہم نے جھیل میں سات میل کا سفر طے کیا۔ پھر ہم دریائے جہلم میں اترے اور دوپہر کو بارہ مولہ پہنچے۔ ان مشینوں پر کام کرنے والے انجینئروں نے ہم پر مہربانی کر کے ہمیں دلچسپی کی ہر چیز دکھائی۔

بارہ مولہ کے رومن کیتھولک پادری نے ہمارے کشتی رانوں کو کھانے پر مدعو کیا اور جب تین بجے ہم رخصت ہوئے تو وہ کنارے پر بہ نفسِ نفیس حاضر تھا۔ اُس کے ساتھ اسکول کے طلبا بھی تھے جو تالیاں بجا بجا کر ہمیں الوداع کہہ رہے تھے۔ ہم نے بھی اپنے چپو اوپر اٹھا کر اور ان کی طرف جھکا کر انھیں سلامی دی اور ان کے خیر سگالی کے جذبے کا ردِ عمل ظاہر کیا۔

ہمارے لیے علی الصباح کشتی کو پانی کے بہاؤ کی طرف چپوؤں سے کھینا مقابلتاً ایک سخت مرحلہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہزاروں شہتیر بہتے دریا کی مخالف سمت میں پنجاب میں ریلوے کے استعمال کے لیے ڈالے گئے تھے اور ہمیں ان سے بچنے میں بے حد وقت ہوئی جس سے کافی تاخیر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی حالات نے اُس وقت بدترین صورت اختیار کر لی جب ایک طوفانِ باد و باراں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس تاخیر سے ہم رات کے اندھیرے میں جھیل تک پہنچ گئے جبکہ خطرناک جھیل ولر کے سات میل ہمارے اور ہمارے کیمپ کے درمیان ایک رکاوٹ کی طرح سامنے تھے۔

کئی کشتی ران صبح تک اسے پار کرنے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ انھوں نے کبھی کسی جھیل کو تاریکی میں پار کرنے کا کوئی واقعہ نہیں سنا تھا اور وہ بھی اس وقت جب آندھی اور طوفان شور انگیز تھے۔ ایسی صورت حال میں کوئی مانجھی اپنی کشتی چلاتے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اہلِ کشمیر آندھیوں سے نفرت کرتے ہیں۔

بہر حال ہمارے اس حکم کی تعمیل میں کہ ''چپو اٹھاؤ!'' ہر شخص کام پر لگ گیا اور چند ہی لمحوں میں ہم روح پرور ہوا کے جھونکے محسوس کرنے لگے اور ہم اسی اندھیارے میں کیمپ تک پہنچ گئے۔

ہم ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے جبکہ آسمان پر صرف چند ایک تارے جھلملا رہے تھے۔ پہاڑ پر ہلکی روشنی کی پتلی سی لکیر نظر آ رہی تھی لیکن چند ہی لمحوں میں یہ نظارے ہماری نظروں سے غائب ہو گئے اور ہم نے پہاڑوں کو پھر اسی وقت دیکھا جب بجلی نے ہم پر رحم کھایا۔ ہوا نے بھی رخ بدلا اور ہمارے گھر پہنچتے وقت یہ تیز تیز چل رہی تھی۔

ہمیں کشتی رانوں کو ایک سمت سے دوسری سمت میں لے جانا پڑا۔ ہم نے جھٹ پر آپس میں بندھی ہوئی شاخوں سے ایک نشست بنائی تھی جن پر ہم ایک، دو یا تین افراد کو بٹھا سکتے تھے۔ لیکن اس سے ہمیں تھوڑی سی پریشانی بھی ہوئی کیونکہ اگر یہ شاخیں ٹوٹ جاتیں تو ان پر براجمان افراد بری طرح نیچے گر جاتے اور پھر انھیں تاریکی میں سنبھالنا بہت مشکل کام تھا۔ لہٰذا ایک شخص برابر ان کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

خوش قسمتی سے ہم نے کنارے پر اس طرف آگ جلتی ہوئی دیکھی جہاں ہمارے تصور

میں ہمارا کیمپ تھا اور پھر اسی آگ اور مسلسل آوازوں کے سہارے ہم سیدھے چلتے گئے۔
کشتی ران اس شبانہ سفر کی جذبات انگیزی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ماسوائے اُس برہمن سنسکرت استاد کے جو پہلے اس جھیل میں کبھی نہیں اترا تھا۔ وہ سارے سفر کے دوران اونچی آواز میں پرارتھنا اور اپنے مخصوص دیوتاؤں اور دیویوں کی ہر قسم کی منتیں کرتا رہا۔ وہ وقفے وقفے سے انھیں یاد کر رہا تھا اور یہ سلسلہ اس وقت زور پکڑتا جب ناؤ ہچکولے کھاتی یا اسے کسی تیز لہر کا سامنا کرنا پڑتا۔ اُس کی دعاؤں سے میں نے یہ اخذ کیا کہ وہ دیوتاؤں کو طرح طرح سے خاطر تواضع کرنے کا لالچ دیتا ہے، جس میں پورے ایک دن برت رکھنا اور اسے ایک دیوی کے نام منسوب کرنا، دوسری دیوی کو چپاتی کھلانا اور گنیش دیوتا سے وعدہ کرنا کہ اسے مٹھائی پیش کرے گا اور بندر دیوتا ہنومان کو بھی یہی مٹھائی کھلانے پر مدعو کرنا شامل تھے۔ ہنومان کو اس نے کھانڈ میں لپٹے چاول کے گولے کھلانے کا بھی وعدہ کیا۔ ہمارے کشتی ران بھی اگرچہ برہمن ہی تھے مگر انھوں نے اُسے بیوقوف بنانے کا ارادہ کیا۔ لیکن میں نے منع کیا اور ان سے کہا کہ اسے اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر یہ پرارتھنا کرنے دو۔ یہ مذہبی شخص ایک خاص نظریے کا مالک تھا کیونکہ اس نے اپنے شہر میں چینی کے بسکٹ پہلے ہی خریدے تھے۔ شاید اسے معلوم تھا کہ دیوتا انھیں قبول کریں گے۔ اس نے یہ بھی سوچ کر رکھا تھا کہ اگر اس کی دعائیں اور پرارتھنا کام نہیں آئیں تو یہ بسکٹ اپنا چمتکار دکھائیں گے۔

ہم نے جب کشتی کو کسی حد تک غیر آرام دہ بنایا تو وہ دیوتاؤں کو یہ بسکٹ کھلانے لگا جن میں سے ہمارے ایک ساتھی نے وہ چرائے کیونکہ وہ ان کا رسیا تھا۔

میرے لیے یہ سب کچھ بے حد دلچسپ تھا۔ جب میں نے ان دنوں پر نظر ڈالی جب ہم نے پندرہ سال پہلے اسی کشتی میں اور اسی جھیل میں پہلا آبی سفر کیا تھا لیکن وہ تو دن کی روشنی میں کیا تھا۔ اُس وقت سبھی کشتی ران بھی ایسے ہی خوف میں مبتلا تھے جو اب اس سنسکرت مدرس پر غالب آچکا تھا۔ اُس وقت بھی ایسے بزدل چیختے چلاتے اور ''شو اور رام'' کو پکارتے تھے۔ وہ پانی میں کھانڈ اور چاول ڈال دیتے۔ چند ایک تو زور زور سے ''شو شو'' پکارتے اور دوسرے انہی ناموں کی جاپ اپنے ہونٹ ہلا ہلا کر کرتے۔ چند ایک نے تو اپنے سر جھکائے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ خاموشی سے روتے روتے اپنے پیاروں کو یاد کرتے جیسے ''اے میری پیاری

مال!"۔

خدا خدا کر کے ہم اپنے کیمپ پر پہنچ ہی گئے جس سے کیمپ والوں اور دیہاتیوں کو حیرت ہوئی کیونکہ ان کے ذہن میں یہ بات بالکل نہیں آسکتی تھی کہ ہم ان حالات میں یہ سفر کر سکتے تھے۔ ہمارا سنسکرت مدرس خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا اور وہ اپنے وعدے پورے کرنے پر تیار تھا۔ ہم نے اسے مشورہ دیا کہ دان کی اشیا پانی میں بہادینے سے بہتر یہ ہوگا کہ وہ کوئی نیک کام سرانجام دے۔ اگر وہ یہی چیزیں گاؤں کی کسی غریب عورت کو دے تو اسے بڑا ثواب حاصل ہوگا۔ ہمارے لیے یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ اُس نے ہمارا مشورہ مان لیا۔ اس طرح اس خطرناک سفر کا منطقی انجام کسی مستحق کے فائدے کی شکل میں ہوا۔

فٹ نوٹ:

(1) صحیح نام نارسر اور مارسر ہیں۔

(2) یہاں بھی مصنف نے لدر کی بجائے لڈاہ لکھا ہے جو غلط ہے۔

(3) برہمنوں کا طبقہ عام طور پر جدید علوم سے بے بہرہ ہی ہوتا ہے لہٰذا انھوں نے ایک بہت بڑے یخ بستہ برفانی تودے یعنی گلیشیر کو سنگِ سفید کا نام دے کر اس دریا کے ساتھ ایک مفروضہ جوڑ کر اسے معجزاتی عمل سے تعبیر کیا۔ یہ اُن کی توہم پرستی کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

سولھواں باب

سفر نامۂ لداخ

(حصہ اوّل)

یہ 1896 کے موسمِ گرما کی بات ہے کہ مجھے ڈاکٹر ارنیسٹ نیو کی ہمراہی میں لداخ جانے کا اتفاق ہوا جسے چھوٹا تبت بھی کہتے ہیں۔ سری نگر سے لیہہ تک، جو اُس ملک کی راجدھانی ہے، 224 میل کا فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ عام طور پر پیدل سفر میں بارہ دن میں طے ہو جاتا ہے جب ایک دن میں سات میل کا سفر طے کیا جائے جس رفتار سے بار بردار قلی یا ٹٹو چل سکتے ہیں۔ کئی جگہوں پر تو یہ سفر بلندیوں پر واقع گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے کرنا پڑتا ہے۔

میں اگرچہ ڈاکٹر نیو کے ساتھ نہیں ہو سکا کیونکہ میرے اسکول میں میرا کام پڑا تھا البتہ لداخ کے کمشنر کیپٹن شیو ییکس ٹرنچ نے از راہ عنایت مجھے اپنے ساتھ لیا۔ وہ میرے روانہ ہونے سے چار دن پہلے ہی چل پڑا تھا لہٰذا مجھے اسے پانے کے لیے انتہائی تیز رفتار سے چلنا پڑا۔ میں نے اس طرح پہلے ساڑھے چار مرحلے تقریباً تیس گھنٹوں میں طے کیے۔ جبکہ میں سری نگر سے شکارے میں نصف شب کو روانہ ہوا۔ اسماعیل اور اس کے ساتھی ساری رات آنچار جھیل کو پار کرتے رہے جہاں سے وہ دریائے سندھ کے راستے گاندربل پہنچے جو ہمارا پہلا پڑاؤ تھا۔

جب میں نے اگلی صبح کو ساڑھے چھ بجے آنکھیں کھولیں تو میں نے اپنی پہلی سواری کو مجھے تاکتے ہوئے دیکھا جو غالباً مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جلدی کرو۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں اس پر چڑھ گیا۔ یہ ایک خوصورت گھوڑی تھی جو مس نیومیم نے مجھے عاریتاً دی تھی۔ ہمارا مشنری عملہ بے حد خوش تھا اور غالباً گھوڑی کو بھی اس کا احساس ہوا تھا اسی لیے وہ ایک تیز گام ہرن کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔

ہمارا راستہ ہمیں اوپر کی طرف وادیٔ سندھ میں لے گیا جہاں ہماری دوسری جانب دریا گرجتے ہوئے بہہ رہا تھا۔ یہ موسم گرما کے ابتدائی ایام تھے اور جنگلی گلاب برجستہ کھلے ہوئے تھے۔ اسی طرح ہر سمت موسم بہار کے پنج برگہ لالے، گلِ نافہ، گلِ میمون، گلِ زعفرانی اور ایسے ہی کئی اور پھولوں کی برجستگی پورے جوبن پر تھی۔

ہم تیز رفتار سے چل رہے تھے اور قبل اس کے کہ وہ اپنے بلوں میں جا چھپتے ہمارے راستے میں سانپ آ گئے ۔ دوپہر کے قریب میں اپنے ٹٹو کے ساتھ چلا اور میرے ہرن کا سائیس ایک بہت بڑے اخروٹ کے درخت تلے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سواری بدلی اور سائیس اپنے ٹٹو کو لے گیا۔ میں اب اُس راہ پر گامزن تھا جو چٹانوں سے پُر تھا اور وادی رفتہ رفتہ تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

کوئی پانچ بجے کے قریب میں نے اپنے سائیس اور تیسرے ٹٹو کو انتظار کرتے ہوئے دیکھا۔ جو مجھے آٹھ میل دور سونہ مرگ میں اس خیمے تک لے گیا جو مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچایا گیا تھا۔ سونہ مرگ ہری گھاس اور پھولوں کا ایک حسین قطعہ ہے جو دس ہزار فٹ کی اونچائی پر اٹھارہ ہزار بلند چوٹیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تین گلیشیر دائیں طرف ان وادیوں کے دہانے پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

سونہ مرگ کے معنی ہیں سونے کی چراگاہ۔ یہ ایک وقت سری نگر کا پہاڑی مقام تھا۔ یہاں کے باشندے بتائیں گے کہ اس جگہ بہت سارے سانپ موجود ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جن وادیوں پر ہرموکھ پہاڑ کی نظر نہیں پڑتی وہیں پر ان سانپوں کی کثرت ہے۔

اگلے دن اتوار تھا اور میں نے آرام کرنا چاہا۔ میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں اپنا سفر نصف

شب کے بعد جاری رکھوں گا۔لہٰذا میرا خیمہ تیاری کے لیے باندھا گیا تھا۔ میں نے ڈاک خانے کے برآمدے میں سونے کی کوشش کی لیکن کیڑے مکوڑوں نے مجھے باہر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ اس وسط ایشیائی راستے پر ٹڈی دل کی طرح نازل ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں سونہ مرگ کے ڈاک خانے میں بھی ستایا اور جب ہم رو پہلی چاندنی رات میں چل پڑے تو میرا نوکر جو ایک سست رفتار مسلمان تھا، مجھے کشمیر کے پرانے بادشاہوں کے قصے سنا سنا کر وقت کاٹنے لگا۔ پھر ہم نو میل کا سفر طے کر چکے تھے اور پو پھٹنے پر ہم بال تل پہنچے تھے جو زوجیلا درے کے دامن میں واقع ہے۔ یہ ایک بلند درہ نہیں ہے کیونکہ اس کی اونچائی صرف ساڑھے گیارہ ہزار فٹ ہے البتہ یہ ایک خطرناک راستہ ہے کیونکہ سڑک اونچائی کی سمت میں جاتی ہے اور سخت برف اور یخ بستہ ڈھلوانوں پر چلنا نہایت دشوار ہے۔ اس راستے پر کارواں والے کئی ٹٹوؤں کو کھو بیٹھے ہیں۔ میرا بھی ایک ٹٹو پھسل کر نیچے گر گیا۔ لیکن اسے بہر حال بچایا گیا اور میرے سامان کو بھی کم سے کم نقصان پہنچا۔ میں واقعی اس کے لیے اپنے لالچی نوکر کا ممنون ہوں۔

درے کی چوٹی پر پانی کے ذخیرے کے پاس برف کی چادر میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک یخ بستہ سمندر کی طرح تھی جہاں برف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں بٹی ہوئی تھی جن سے گویا لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لہٰذا ان پر چلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگر گرمی کے موسم میں اتنی برف جمع ہو تو ڈاک رسانوں کی مشکلات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور پھر اس شخص کے حالِ بد کا بیان واضح ہے جو گرما میں یہ کام انجام دے۔

یہ کہانی مجھے ایک موراوی مشنری نے بتائی جو لداخ کی راجدھانی لیہہ جا رہا تھا تا کہ وہ بمبئی میں اپنی دلہن سے بھی مل سکے۔ وہ موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی اس سفر پر نکلا جو دروں کو پار کرنے کے لیے سب سے سخت ترین موسم ہے۔ جب وہ زوجیلا درے کے قریب پہنچا تو اسے ایک ہوائی طوفان نے آگھیر لیا۔ اسے جلد ہی پتہ چلا کہ وہ اپنا راستہ کھو بیٹھا ہے کیونکہ تازہ برف باری نے ڈاک رسانوں کا سارا راستہ بند کیا ہوا تھا۔ یہ زبردست سردی کا موسم تھا اور وہ آنکھوں کو اندھا کرنے والی برف میں اپنا راستہ نہیں دیکھ سکا۔ برف کے گالوں کے تھپیڑے اس کے چہرے پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک راہ تلاش کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اس نے جدوجہد

کرنا چھوڑ دیا۔ چونکہ رات قریب آ رہی تھی، اسے اب زندہ رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اسے خیال آیا کہ اب تو کوئی دعا ہی اسے بچا سکتی ہے اور وہ زور زور سے خدا سے زندگی کی خیرات مانگنے لگا۔

اس نے اپنی مناجات ختم ہی کی تھی کہ اسے ایک انسانی صورت سی نظر آئی جس کے بارے میں اس نے خیال کیا کہ یہ کوئی ڈاک رساں ہی ہوسکتا ہے۔ وہ کسی حد تک شکرانہ خداوندی کے ساتھ اس صورت کے پیچھے ہولیا لیکن وہ اچانک اوجھل ہوگئی۔ وہ پھر وہیں چلا گیا جہاں اس نے یہ صورت دیکھی تھی۔ یہاں اسے برف میں ایک بڑا سوراخ دکھائی دیا۔ وہ اس میں اُتر گیا جہاں اس نے برف کی ایک پناہ گاہ دیکھی جو غالباً ڈاک رسانوں نے اپنی حفاظت کے لیے بنائی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پناہ گاہ خالی تھی اور وہاں پر کوئی نہیں تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی دعاؤں کا غیر متوقع طور پر مثبت جواب دیا گیا ہے اور اس کی زندگی آئندہ خدمات کے لیے بچائی گئی ہے۔

میں جب جون کے مہینے میں اس درے کو پار کر رہا تھا مجھے میلوں تک پھیلی ہوئی برف کو روند کر چلنا پڑا۔ مجھے اس وقت خوشی محسوس ہوئی جب میری نظروں کے سامنے چٹانیں اور گھاس دکھائی دیں۔ میں کوئی ساڑھے تین بجے تک چلتا رہا۔ مجھے زبردست تھکاوٹ محسوس ہورہی تھی اور نیند بھی مجھ پر غالب آ رہی تھی۔ کیونکہ میں اس سفر پر گذشتہ شب کو بارہ بجے روانہ ہوا تھا۔ میں اپنے بوجھ بردار ٹٹوؤں سے آگے نکل چکا تھا۔

میں ستانے کے لیے سڑک کے ایک کنارے لیٹ گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرا نوکر مجھے کچھ گھنٹے بعد گھور رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سورج پہاڑوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ اور اب ٹٹوؤں اور سامان کے ساتھ کوچ کرنے کا وقت آ چکا تھا۔ مٹیان کے مقام پر تعمیر کردہ پتھر کے چھوٹے مکان قریب ہی تھے۔ مجھے اس بات سے اطمینان ہوا کہ اب کھانے اور آرام کرنے کی سہولت حاصل ہوسکتی ہے۔

اس سے پہلے زبردست بارش ہوئی تھی کیونکہ جب ہم اس آرام گاہ میں داخل ہوئے تو ہم نے اسے پانی میں ڈوبا ہوا پایا۔ یہ اس لیے بھی ہوا تھا کہ اس مکان کی بنیاد سڑک کی سطح سے نیچے

تھی۔ بہر حال میرے پلنگ کے پایوں تک پانی نہیں پہنچ سکا تھا، میں اس میں بھیگ نہیں سکا اور میں اپنے آپ کو ٹنڈؤں سے بھی بچا کر رکھ سکا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وسط ایشیا کو جانے والی اس سڑک پر اسی طرح کی آرام گاہیں بنائی جاتیں تا کہ راہ گیران میں دورانِ سفر پناہ لے سکتے۔ غالباً میں مبالغہ سے کام لے رہا ہوں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ اب اس شاہراہ پر جگہ جگہ ایسی آرام گاہیں تعمیر کی گئی ہیں۔ ضیان سے دراس کی پہاڑی وادی کی جانب ایک حرارت بخش سفر تھا۔ یہاں جو پتلے سے درخت مجھے یاد ہیں وہ پنسل کی جسامت کے دیودار تھے۔ ضیان سے آگے کی طرف راستے میں چونے کے خزانے نظر آتے ہیں۔ زور زور سے بہتا ہوا دریا گویا ہر شخص کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ میں اپنے ہم سفروں سے چند میل آگے نکل چکا تھا اور میرے پاس نہانے کے لیے کافی وقت تھا۔ پھر بھی یہ نہانا کوئی آسان عمل نہیں تھا کیونکہ پتھریلے فرش پر نوکیلے کنارے سے اس طرح کا کام میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔

میں نے ابھی پانی میں جسمانی راحت کا وقت گزارا بھی نہیں تھا کہ مجھے اپنے قریب ہی دو کالی آنکھیں گھورتی نظر آئیں۔ وہ لمبے سیاہ بالوں والے لوگ تھے۔ میں فوراً پانی سے باہر نکل آیا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ میرے کپڑے چرائیں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اس بے برگ و گیاہ ویرانے میں بغیر کپڑوں کے کیا کرتا؟، جہاں سورج کی تیز کرنیں میرے ننگے بدن میں چھید کر رہی تھیں وہاں کوئی ایسا درخت بھی موجود نہیں تھا جس کے پتوں سے میں اپنا تن ڈھانپ لیتا۔ لہٰذا میں نے گیلے بدن پر ہی جلدی جلدی کپڑے پہنے اور میں ان کالی آنکھوں کو دیکھتا رہا اور میرا ہاتھ اس کوہ پیما چھڑی پر جما رہا جس کے ایک سرے پر لوہے کی نوک لگی ہوتی ہے۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ جب تک میں اپنے جوتوں کے تسمے مضبوطی سے نہ باندھوں مجھے ان سے نبرد آزما نہیں ہونا چاہیے کیونکہ چٹانیں بہت تکلیف دہ تھیں۔ یہ دو خوفناک چہرے والے غالباً مجھے اس لیے گھور رہے تھے تا کہ وہ میری مدد کریں اور ان کے دل میں مجھے لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے لداخ میں سنا تھا کہ یہاں کے لوگ بہت ایماندار ہیں اور یہاں کوئی بھی شخص اپنے مال و متاع کو چرائے جانے کے خوف سے بے خطر ہو کر اسے کسی بھی جگہ رکھ کر کہیں بھی جا سکتا ہے۔

نہانے کے بعد اگلی صبح مجھے کھانے کی طلب ہوئی۔ میری بھوک زوروں پر تھی کیونکہ میں

نے ناشتہ کئی گھنٹے پہلے کیا تھا۔ میری ملاقات لمبی داڑھی والے دو افراد سے ہوئی جن کے پاس مکئی کی بڑی بڑی روٹیاں تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک روٹی خریدی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انھیں کب سینکا گیا تھا کیونکہ یہ پتھر کی طرح سخت اور بے مزہ تھیں۔ بہر حال میں نے انھیں ایک نالے میں کچھ دیر تک ڈبوئے رکھا جب ہی میں انھیں کسی حد تک حلق سے نیچے اتار سکا۔

بعد میں میں نے چند گاؤں والوں کے ساتھ دوستی کر لی اور وہ بھی خیر سگالی کے اس عمل میں میرے لیے ڈھیر سارا دودھ لے کر آئے۔ میں اُس وقت بے حد پیاسا تھا اور میں نے یہ سارا دودھ غٹا غٹ پی لیا۔ میں ان مہربانوں کے ساتھ تب تک بیٹھا رہا جب تک کہ مجھے اپنا کارواں قریب آتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ اس کے آنے پر ہم نے سفر جاری رکھا اور ہم ایک وسیع اور سرسبز خطۂ زمین پر پہنچ گئے جسے ہوا نے گویا جھاڑ و پھیر کر صاف کیا ہو۔ یہاں ہمیں پتھر اور مٹی کے چند مکان بنے ہوئے نظر آئے۔ اس جگہ کو دراس کہتے ہیں جو ملک دراس کا صدر مقام ہے۔

یہاں میں نے ایک برطانوی افسر کو پہاڑی بکروں کا شکار کرنے کے بعد واپس ہندوستان جانے کے سلسلے میں ایک خیمے میں مقیم دیکھا۔ میرا خیمہ بھی اسی جگہ نصب کیا گیا۔ میں نے چائے پی لی جس سے مجھے بشاشت نصیب ہوئی کیونکہ میں اس بے برگ و گیاہ وادی میں اترائی پر چلتے چلتے نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ دریں اثنا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس سے خوف زدہ ہو کر میں نے خیمے کے ایک کھمبے کے ساتھ اپنے آپ کو چپکا یا تا کہیں خیمہ زمین بوس نہ ہو جائے۔ میرا نوکر بھی خیمے کے کھمبے پوری طاقت سے زمین میں زور زور سے دباتا رہا۔ اسی دوران میں نے چیخیں سنیں اور دیکھا کہ برطانوی افسر کا سامان خیمے سے چیتھڑوں کی شکل میں باہر کی جانب اڑ رہا ہے۔ تیز ہوا تھم گئی اور پھر ایک بار ہر طرف سکون اور امن کا ماحول لوٹ کر آیا۔ اب صرف دراس کے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی کرخت آوازیں ہی کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔

اگلے روز ہم کرگل میں کمشنر کے کیمپ میں پہنچ گئے اور وہاں ناشتہ کیا۔ اُس کی جماعت میں ساڑھے چھ فٹ قد والا دیو قامت مسٹر بیچ؛ اس کی بیوی مسز ڈزاہ جس کا شوہر ایک نامور کھلاڑی ہے۔ لیہہ میں اس کا انتظار کر رہا تھا، جیک فیلپس اور پی، ایچ چرچ جو یانگ کانگ کی دس میل لمبی جھیل کی طویل مہم پر تھے اور چانگ چیمو شامل تھے۔ ان لوگوں نے میرا والہانہ استقبال

کیا اور میری بھوک کا خیال رکھتے ہوئے ناشتہ پیش کیا۔

کرگل پورک نامی ضلع کا صدر مقام ہے اور یہاں شیعہ مسلمان رہتے ہیں۔ کرنل وارڈ نے ان کے مردوں کی تدفین کے حوالے سے ایک عجیب رسم بیان کی ہے کہ یہ لوگ اپنی میتوں کی قبر پر ایک سوراخ کرتے ہیں جس پر مستری ایک صندوق بناتا ہے جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ اور ایک کھڑکی رکھی جاتی ہے۔ اس سوراخ کے راستے میت پر آٹا ڈالا جاتا ہے، یہ عمل وقفے وقفے سے تین ماہ تک جاری رہتا ہے اور اس کے بعد یہ سوراخ بند کیے جاتے ہیں۔

اُس صبح صوبے کے گورنر نے ہمیں بلایا۔ وہ ایک کوتاہ قد کشمیری برہمن تھا لیکن اپنی چھاتی کے نچلے حصے کی جسامت سے لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کی خوب دیکھ بھال کرتا ہے۔ کپتان ٹرنچ نے اس سے کہا کہ وہ اناج کے حساب کتاب کے کاغذات دکھائے کیونکہ وہاں اس موسم خزاں میں غلے کی قلت پیدا ہوئی تھی۔ اسے ہدایت ملی تھی کہ وہ ہنگامی صورتحال کے پیش نظر اناج کے بڑے ذخیرے محفوظ رکھے۔ اس غرض کے لیے پہاڑی پر قدیم قلعے کو منتخب کیا گیا تھا۔ حساب کتاب کے کاغذات پیش کیے گئے اور انھیں دیکھ کر کپتان ٹرنچ نے دیکھا کہ ہدایات کو ایمانداری کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے اور قلعہ گورنر کی چھاتی کے نچلے حصے کی طرح اناج سے بھرا ہوا تھا۔ کپتان ٹرنچ خوش ہوا۔ اس نے گورنر سے کہا کہ اس نے اتنا سارا غلہ کس طرح اس گودام میں محفوظ رکھا تھا اور یہ بھی کہا کہ وہ اسی دن بعد دوپہر تین بجے قلعے کا معائنہ کرے گا۔

ڈھائی بجے گورنر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دوبارہ ہمارے کیمپ میں پہنچا۔ اس نے کمشنر صاحب اور اس کی جماعت کو اُس کے گھر پر چائے پینے کی دعوت دی۔ لیکن اس روز سخت گرمی تھی اور خاص کر خواتین کے لیے کوئی ساڑھے چار بجے کا وقت موزوں رہتا۔ کپتان ٹرنچ نے دعوت قبول کر لی لیکن یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ بہرصورت پہلے قلعے کا معائنہ کریں گے اور اس کے بعد چائے کی نشست ہوگی۔ ہم سب پہاڑی پر سے قلعے کے پاس پہنچے۔ جونہی ہم وہاں پہنچے تو گورنر نے کپتان ٹرنچ سے پھر کہا کہ وہ پہلے اس کے گھر پہنچیں اور اس کے بعد ہی قلعے کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ گورنر کی رائے میں گرمی اتنی زیادہ نہیں تھی اور شام کو سخت سردی ہوگی۔ کپتان ٹرنچ انکار نہیں کر سکا اور ہم سب گورنر کے گھر کی جانب چل پڑے۔

جب ہم بہت بڑے دروازے سے چار پہلو میں داخل ہو گئے تو کپتان ٹرینچ نے گورنر سے پوچھا کہ ذخیرہ کرنے کے گودام کہاں پر ہیں؟ گورنر نے ایک مخصوص دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس نے چپراسی سے چابیاں لانے کو کہا۔ یہ چپراسی دیر تک غائب رہا لہٰذا گورنر نے پھر کپتان ٹرینچ سے کہا کہ دریں اثنا اس کے گھر میں چائے پی جائے۔ تب تک چپراسی چابیاں بھی لے کر آئے گا۔ مگر کپتان ٹرینچ اپنی بات پر اڑا رہا کہ وہ پہلے گوداموں ہی کو دیکھے گا۔ اس نے گورنر سے کہا کہ وہ چپراسی کو فوراً لانے کا انتظام کرے۔ ایک اور شخص کو چپراسی کو لانے کی خاطر بھیجا گیا آخر کار چپراسی ہانپتا ہوا واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک بڑا گچھا تھا جس سے اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ ہر چابی کو آزماتا رہا لیکن کوئی بھی چابی قفل کے سوراخ میں گھس نہیں سکی۔ گورنر نے پھر چائے کی بات چھیڑ دی اور اپنے چپراسی کی بیوقوفی پر معافی کا خواستگار ہوا۔ گورنر نے یہ بھی بیان کیا کہ اصل چابی لانے دوسرا شخص گیا ہے۔ ٹرینچ نے ہدایت دی کہ اس شخص کے پیچھے بھی ایک اور شخص کو بھیجا جائے۔ گورنر نے کہا کہ ایسا ہی ہو گا لیکن اصل چابی لانے میں دیر ہو گی لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ فی الحال چائے نوش کی جائے۔ اب کپتان کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا تھا۔ اس نے کہا: ''اب چابیوں کی ضرورت نہیں۔ ہم اس دروازے کو اس بھاری کھمبے سے توڑ ڈالیں گے'' جو وہیں پر دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ گورنر نے ایسا نہ کرنے کی منت کی اور وعدہ کیا کہ وہ ایک اور شخص کو دوڑتا ہوا چابی کے لیے بھیج دے گا۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ شخص دھونکنی کی طرح سانسیں لیتا ہوا اور کھانستا ہوا ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد بہت جلد واپس آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک اور قسم کی چابیوں کا گچھا تھا۔ ان چابیوں کو بھی استعمال میں لایا گیا مگر قفل نے کھلنے سے پھر انکار کیا۔ گورنر نے اس بلا وجہ تاخیر پر اظہارِ افسوس کیا۔ وہ چائے کی پیش کش دوہرانے والا ہی تھا کہ لوہے کے دمدے کو کام میں لایا گیا(1)۔ گورنر نے سوچا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے، وہ ایک طرف کو ہو لیا۔ دمدے نے اپنی طاقت دکھائی اور دروازہ کھل گیا جو پوری طرح خالی تھا اور اس میں اناج کی ایک بوری بھی موجود نہیں تھی۔

کپتان ٹرینچ گودام سے باہر آیا اور گورنر سے خشم آگیں لہجے میں پوچھنے لگا: ''آپ مجھے اس

خالی گودام میں کیوں لائے؟ میں تو اناج سے بھرے ہوئے گودام دیکھنا چاہتا ہوں"۔ گورنر معافی کا خواستگار ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ نوکروں نے اسے بیوقوف بنایا ہے۔ پھر اس نے اپنے اہل کاروں کو وہ گودام کھولنے کی ہدایت دی جن میں غلہ بھرا تھا۔ ان نوکروں کی ٹانگیں تذبذب میں تھر تھرانے لگیں۔ وہ سوچنے لگے کہ کیا وہ اُس حکم کی تعمیل کریں گے جو گورنر نے کپتان کی آمد سے پہلے دیا تھا یا اُس ہدایت پر عمل کریں جواب انھیں دی گئی ہے؟

چابیوں کے اس اضطراب میں پھر وقت کا زیاں ہوا اور کپتان نے اس سارے معاملے کو اُس وقت ختم کر دیا جب وہ لوہے کے دمدمے کی طرف بڑھا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کی مدد کروں۔

دروازہ کھل گیا لیکن ہم نے اس گودام کو بھی سراسر خالی پایا۔ بالآخر یہ کھیل اس وقت تمام ہوا جب اس کا مرکزی کردار یعنی گورنر کپتان کے پاؤں پڑ کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے رحم کرنے کو کہا۔ کپتان ٹرینچ نے اس سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے اور وہ اسے اگلے دن عوامی دربار میں ملے گا۔ لہٰذا گورنر کے ساتھ ہماری چائے منسوخ ہوئی اور ہم اس واقعے کے بارے میں سوچتے ہوئے واپس کیمپ میں پہنچ گئے۔ کپتان ٹرینچ نے اس بدمعاش کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہاں فاقہ کشی میں مبتلا لوگوں تک ایک خالی گودام سے کس طرح خوراک پہنچائی جائے؟

اگلا دن ایک شاندار دن تھا۔ کئی اہل کار ہر طرف سے ٹٹوؤں پر سوار ہو کر آئے جن میں سے چند ایک سو میل کی مسافت طے کر کے آئے تھے۔ ان میں چوکیدار، چکدار، نمبردار، ذیل دار، تحصیل دار، تھانے دار اور نہ جانے کون کون راجے اور وزیر شامل تھے۔ وہ ایسے اعلیٰ کپڑوں میں ملبوس تھے کہ ان کا نظارہ آنکھوں کو بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ سبھی نہایت خوش تھے کیونکہ انھوں نے سُن لیا تھا کہ صاحب نے کس طرح ایک برہمن گورنر کو پکڑ لیا تھا۔ البتہ کچھ تو غم زدہ اور پریشان تھے کیونکہ گورنر کی اس ذلت آمیز لوٹ مار میں وہ بھی اُس کے شریکِ کار رہے تھے۔ اگرچہ انھیں بھی اس ڈاکہ زنی کا پتہ چل چکا تھا مگر انھوں نے اس پر سے پردہ اٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی کیونکہ گورنر ایک زبردست شخصیت تھا، وہ ایک اعلیٰ خاندان کا فرد تھا اور اسے دربار میں خوشنودی حاصل تھی۔

کپتان ٹرنچ نے اپنا اگلا قدم مشتہر کر دیا کہ اس بدمعاش کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پھر اسے اس بلند تر جگہ پر حیوانوں کے لیے پکائی گئی غذا کھلائی گئی کہ اس کے چہرے کا رنگ کالا پڑ گیا۔ میں نے آج تک ایسی سزا کا ذکر تک نہیں سنا تھا۔ ہم یہ عجیب نظارہ بہتے دریا کے پاس ایک باغ میں بیٹھ کر دیکھتے رہے جس کے چاروں طرف خاموش پہاڑ اس عدالتی فیصلے کے چشم دید گواہ تھے۔

کپتان ٹرنچ اس تگ و دو کے بعد تھک چکا تھا لیکن وہ ایک زندہ دل شخص تھا اور ہر وقت بلند خیالی اور مزاحیہ انداز کلام کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ اس نے دن میں ایک غیر دلچسپ کام غیر متوقع طور پر انجام دیا تھا اور اسے اس پر واقعی فخر ہونا چاہیے تھا۔

وہ رات گورنر کے لیے نہایت دل آزار رہی ہوگی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ دریا کے کنارے ہمیں زور کی آندھی نے جگایا۔ ہم فوراً بستروں سے باہر نکل آئے اور اپنے سامان کو بچانے میں لگ گئے۔ میں نے دیکھا کہ میں بستر پر لیٹا ہوں اور میرا خیمہ سارے کا سارا مجھ پر آن گرا ہے۔ یہ خیمہ مجھ پر اسی طرح براجمان رہا جب تک کہ آندھی رکی نہیں تھی۔ مجھے اس طرح اپنی شکست دیکھ کر اپنے آپ پر غصہ آ گیا لیکن اس سلسلے کا ایک دلچسپ پہلو بھی ہے۔

اگلے روز ہم نے لیہہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ یہ سفر بہت طویل اور موسم کی گرمی کا شکار تھا کیونکہ راستے میں کہیں کوئی چھاؤں نہیں تھی۔ پہاڑوں پر سے روشنی اور حدت کا عکس ہمارے لیے تکلیف دہ بن گیا تھا۔ ہم میں سے ایک شخص کی آنکھوں پر کالا چشمہ لگا تھا جس سے وہ قدرے مطمئن تھا۔ ہم ہر صبح ساڑھے چار بجے نکل کر دس بجے تک چلتے رہتے اور کوئی چھاؤں دیکھنے کے بعد وہاں شام تک قیام کرتے۔ پھر رات کی ٹھنڈ میں سفر جاری رکھتے۔

وسط ایشیا اور چین سے دو کارواں آ رہے تھے جنھیں دیکھ کر ہم میں ایک عجیب سی دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ سُرا گائیوں پر بوجھ لادے ہوئے تھے اور چند ایک نے تو اپنا سامان بھیڑوں پر لاد رکھا تھا۔ یہ وہی بھیڑیں تھیں جن کی دُم کافی موٹی اور کشادہ ہوتی ہے۔ بھیڑوں سے سامان اٹھوانا ایک عملی اقدام ہے کیونکہ جب ان پر لدی ہوئی خوراک کھائی جاتی ہے تو ان کی کوئی ضرورت نہیں

رہتی اور انھیں ذبح کر کے کھایا جاتا ہے اور موٹی دم کا گوشت سب سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ ان کاروانوں میں سے چند ایک تو گھر پہنچنے سے پہلے تین سال تک سفر میں رہے تھے۔ ان میں سے اکثر عازم مکہ شریف گئے تھے اور پھر سبز دستاروں پر یہ عبارت جلی حروف میں لکھوا کر لوٹ رہے تھے کہ: ''میں ایک زائر ہوں جس نے حج کا فریضہ ادا کیا ہے''۔

پہلی بودھ خانقاہ ہم نے ملبے کی جگہ پر دیکھی جو ایک بلند مقام پر ایک چٹان کے سرے پر کوئی پانچ سو فٹ کی اونچائی پر واقع تھی۔ اس خانقاہ تک پہنچنے سے پہلے گوتم بدھ کا ایک بہت بڑا بت ہے جسے ایک چٹان سے تراشا گیا ہے اور جو تیس فٹ اونچا ہے۔ ہمارے واپسی کے سفر میں ڈاکٹر نیو اور میں اس جگہ اس وقت پہنچے جب وہاں ایک مخصوص رسم ادا کی جا رہی تھی۔

اس بت کے سامنے ایک کھمبے کو ایستادہ کیا گیا تھا جسے رنگین کپڑوں کے چیتھڑوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ پھر تیس بچوں کا ایک گروہ نمودار ہوا جو رنگین اور چمکدار کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر پھولوں کے تاج تھے۔ وہ اس کھمبے کے ارد گرد ناچ کر گاتے رہے۔ پھر سفید کپڑوں میں ملبوس ایک لاما آگیا جو کسی عیسائی راہب کا جیسا لباس زیب تن کیے تھا اور اس کے سر پر احمقوں کی سی سرخ ٹوپی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کشمیری کانگڑی تھی جس میں انگارے دہک رہے تھے اور ان کے ساتھ بھنگ یا افیون کی نشہ آور ملاوٹ تھی۔ وہ اس کانگڑی سے دھوئیں کو زور زور سے ناک کے اندر کھینچتا رہا جس کی بنا پر وہ جوش میں آ گیا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک مخروطی تلوار تھامی تھی جسے وہ ایک خطرناک انداز میں ہوا میں لہراتا رہا۔ پھر وہ بھی کھمبے کے ارد گرد ناچنے لگا اور بچے بھی اس کے ساتھ رقص کرنے لگے۔ یہ لاما زور زور سے چلاتا اور اپنے جسم کو پوری رفتار سے لہراتا رہا۔ اس دوران اس کی تلوار بھی لہراتی اور ہر طرف گھومتی رہی۔

ایک شخص نے جو میری جان پہچان کا تھا اور جو اپنے آپ کو نیک بندہ کہتا تھا، میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ لاما الہامی کتابوں کا ورد کر رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ افیون کے نشے میں چور تھا اور مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جلد ہی زمین کی مٹی چاٹ لے گا مگر ہم یہ سارا تماشہ دیکھنے سے پہلے ہی وہاں سے چلے گئے۔

فٹ نوٹ:

(1) یہ دمدمہ عام طور پر لوہے کا بنا ہوتا ہے جس سے کسی بھی سخت سے سخت دیوار میں سوراخ کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی میں اسے Battering-Ram کہتے ہیں کیونکہ اس کی شکل مینڈھے کے سر سے ملتی ہے۔

سترھواں باب

سفر نامۂ لداخ

(حصہ دوم)

مُلیے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہم نے باشان کے بیلوں جیسی آوازیں سنی تھیں۔ یہ آوازیں عام چیخ و پکار سے بالکل مختلف تھیں۔ اسی طرح ایک اور طرف سے بھی ڈھول بجنے کا شور سنا جس کے ساتھ جھنڈے بھی لہراتے ہوئے دیکھے گئے۔ اب ہم بودھ خانقاہ کے بینڈ کو دیکھ رہے تھے۔ لاما اپنے بہترین کپڑوں میں ملبوس تھے جن میں ان کے سروں پر بندھی ہوئی پگڑی نما ٹوپی نہایت خوبصورت تھی۔ اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی نوکیں ہلمیٹ جیسی ٹوپی کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ یہ ڈھول کوئی سات یا آٹھ فٹ لمبے تھے اور ان کی آواز سے سارا ماحول دہل رہا تھا۔ پھر خانقاہ کا راہب اعلیٰ آیا جس کے ساتھ لاماؤں کی ایک فوج اور ملیے کی مشہور شخصیات بھی تھیں۔ یہ سبھی کمشنر صاحب کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ کھانے سے بھرے برتن اور اپنے گھروں میں بنائی ہوئی وہ شراب بڑی صراحیوں میں بھر کے لائے تھے جسے مقامی زبان میں چھنگ کہتے ہیں۔

ملیے میں ادیس بادشاہ کا ایک کتبہ دیکھا جا سکتا ہے جس کی رو سے جاندار حیات کی قربانی کو

ممنوع قرار دیا گیا ہے۔اس حکم نامے پر بہر حال عمل نہیں کیا گیا اور بودھ مت کے آغاز سے قبل قربان گاہوں میں بکریوں کی قربانی کا چلن جاری رہا۔اس عمل میں زندہ حیوان کا دل نکالا جاتا تھا(1)۔

بعد دوپہر ہمیں پولو کے کھیل سے محظوظ کیا گیا۔ یہاں ہر بڑے گاؤں میں پولو گراؤنڈ موجود ہے جس کی پوری دیکھ بھال کی جاتی ہے اور پانی کی متواتر بہم رسانی سے اسے سر سبز و شاداب رکھا جاتا ہے۔ یہ کھیل جن عوامل کے لحاظ سے مغربی پولو سے مختلف ہے، وہ کچھ یوں ہیں:

اوّل: میدان میں آر پار دونوں طرف پتھروں کی تین فٹ اونچی دیواریں بنائی جاتی ہیں جن کے ساتھ بال ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ان دیواروں کے ساتھ کسی نافرمان ٹٹو کو بھی وہاں پر بکھرے ہوئے پتھروں سے باندھا جاتا ہے جس سے اسے زبردست جسمانی اذیت پہنچتی ہے۔

دوم: یہاں سبھی کھلاڑی ایک ساتھ اور ایک ہی طرف سے میدان میں کود پڑتے ہیں۔ کھیل کا ناظم، قبل اس کے کہ یہ زمین پر آجائے، بال کو اپنی چھڑی کی پوری قوت سے ہوا میں پھینک دیتا ہے۔ بال سارے میدان کا احاطہ کر کے اگلے گول کے کھمبوں تک جاتی ہے جن کی نشاندہی دو پتھروں سے کی گئی ہوتی ہے۔لیکن تب تک گول کو تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک کوئی بھی کھلاڑی گھوڑے سے اتر کر اس بال کو گول پوسٹ کے اندر نہیں پھینکتا۔جب گول ہوتا ہے تو بینڈ باجے والے ترنگ میں آکر بجانا شروع کرتے ہیں۔اس موسیقی کی ادائیگی میں ڈھولوں کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے۔یہ پولو کھلاڑی انتہائی لاپروائی سے کھیلتے ہیں۔ میں نے بچشم خود کھلاڑیوں اور ٹٹوؤں کا خون بہتے دیکھا ہے جو دوڑ میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر لہولہان ہو جاتے ہیں۔کبھی کبھی تماشائی بھی دیوار کے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے زخمی ہو جاتے ہیں۔ یہ اس علاقے میں بہت قدیم اور عزت دار کھیل مانا جاتا ہے۔

بودھ خانقاہوں اور لاماؤں کی اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی جو جذبات باہر سے آئے ہوئے شخص پر حاوی ہوتے ہیں انھیں وضاحت سے بیان کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ چکا ہے جو انسانی تصور اور خواب وخیال سے معمور ہے۔وہ اپنے بدن کی چٹکی لینا چاہتا ہے تاکہ اسے یہ احساس ہو کہ کیا وہ واقعی جاگ رہا ہے یا کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔

سڑک پر انسان کو ایک سو سے تین سو لمبے دروں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو آٹھ فٹ لمبے اور آٹھ فٹ چوڑے ہوتے ہیں۔ ان کی چھتیں تراشے ہوئے پتھروں کی بنی ہوتی ہیں۔ ان پر جگہ جگہ یہ الفاظ کندہ کیے گئے دکھائی دیتے ہیں: "اوم مانے پدماہوں" ان کے معنی مجھے اس طرح بتائے گئے۔: "میرے خدا! میری روح پانی میں ایک زیور کی طرح ہو جو کنول کے پتے کے لبوں پر اس طرح رہتا ہے گویا یہ جھیل میں گرنے والا ہی ہے اور یہ پانی کے سمندر میں کھو جائے گا۔" جس کے معنی نروان میں گم ہونا ہے۔

یہاں لامایہ نیک کام کرتے ہیں اور اس کے عوض لوگ انہیں پیسے دیتے ہیں جو یہ پتھر دیواروں پر نصب کرتے ہیں۔ وہ سفر کرنے والے بھی عزت کماتے ہیں جو دیوار کے بائیں طرف چلتے ہیں، لیکن ان پر لعنت بھیجی جاتی ہے جو غلط سمت میں چلتے ہیں۔ یہاں پولیس والوں کی ضرورت نہیں جو ٹریفک والوں سے کہیں کہ بائیں طرف چلو۔ ہر سیاح خود ہی ایسا کر کے قابلیت کا نام کماتا ہے۔ پھر سڑک پر سیاح مسلسل طور پر چورٹان کے سنگی پگوڑوں کو دیکھتا ہے جن پر سفید چونے سے لپائی کی گئی ہوتی ہے۔ یہ پگوڑے کھیتوں میں اور پہاڑی اطراف میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تین سے چالیس فٹ اونچے ہوتے ہیں۔ یہ اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور ان میں کسی بھی شخص کو مٹی کے بنے ہوئے لاما ملتے ہیں جو اصل میں مردہ لاماؤں کی خاک سے بنے ہوتے ہیں۔ ان پر دل نشین نقوش بنے ہوتے ہیں جن میں بدھ کی صورت خاص طور پر ہر پگوڑے میں موجود ہوتی ہے۔

مکانوں کی چھتوں اور درختوں پر رنگین چیتھڑوں کے بنے جھنڈے لہراتے نظر آتے ہیں۔ جن پر بھی یہی دعا لکھی ہوتی ہے۔ جب یہ پرچم ہوا میں لہراتے ہیں تو اس پر لکھی دعا اوپر چڑھ کر جھنڈے والے کی دعائے خیر کا باعث بن جاتی ہے۔

ہم نے ایک دیہات سے گزرتے ہوئے چھتوں پر کاغذ کی ہوائی ملز (Wind Mills) دیکھیں جو گھروں کے اندر خیر و برکت کا سبب مانی جاتی ہے۔ ان پر بھی کئی بار "اوم مانے پدما ہوں" کی دعا درج کی گئی ہے۔ چند مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اور خانقاہوں میں گول گول شکل کی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جنھیں یہاں آنے والے ہاتھوں سے گھما گھما کر ثواب کما لیتے

ہیں۔کئی دیہاتوں میں عبادت کے ایسے ہی گول پہیے پانی سے گھومتے ہوئے دیکھے جو خود بخود دن رات دعا کرتے رہتے ہیں۔اخیر پر آپ کی ملاقات مرد اور عورت دونوں سے ہوگی جو سڑک پر دھات کے بنے ان پہیوں کو اٹھاتے ہوئے چلتے نظر آتے ہیں۔انھیں وہ کہنی کو موڑ کر کلائی پر اٹھاتے ہیں۔ان خوبصورت عبادتی پہیوں کو چاندی کے نقش ونگار سے سنوارا جاتا ہے۔

یہاں کے لوگ رنگین تصاویر والے رنگوں کا لباس پہنتے ہیں۔مرد اور عورتیں عام طور پر ایک لمبا سا اونی جبہ پہنتی ہیں جو بالعموم سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔کبھی اس کا رنگ سبز یا کوئی دوسرا ہوتا ہے۔مردوں کے پاس ایک لوہے کا بٹوہ جیسا ہوتا ہے جس میں وہ قسم قسم کے چاقو،ایک لمبا قلم دان اور روشنائی،تین لہروں والا چابک جس کا دستہ ہمیشہ دھات اور روغن سے سجا ہوتا ہے،چائے کے لیے ایک پیالہ،دلیا، اور آٹے کا ایک تھیلا شامل ہیں جسے دوران سفر خوراک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ان کا کھانا ہر وقت سادہ ہی ہوتا ہے۔وہ اپنے پیالے کو ٹھنڈے پانی سے بھر لیتے ہیں، اس میں آٹا ڈالتے ہیں،اسے اپنی شہادت کی انگلی سے ہلاتے ہیں اور پھر جب یہ آبی روغن سا ہو جاتا ہے تو اسے پیا جاتا ہے۔ایسے خوراک سے کسی کی بھوک نہیں مٹ سکتی بلکہ اس سے ان کا نظام ہاضمہ ہر وقت خراب رہتا ہے۔ان میں سے اکثر اپنے آزار بند کے ساتھ ایک نشان رکھتے ہیں جو سونے یا چاندی سے بنی ہوئی بدھ کی تصویر ہوتی ہے۔

تبت کے بودھ ایک مذہبی رسم میں روئی اور دیودار کا استعمال کرتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہ رسم نیسطوریائی عیسائیوں کے ہاتھوں چین سے آئی ہے جب سینٹ تھامس نے چین میں عیسائیت کو متعارف کیا۔یہاں ہر بودھ کے لیے اس کا اپنا لاما ہوتا ہے جسے وہ نذرانے بھی دیتا ہے۔ان کے سر کو کپڑے کی ایک ٹوپی ڈھانپتی ہے جس کے رنگ ان کے لباس سے الگ ہوتے ہیں۔لیکن میں اسے پوری طرح بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے آج تک ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی ہے۔یہ رنگین اور بدزیب بھی ہے۔یہ جسمانی ملبوسات بعینہ منگول خد و خال کے عین مطابق ہیں۔جس میں کمر پر لٹکا ہوا بالوں کا لمبا گچھا بھی ہوتا ہے۔عورتیں زیادہ تر مردوں ہی کی طرح کا پوشاک پہنتی ہیں۔صرف ان کا سروں کا لباس مختلف دکھائی دیتا ہے۔وہ ایک فراک پہنتی ہیں جو سرخ کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے اور جس کی چوڑائی چھ سے آٹھ انچ ہوتی ہے۔یہ پیشانی سے

لٹک کر کمر سے ہوتا ہوا اس کی نچلے طرف تک پہنچتا ہے۔اسے قیمتی پتھروں سے آراستہ کیا جاتا ہے جن میں کھردرے قسم کے نقرئی زیورات بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ رسم جس کی رو سے ان کی روسیان کی دولت ان کے سروں پر لدی ہوتی ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کس قدر ایماندار ہیں۔ پھر چہرے کے دونوں طرف کپڑے کے ایک ٹکڑے پر استر خوان کے دو حصے سلے ہوتے ہیں جو بوقتِ ضرورت صحیح طرف سے کالے پروں کی شکل میں تقریباً چھ انچ باہر نکلتے ہیں۔

اس خطے میں عورتیں پردے میں نہیں رہتیں۔ ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ وہ نہ تو شرمیلی ہیں اور نہ ہی بہادر۔ وہ ہمیشہ اپنے مردوں کی طرح مسکراتی رہتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی چند صفحات میں کہا ہے کہ جب کوئی لداخ میں داخل ہوتا ہے تو گویا وہ ایک خواب دیکھتا ہے کیونکہ یہ ملک اور یہاں کے لوگ ہر لحاظ سے مختلف ہیں۔ یہاں کے عوام اور عمارات ہی نہیں بلکہ ارد گرد کی پہاڑیاں بھی الگ تھلگ نظر آتی ہیں۔ یہ لاماؤں کا رواج ہے کہ وہ اپنی خانقاہوں کو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر تعمیر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی خانقاہ سے پہاڑی چوٹی کو اور چوٹی کو خانقاہ سے الگ کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ یہاں کی ہوا بھی عام ہوا سے زیادہ قریب لگتی ہے لہٰذا یہ حقیقت میں جہاں ہوتی ہے وہاں سے نزدیک محسوس ہوتی ہے۔ پہاڑیاں اور کھائیاں جن پر درخت یا گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اُگتا خوبصورت رنگوں میں نہا جاتی ہیں اور روشنی اور سائے بھی اسی طرح واضح ہو جاتے ہیں جس طرح ہم نے انھیں نہیں دیکھا ہے۔

فٹ نوٹ:

(1) دیکھیے: ڈاکٹر ای۔ ایف۔ نیو کی کتاب *Beyond the Pir Panjal*

اٹھارھواں باب

سفرنامۂ لداخ

(آخری قسط)

چلیے اب ہم ایک بودھ خانقاہ کو دیکھ لیں۔ جونہی ہم لامایارو کے قریب پہنچے ہمیں وہاں پر شور اور گرد و غبار کا سامنا کرنا پڑا۔ خانقاہ کا باجا گویا کسی جنگی مہم پر نکلا تھا۔ اس نے زور زور سے آلاتِ موسیقی بجا بجا کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ پھر خانقاہ کے اہل کاروں کے ہجوم اور دیہات کی سرکردہ شخصیات نے ہر طرف گرد کے انبار اڑائے۔ خانقاہ ہمیں ایک اعلیٰ مرتبے کے لاما نے دکھائی۔ ہم پتھروں کے زینے سے ٹانگیں پھیلی ہوئی خانقاہ کی طرف اوپر چڑھ گئے جو حسب معمول چوٹی کے اوپر واقع تھی۔ لیکن اسے اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ چٹان کا سرا دیکھنے میں نہیں آسکتا تھا۔ زینے کے اطراف میں دیواروں سے مناجاتی پہیے لگے تھے۔ جو روایتی انداز میں گھومنے کے لیے رکھے گئے تھے۔ ہم نے انھیں صحیح طریقے سے دائیں سے بائیں گھمایا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم نے یہ کام اچھے طریقے سے کیا کیونکہ ہمارا سفر ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ یہ جگہ بہت سی دلچسپی کی چیزوں سے بھری پڑی تھی اور اب یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی چیز دیکھی جائے۔ اس عبادت گھر میں ایسی ایسی مصنوعات تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہ عمارت ایک وسیع ہال کی طرح

تھی جس کی چھت کو لکڑی کے ستونوں نے سہارا دیا تھا۔ اردگرد ایک غلام گردش سے کئی اقسام کے پھر پھرے لٹک رہے تھے جن پر خاص طور پر چینی اژدہے کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ اس ہال کے ایک طرف مجسموں کی ایک قطار تھی۔ جو قد آدم گوتم بدھ اور مقدس لاماؤں کی شبیہیں دکھاتی تھیں۔ ان میں سے ہر مجسمے کے سامنے ایک میز یا ذبح خانہ رکھا گیا تھا جس کے نقوش عجیب کاریگری کے نمونے تھے۔ ان پر تیز لال، سبز، زرد اور طلائی رنگوں سے گل کاری اور اژدہوں اور پاکیزہ نشانات کی تصویر کشی کی گئی تھی۔

میزوں پر دھات کے پیالے اور صراحیاں تھیں اور ہر میز پر مقدس پانی کا ایک برتن رکھا گیا تھا جس کے ساتھ مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ یہاں چھنگ کے پیالے اور دورجی نام کی نقرئی گھنٹی، جو لاما عبادت کے دوران استعمال کرتے ہیں، رکھی گئی تھی۔ مزید برآں انسانی کھوپڑی سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا ڈھول، ایسی ہی کھوپڑیوں سے بنی صُراحیاں اور انسان کی ران کی ہڈی بھی دیکھی گئی جو ڈھول بجانے کے کام آتی تھی۔

خانقاہ کے بیچوں بیچ بینچوں کی قطار ہے۔ جو مجسموں کے ساتھ لگی ہے اور جہاں لاما اپنی مقدس کتابیں پڑھتے وقت ذبح خانے کی طرف جھکتے ہیں۔ بائیں طرف تانبے کے برتن ہیں جن میں چھنگ نام کی شراب بھری ہے۔ اس کی مے خوری سے لاما اس وقت راحت محسوس کرتے ہیں جب وہ مقدس کتابوں کا مسلسل مطالعہ کرتے ہوئے تھک جاتے ہیں۔ بائیں طرف بہت سی درازیں ہیں جن میں یہ کتابیں رکھی گئی ہیں۔ یہ مخطوطات اطلس کے لمبے ٹکڑوں پر تحریر کیے گئے ہیں۔

اس خانقاہ میں پانچ ایسی الگ تھلگ جگہیں ہیں جنھیں برابر صاف رکھا جاتا ہے۔ جب کسی مشہور ہستی کی موت ہو جائے تو لاماؤں کو مقدس کتابوں سے عبارات پڑھنے کے لیے پیسے دیے جاتے ہیں۔ وہ الگ الگ کتابوں سے مخصوص صفحات منتخب کر کے انہی سے اونچی آواز میں پاٹھ کرتے ہیں۔ ان کے متن الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کی آوازیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا اس پڑھنے کے ساتھ بلند آواز کا بھی کوئی فائدہ ہے جو ہزاروں الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے ظاہری طور پر ایک میکانکی طریقے سے مغفرت کی دعائیں

پڑھنے کا گُر سیکھ لیا ہے۔ جب لداخ میں بجلی آئے گی اور دعا کے پہیے موٹروں سے چلائیں گے تو اس سے اس عمل کی افادیت بڑھے گی اور نروان ہر ایک کی قسمت میں شامل ہوگا۔ اس جگہ کی صفائی ضروری لگتی تھی۔ اس کے اندر چراغ کے تیل اور جلتی چربی کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ دراصل یہ بدبو ہر اُس چیز سے آ رہی تھی جسے لاماؤں نے چھوا تھا کیونکہ وہ انتہائی گندے ہوتے ہیں۔ ان کے سرخ لباس تیل سے کالے پڑے ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے سر منڈھے ہوئے تھے۔ وہ کئی کئی بھائی تھے اور ہمیشہ ہنسنے ہنسانے اور لطیفے سنانے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ وہ قدیم مغرب میں لاماؤں کی تصویروں کے ہم شکل دکھائی دیتے تھے۔ یہاں الگ مکانوں میں خواتین لامائیں رہتی ہیں جن میں سے اکثر مردوں کی شکل وصورت کی ہیں اور انھیں عورت کی حیثیت میں پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ خاص کر اگر وہاں پر کوئی انجانا شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے جس کی مثال مندرجہ ذیل واقعے سے دی جاسکتی ہے۔

کچھ دن بعد میں ڈاکٹر نیو کے ساتھ لیہہ میں تھا۔ وہ ہسپتال میں مریضوں کے علاج معالجے میں مصروف تھا۔ میں باہر اُن بیماروں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا رہا جو اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر مضطرب اور خوف زدہ تھے۔ میں نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جو بہت ہی غم زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک لاما تھا اور کسی حد تک بے اطمینانی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں اِنگلیاں ڈالیں اور اس سے کہا کہ وہ خوش رہے۔ اسی وقت مجھے پیچھے سے یہ بلند آواز سنائی دی: ''ارے ذرا کچھ خیال کرو کہ تم کیا کر رہے ہو کیونکہ یہ ایک خاتون لاما ہے''۔ میں نے ایک انگریز کی طرح معافی مانگ لی مگر اس کا اس عورت پر کوئی اثر نہیں پڑا کیونکہ وہ بدستور منہ لٹکائے بیٹھی رہی۔

ہم شان وشوکت سے صدر مقام لیہہ پہنچ گئے جس کی آبادی سرما میں تین ہزار نفوس اور گرمیوں میں چھ ہزار افراد ہوتی ہے جب مشرق ومغرب سے بھی تاجر یہاں وارد ہوتے ہیں۔ یہ شہر بہت ہی محظوظ کرنے والا اور دلچسپ تھا۔ خانقاہوں اور قصبوں کے بینڈ باجے، دعوتیں اور پولو کے میچ ایک دوسرے کے بعد ہی واقع ہوتے تھے۔ لیکن لیہہ میں جو استقبالیہ کمشنر صاحب کو دیا گیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ لیہہ سے سات میل دور وادیٔ سندھ میں، جو ایک وسیع ریتلا میدان ہے،

ہماری آؤ بھگت مقامی لوک فن کاروں نے کی جو قسم قسم کے رنگا رنگ اور روایتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ اشخاص چینی ریشم کے کپڑوں میں ملبوس تھے جن کے سروں پر نیلی اور سنہری ٹوپیاں ایک الگ ہی نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ ان میں مختلف عہدوں کے لداخی اہل کار بھی تھے جن میں ایک قبول صورت مسلمان جوائنٹ کمشنر بھی تھا، ہاتھی کی جسامت کا اس کا بابوٹو پر ایک بندر کی طرح بیٹھتا تھا۔ وہ اتنے موٹے جسم کا مالک اور کوتاہ قد تھا کہ اس کی کہنیاں اور پھولا ہوا پیٹ ایک دوسرے کے ساتھ گویا جڑے ہوئے تھے۔ البتہ جس شخص نے میری ساری توجہ اپنی طرف مبذول کی وہ کیتھولک گرجے کا پادری تھا۔ اس کی شکل ان سارے پادریوں سے ملتی جلتی تھی جو حکایتاً عدم سے واپس آ گئے تھے۔ وہ ایک لمبا چغہ پہنے ہوئے تھا جو ٹٹو کی پیٹھ سے پیچھے کی طرف نیچے لٹک کر زمین کو چھو رہا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی پادریوں کی ٹوپی اس کے سر کو تکلیف دے رہی تھی۔ اگر میں کسی خچر پر سوار ہوتا تو میں ایسی ٹوپی کا انتخاب کسی صورت میں نہیں کرتا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا مرتبہ اسے اپنی بے اطمینانی کا برملا اظہار کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ بہر حال اس پادری کے سوا ہر ایک صبح کی اس گل گشت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہم سبھی ایک منظم صورت میں صدر مقام کی طرف چل پڑے۔

لیہہ کو آپ کئی میل کی دوری سے بھی دیکھ سکتے ہیں کیونکہ یہ پہاڑی چٹانوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس پر خانقاہیں اور محل نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیہہ سطح سمندر سے گیارہ ہزار سات سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے لہٰذا یہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہونے کی خاطر کچھ وقت لگتا ہے۔

جب ہم مرکزی اندرون سے اہم شاہراہ پر پہنچے تو دیکھا کہ اس کے دونوں طرف ہز ہائی نیس کی فوج قطاروں میں ایستادہ ہے اور اس کے پیچھے شہریوں کا ایک ہجوم کھڑا ہے۔ خانقاہ کا باجا ایک عمارت کی چھت پر پوری شد و مد سے گونج رہا تھا اور اس کی موسیقی مدھر لگتی تھی۔ اس مرکزی کاروباری سڑک پر سفیدے کے درخت قطار اندر قطار کھڑے ہیں جن سے گرما کے موسم میں آرام دہ ٹھنڈ نصیب ہوتی ہے۔

یہاں کا پولو گراؤنڈ وسیع و عریض ہے۔ یہاں کھلاڑی سڑک پر ادھر سے اُدھر گھومتے نظر آتے ہیں۔ جو اپنی بالیں بار بار دکانوں پر دے مارتے ہیں۔ خوش قسمتی سے لیہہ کی دکانوں میں

شیشے نہیں لگے ہیں ورنہ سڑکوں پرکھیلا جانے والا یہ پولو بہت مہنگا ثابت ہوتا۔

کپتان ٹرنچ کو بالآخر ریذیڈنسی پر بحفاظت لے جایا گیا جو ایک خوبصورت باغ میں دو منزلہ سنگی عمارت تھی۔ لیہہ میں چونکہ درختوں کا مرضی کا انتخاب نہیں ہوسکتا اور میں نے یہاں صرف سفیدے اور بید کے درخت ہی دیکھے ہیں۔ لیکن لداخ کے نچلے خطے میں خوبانی، سیب اور آڑو کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

کمشنر کے ترجیحی فرائض میں اُن تاجروں کے مفادات کا خیال کرنا ہے جو مرکزی کاروان کی شاہراہ سے ہندوستان سے وسط ایشیا، یارقند، ترکستان اور چین جاتے ہیں۔

میں موراوی مشنریوں کے پاس گیا جنھوں نے از راہِ عنایت ڈاکٹر ای۔ ایف۔ نیو کو اور مجھے اپنے ہاں قیام کرنے کی دعوت دی تھی۔ وہ یہاں کئی سال سے ایک قابلِ ستائش اور فائدہ مند کام سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ ہسپتالوں اور اسکولوں اور لوگوں کے گھروں میں بھی جاتے ہیں۔ اب ان کے پاس کوئی تیس عیسائیوں کی جماعت موجود ہے۔ ان میں سے چند سال تک میرے رابطے میں رہنے والے ایک مشنری کی کہانی دلچسپ ہے۔

نوبرا میں ایک خانقاہ کا لاما قریب المرگ تھا۔ اس نے جان پہچان کے ایک مشنری کو بلاوا بھیجا۔ نوبرا وادی کھر دنگ درے کی دوسری طرف لیہہ سے کوئی پچاس میل کی دوری پر ہے جو 17400 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ مشنری فوراً وہاں چلا گیا اور اس نے اُسے مرنے سے پہلے دیکھا۔ لاما نے اس سے کہا کہ اس نے مشنریوں کی تعلیمات کے ذریعہ اس آسمانی حقیقت کو سنا تھا کہ حضرت عیسیٰ ہی اُس کا نجات دہندہ ہے۔ البتہ اس نے اس حقیقت کا برملا اظہار دوسروں کے ہاتھوں ستائے جانے کے خوف سے نہیں کیا تھا۔ اگر چہ وہ خود ایسا کرنے میں ناکام ہی رہا لیکن وہ اپنے بیٹے کو مشنریوں کے حوالے کر کے اسے ایک عیسائی کی طرح پرورش کروانے کا خواہش مند ہے۔ اس لاما کی موت اس طرح ہوئی جیسے شبنم کا کوئی قطرہ کنول کے پتے سے گر پڑے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کے بیٹے کو لیہہ میں مشن پر لے گئے ہیں جہاں وہ تیرہ سال تک رہے گا اور پھر اسے سری نگر میں مشن اسکول میں داخل کیا جائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ مشنریوں نے اسے چند تبتی دوستوں کی تحویل میں دیا جو تجارت کے لیے جا رہے تھے۔ اس لڑکے کا عیسائی نام جوزف رکھا

گیا۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح اس ننھے لداخی کا اسکول میں خیر مقدم کیا گیا۔ وہ یہاں تبتی لباس میں پہنچا۔ وہ عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ میں نے صرف چند ہی تبتیوں کو دیکھا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ اپنے قومی لباس پر کتنا اترا رہا تھا جسے وہ اسکول میں ہر وقت پہنتا رہا۔

دوسری طرف جوزف کو دیگر برہمن طلبا کے ساتھ ملنے جلنے میں کافی وقت کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے عجیب وغریب کپڑوں کو دیکھ کر ہنستے رہے اور اس کا مذاق اُڑاتے رہے۔ وہ اس کے عیسائی ہونے پر بھی اسے ستاتے رہے۔

جوزف نے کبھی اپنے عذاب رسانوں کو کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اس نے ان کی باتوں کا کوئی جواب دیا، نہ ہی اس نے کسی بھی طرح ان کا خوف محسوس کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ برہمن لڑکے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے تھے۔ میں اُس طالب علم کو پسند کرتا ہوں جو اپنے معاملات خود سنبھالے اور کسی دوسرے کی حمایت کا محتاج نہ بن جائے۔ لہٰذا میں نے بھی اسے اچھی تربیت دینے کی ٹھان لی۔ وہ جلد ہی ایک بہتر شاگرد ثابت ہوا جس کے دل میں میں نے کوئی وسواس یا ڈر کبھی نہیں دیکھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک مختصر سے وقت میں ہر ایک اس کی عزت کرنے لگا۔ جس پر اس کا مذہب یا پوشاک بھی اثر انداز نہیں ہوسکا۔ اسکول چھوڑنے سے پہلے وہ سب سے زیادہ محترم لڑکا بن چکا تھا۔ اب وہ اپنے ملک واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرے گا؟ کیا وہ سرکاری ملازمت اختیار کرے گا کیونکہ لداخی باشندے، بہت کم پڑھے لکھے تھے اور حکومت کے سبھی عہدوں پر یا تو کشمیری برہموں کا قبضہ تھا یا وہ ہندوستانیوں کے پاس تھے۔ میرے خیال میں بہتر ہوگا اگر چند لداخی بھی سرکاری نوکریوں میں شامل ہو جائیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ بھی ایسا کرے تو ایک وقت اسے اقتدار اور رسوخ حاصل ہوگا جسے وہ نیک کارکردگی کے لیے کام میں لائے گا۔ اُس نے جواباً کہا: ''مجھے اقتدار یا دولت نہیں چاہیے۔ جو میں چاہتا ہوں وہ بس اتنا ہے کہ میں اپنے لوگوں کو عیسیٰ کی تعلیمات سے بہرہ ور کروں۔ میں ایک مشنری بننے کو ہی ترجیح دوں گا''۔

وہ واپس لیہہ چلا گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ وہاں مشن اسکول کا ہیڈ ماسٹر بن گیا۔ اس عہدے پر وہ کئی سال تک رہا۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں کو عیسیٰ کی تعلیم دے رہا ہے جس میں اس کی

تقریر اور عمل دونوں شامل ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کی تعلیم نے اسے ایک بابو بننے کی ترغیب نہیں دی۔ اس کے برعکس وہ ایک شریف النفس محنتی شخص بن گیا۔ میں نے کئی بار اسے سرا گائے کا جوڑا ہانکتے ہوئے اپنی پیٹھ پر ایک ٹوکرے میں کھاد اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی تعلیم نے اسے انسانیت سے دور نہیں کیا جیسا کہ کشمیر اور ہندوستان میں کئی لوگوں کے ساتھ ہوا ہے۔

مجھے یاد آ گیا کہ خانقاہ میں دم توڑتے ہوئے لاما نے اپنے ملک کی خاطر کیا کیا اگر چہ کئی اور لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آ سکتا کہ اپنے بچوں کو کس طرح راہ راست پر ڈالنا چاہیے۔

لیہہ میں مشن کو چند عمدہ قسم کے مشنریوں کی خدمات کا اعزاز حاصل ہوا ہے جو ایک صاف دل افراد کی جماعت ہے۔ ان کی تنخواہ اگر چہ بہت ہی کم ہے اور ابھی حال ہی تک وہ گھر جانے کے لیے زادِ راہ بھی نہیں رکھتے تھے اور بعد میں اپنے کام پر ہی وفات پا گئے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آئے دن ایک دانشمندانہ اور انسان نواز پالیسی کے پیش نظر اگر بزرگ مشنریوں کی عمر دراز ہو تو نئے اور نا تجربہ کار جانشینوں سے کسی حد تک نپٹنا نہیں پڑے گا۔ اس کے لیے انھیں وقت وقت پر لمبے آرام کی سہولت دی جانی چاہیے۔ سری نگر اور لیہہ میں مشنری کئی لحاظ سے ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں۔ دوران جنگ ڈاکٹر اور مسز ہیبر سری نگر مشن ہسپتال میں امداد دینے کے لیے آ گئے جب وہاں اس کی ضرورت تھی اور وہ تعریف و تحسین کے درخور کہلائے۔

قصبے کے باہر ریت کے ویرانے میں ایک چھوٹا سا نخلستان ہے جو عیسائیوں کا قبرستان ہے جس میں دیگر مقدس باقیات کے علاوہ ایک ممتاز مشنری مس امی پی پیٹری بھی شامل ہے جس نے صرف تین سال کے بہت ہی مختصر دورانیہ میں خواتین اور بچوں کو سری نگر میں روزی کمانے کے ہنر سکھائے۔ وہ چھٹیوں کے لیے لداخ آئی لیکن وہاں پہنچتے ہی ٹائی فائڈ کے بخار سے اس کا انتقال ہوا جس کی لاگ اسے سری نگر میں لگی تھی۔ مسز ایشلے کارس ولسن نے اپنی سوانح لکھی جو ایک قابل مطالعہ کتاب ہے جو اعلیٰ خدمت میں گزاری ہوئی اس کی زندگی کا حال بیان کرتی ہے۔

میں نے کھرڈنگ درے کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا جو لیہہ سے چند میل کے فاصلے پر 17400 سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس پر اکثر و بیشتر بوجھ ڈھونے والے حیوانوں کی ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ یہاں ہوا اس قدر گھٹی ہوئی ہے کہ ٹٹو اور گدھے والے ان کی ناک کو چیر کر اسے پھیلاتے

ہیں تا کہ ان کے نتھنوں میں زیادہ سے زیادہ ہوا گھس جائے۔ اس درے پر تاجر زیادہ تر سُرا گائے ہی کو استعمال میں لاتے ہیں جن پر وہ اپنے آپ کو پہاڑی بیماری سے بچانے کے لیے سوار ہوتے ہیں۔

سورج بہت گرم تھا کہ میں نے رات ہی کو سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے ٹٹو پر شام کے آٹھ بجے روانہ ہوا کیونکہ سُرا گائے بہت سست رفتار ثابت ہو سکتی تھی۔ میرے ساتھ لداخ کا ایک ٹٹو سوار پہاڑی رہ نما بھی تھا۔ بارہ بجے کا وقت تھا کہ میرا یہ رہنما غائب ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس سمت میں گیا اور گہرے اندھیرے میں اسے ڈھونڈنا میرے لیے ناممکن تھا۔ مجھے راستہ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا لہٰذا میں ٹٹو سے اتر گیا تا کہ میرے پاؤں زمین کے ساتھ رہیں۔ ٹٹو بھی چلنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے ایک چٹان کے ساتھ باندھ لیا اور خود کوئی نشان پانے کی غرض سے چل پڑا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں پہاڑی کی چوٹی پر اس کے نوکیلے سرے پر پہنچا ہوں۔ مجھے بہر حال محسوس ہوا کہ میں بیک وقت بیس سے زیادہ قدم نہیں چل سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اذیت ناک سر درد نے مجھے آلیا۔ یہ ایک ایسا احساس تھا کہ جیسے میرے سر میں خون کی رگیں جل اٹھیں گی۔ کچھ دیر تک بے معنی آوارہ گردی کے بعد مجھے لگا کہ میں ایک چوٹی کے دہانے پر ہوں۔ چاند نکلا۔ یہ رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں ایک گلیشیر کے دامن پر کھڑا ہوں۔ جو یخ کا ایک ستر فٹ اونچا پہاڑ جیسا تھا جس کے بارے میں تصور کیا جا سکتا تھا کہ وہ کبھی بھی ٹوٹ کر ایک آفت بن سکتا ہے۔ یہ نظارہ بے حد پُر کشش تھا اور میں اس کی وجہ سے کچھ دیر تک اپنا سر درد بھول چکا تھا۔

میں نے چاہا تھا کہ میں اس درے کے پاس بیٹھ کر سورج کو چڑھتے دیکھوں لیکن میری قوت جواب دے چکی تھی اور اب میں ہر حال میں پہاڑ سے نیچے اترنا چاہتا تھا تا کہ میں اطمینان سے سانس لے سکوں۔ میں اس چٹان پر اتر گیا جہاں میں نے اپنے خچر کو باندھا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ میں اپنی قوت واپس حاصل کر رہا ہوں۔ جب میں لیہہ پہنچا تو میں نے اپنے رہنما کے بارے میں دریافت کیا لیکن مجھے کچھ بھی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا اور میں یہ نہیں جان سکا کہ اس نے کیوں مجھے چکمہ دیا؟

لیہہ سے کوئی بیس میل دور ہیمس کے نام سے ایک بہت بڑی اور اہم خانقاہ ہے جہاں ہر بیس سال کے بعد ایک بہت بڑا مذہبی جشن منایا جاتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر نیو اور میں نے ٹٹو کرایہ پر لیے اور ہیمس جانے والے زائرین کے قافلے سے جا ملے۔

یہ ایک دلچسپ اور فرحت بخش نظارہ تھا کہ ہر طبقے کے لوگ پیدل یا گھوڑوں پر سوار ہو کر اس دور دراز خانقاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ کئی ٹٹوؤں پر تو دو دو شخص سوار تھے جن میں مرد آگے اور اس کی بیوی پیچھے بیٹھی تھی۔ لداخ میں چونکہ ایک عورت ایک سے زیادہ شوہر رکھتی ہے لہٰذا بیوی مالک اور آقا ہوتی ہے۔ اس لیے اندازہ کیا جاتا ہے کہ بیوی آگے بیٹھی ہوگی اور ایک یا ایک سے زیادہ شوہر اس کے پیچھے بیٹھے ہوں گے۔ ہم نے بھی ایک گھوڑے پر تین سواروں کو دیکھا۔ ان میں دو خواتین تھیں، ایک بوڑھی عورت اور ایک خوبصورت دوشیزہ جس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے تھے۔ جب ہم ان کے پاس سے گزرے تو انھوں نے ہمیں اشارہ کیا اور مسکرائیں۔ ہم نے سوچا کہ وہ بہت ہی ماڈرن قسم کی عورتیں ہوں گی پھر ہمیں خیال آیا کہ وہ چند روز پہلے ہماری میزبان تھیں جب ایک بندۂ خدا تجتی، اس کی بیوی اور بیٹی نے چائے پر ہمیں دعوت دی تھی۔ البتہ ہم انھیں نہیں پہچان سکے کیونکہ یہاں ایک رسم یہ ہے کہ معزز خاندانوں کی خواتین اپنے چہروں پر کیچڑ کی لپائی کر کے انھیں چھپاتی ہیں۔ لیکن ایک مذہبی سفر کے دوران اپنے چہروں کو اس طرح بگاڑ نہیں لیتیں۔

ہمیں پہنچنے میں دو دن لگ گئے۔ یہ خانقاہ پہاڑ کے ایک طرف ایک تنگ وادی میں واقع ہے۔ اس کو بہت اونچائی پر تعمیر کیا گیا ہے جس کی وجہ مجھے یہ بتائی گئی کہ جب سکھوں نے اس ملک پر حملہ کیا تو اسے لوٹے جانے سے بچانے کی خاطر اس کی عمارت اس بلندی پر بنائی گئی۔ اس کے اندر بہت ہی نایاب خزینے ہیں جن میں چینی ملبوسات اور جواہرات کی وافر تعداد شامل ہے۔

اس سلسلے میں جشن ایک کھلے میدان میں منعقد ہوا۔ جہاں سے یہ خانقاہ ایک عالیشان محل کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں تین سو لاما ہیں جو زرد چغے پہنتے ہیں اور سرخ لباس پہننے والوں سے افضل مانے جاتے ہیں۔ یہ جشن سارا دن اور اگلے دن دوپہر تک جاری رہتا ہے۔ اس میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا جس سے یہ بے حد تکان دہ ہوتا ہے۔ اس تماشے کا مقصد لوگوں کو اس طاقت

سے آگاہ کرتا ہے جو لاماؤں کو بعد از مرگ نصیب ہوتی ہے۔ اس میں جہنم کا سارا ایذا رسان عمل پیش کیا جاتا ہے اور دیکھنے والوں پر باور کیا جاتا ہے کہ اس عذاب سے صرف لاماؤں کے تقدس سے ہی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اس ڈرامے میں ایک بھی لفظ بولا نہیں جاتا، صرف اسے دکھایا جاتا ہے۔ اس جشن کو خانقاہ کے باجے سے ترنم میں رکھا جاتا ہے۔ باجا بجانے والوں کو ایک اور شخص ہدایات دیتا رہتا ہے جس کے سامنے ایک بہت بڑی کتاب ہوتی ہے۔ بڑے کمرے کے بیچوں بیچ آگ جلائی جاتی ہے۔ اس میں لاما داخل ہوتے ہیں جن کے منہ پر حیوانوں کے چہروں والے خوف ناک مکھوٹے لگے ہوتے ہیں۔ ان حیوانوں میں کتے، چیتے، اژدہے وغیرہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں سہ طرفہ کانٹے لے کر ایک آدمی کا کپڑے سے بنا پتلا اسی آگ کی نذر کرتے ہیں پھر وہ شیطان نما انسان والہانہ رقص کرتے ہوئے اس پتلے میں اپنے کانٹے چبھوتے ہیں تاکہ وہ اپنے شکار پر جسمانی عذاب نازل کریں۔ یہ نظارے ایک طویل وقت پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر خانقاہ کے مرکزی دروازے سے لاماؤں کی ایک جماعت نمودار ہوتی ہے۔ وہ بھی رنگین چینی ریشمی کپڑے پہنے ہوئے اور بڑے بڑے مکھوٹے لگائے ہوتے ہیں۔ وہ اس آگ کے گرد ناچتے رہتے ہیں جس میں اپنے بازوؤں سے شعلوں کی طرف عجیب اشارے کرتے ہیں۔ پہلے وہ گویا تکلیف کے عالم میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ عمل اس قدر بھاری بھرکم لگتا ہے کہ اس سے انسانی اعصاب پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس دوران باجا دہشت ناک انداز سے دھیمی رفتار کے ساتھ بجتا رہتا ہے۔

پھر موسیقی دھیرے دھیرے تیز سے تیز تر ہوجاتی ہے جب تک کہ یہ مقدس لاما رقصندہ درویشوں کی گرداب کے دائرے کی طرح ناچتے ہیں۔ باجے والے بھی شہنائیوں کی چیخ پکار، ڈھولوں کی پرشور تھاپ اور دوسرے آلات موسیقی سے وجد میں آجاتے ہیں۔ پھر یکایک سارے ماحول پر قبرستان کی سی خاموشی چھاجاتی ہے اور ہر ایک کو اس دھماچوکڑی سے سکون ملتا ہے۔ ہم سب اس راحت کے لیے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ پھر یہ ناچ شروع سے آخر تک دوبارہ ناچا جاتا ہے جس میں ہر تین سیکنڈ کے بعد ایک قدم اٹھایا جاتا ہے۔ اب یہ رقاص لاما تھک کر چور ہوئے ہیں اور وہ ایک ایک کر کے خانقاہ کے اسی دروازے سے واپس کھسکتے ہیں جہاں سے وہ اپنے کرتب

سکھانے نکلے تھے۔اس کے فوراً بعد لاماؤں کی ایک اور جماعت مختلف اور زیادہ بڑے مکھڑے پہنے سامنے آجاتی ہے۔ان میں سے کئی ایک کے چہرے بھیانک لگتے ہیں۔وہ بھی باجے کے سہارے ناچ گانے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس طرح ایک جماعت دوسری کے بعد پورے دن اور اگلے دن کی دوپہر تک وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہے۔آگ ابھی تک جلی ہے اور شیطان اسے اپنی مرضی سے جلانے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد مقدس ترین لاماؤں کی آمد ہوتی ہے جو اپنے ساتھ پاکیزہ پانی لاتے ہیں جس سے وہ شعلوں کو بجھا دیتے ہیں۔پھر شیطان ایک ایک کرکے شور وغل مچاتے ہوئے منظر سے نکل جاتے ہیں۔اصل میں یہ شور وغل زوردار آندھی کی وجہ سے سنائی دیتا ہے جس کے بعد شیطان، مکھڑے، نوکیلے کانٹے، سب کچھ نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں جو اصل میں خانقاہ میں ہی داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔حاضرین کے لیے ایک خاص دعائیہ مجلس کا انعقاد کرنا تھا۔ایک کھلے احاطے میں جو خانقاہ کے برآمدے کے سامنے تھا، ایک مذبح تھا جسے روایتی زیورات، چراغوں، صاف پانی، جامِ مئے اور کھانے کے قابوں سے سجایا گیا تھا۔پجاری ایک مخصوص لباس پہن کر داخل ہوا، اس نے بھیڑ کی طرف پیٹھ کرلی اور ذبح خانے کی طرف منہ پھیر کر کچھ ورد کرنے لگا۔

دریں اثنا ایک مسخرہ اپنے ہاتھ میں رنگین غبارہ لے کر آیا جسے اس نے پجاری کے سر پر دے مارا اور خود ایک ستون کے پیچھے چھپ گیا۔وہ دوبارہ نمودار ہوا، اس نے پجاری کو دھتکارا اور اس پر ایک اور ضرب رسید کرلی۔ پجاری نے اس کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے عبادتی عمل میں پوری طرح محو تھا۔پھر پجاری نے مزید طمانچے کھانے کے بعد پلٹ کر دیکھا کہ یہ کہاں سے آتے ہیں۔لیکن بدقسمتی سے اس نے غلط سمت میں نظریں دوڑائیں اور مسخرے نے پھر اُسے جا لیا۔ہمیں مشکل سے یقین آرہا تھا کہ ہم بودھوں کی ایک سنجیدہ مذہبی رسم کا مشاہدہ کررہے ہیں۔لوگ اس تماشے سے محظوظ ہوکر زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

مجھے اس تماشے کا آخری عمل سمجھ میں نہیں آسکا۔میرا قیاس ہے کہ پجاری بھی جب اپنی مذہبی عبادتوں میں گم ہوتے ہیں تو وہ بھی شیطان صفت قوتوں سے مداخلت کو رد نہیں کرتے۔ بہرحال یہ ایک دلچسپ منظر تھا اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ جو لوگ میلوں کا سفر طے کرکے یہاں

آئے تھے وہ کس حد تک ان حرکتوں پر یقین کرتے ہوں گے؟ میرا خیال ہے کہ وہ شیطانوں پر زیادہ یقین رکھتے تھے اور ان کے مزاج فطری طور پر مزاح پسند اور خوش مزاج تھے۔ خانقاہ کے سربراہ نے مجھ سے کہا کہ لاما پورے ایک سال تک اس جشن کی تربیت حاصل کرتے تھے، اسی لیے انھیں صحیح انداز میں عبادتی کارکردگی انجام نہ دینے کے لیے طمانچے برداشت کرنے پڑتے تھے۔ اب ایک موٹی چھڑی لائی گئی جسے چتھل کے لپیٹے سے اور بھاری بنایا گیا تھا۔ مجھے ان لاماؤں سے ہمدردی پیدا ہوئی جو اپنی مذہبی کارکردگی میں پورے نہیں اترے تھے۔ ان کے جسموں پر چربی کی ایسی تہہ بھی نہیں کہ وہ اپنی ہڈیاں اس چھڑی کی مار سے محفوظ رکھ سکیں۔

خانقاہ کے کتوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ لیکن وہ زنجیروں میں بندھے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان کتوں کو قبروں کے آس پاس رکھا جاتا ہے تا کہ وہ مردوں کی ہڈیاں چبا سکیں۔ ان میں سے چند ایک تو وحشی درندے تھے۔ میرے ایک دوست پر جب ان درندوں نے حملہ کیا تو اس کے ایک پہلوان ہونے کے باوجود اسے بستر میں دو دن گزارنے پڑے۔ میں خود ایسی صورت حال سے بال بال بچا۔ میں ایک دن بغیر بلائے ایک خانقاہ کو دیکھنے گیا۔ جب میں وہاں کی ایک تنگ گلی سے گزر رہا تھا تو میں نے ایک کتے کو گہری نیند میں دیکھا۔ میں نے اپنی نادانی میں سوچا کہ اگر میں ہلکے ہلکے قدم اٹھاؤں گا تو شاید اس کے پاس سے گزر سکوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا ۔ یہ خفتہ کتا اصل میں جاگ رہا تھا۔ وہ زنجیروں میں بھی بندھا نہیں تھا اور وہ دم زدن میں مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ خوش قسمتی سے میرے ہاتھ میں ایک عصا تھا جسے میں نے اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ چونکہ یہ راستہ نہایت تنگ تھا، میں اپنے اس ہتھیار کو اسے ڈرانے کے لیے گھما بھی نہیں سکتا تھا۔ میں ایک بت کی طرح ساکن و جامد ہو کر کھڑا رہا اور دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف مڑنے لگا۔ کتا بھی ایک ایک انچ چل کے میری طرف آرہا تھا۔ اس طرح میں آخر کار وہاں سے کسی جسمانی چوٹ کے بغیر نکل آیا۔ میں نے یہاں یہ سبق سیکھ لیا کہ مذہب داروں کی مذہبی قیام گاہوں میں اس طرح ہرگز نہیں گھسنا چاہیے۔

اب ہمیں لیہہ اور اس کے بعد سری نگر کی طرف کوچ کرنا تھا۔ ہم نے ہیمس پر پادریوں، پجاریوں اور گرجے کو الوداع کہا جو تبت کی سطح مرتفع سے یہاں یہ لہو ولعب دیکھنے آئے تھے۔ ہم

دوسرے دن لیہہ پہنچے جہاں ہم نے اپنے مہربان دوستوں کمشنر اور مشنریوں سے رخصت لی اور مغرب کی سمت سفر پر روانہ ہوئے۔ان جگہوں پر ہم نے ہر وقت اپنے خیمے گاڑ کر انہی میں رات کو سونے کو ترجیح دی ورنہ ڈاک بنگلوں میں ہمیں کیڑوں مکوڑوں اور ٹڈیوں کے حملے کا شکار ہونا پڑتا۔ایک موقعے پر ایک نوجوان افسر نے ہمیں کھانے کی دعوت دی۔ نبو نے دیکھا کہ افسر کے پاس ایک ایسی پلیٹ بھی تھی جو نبو ہی کی تھی اور وہ اس نے پہچان لی تھی۔دراصل ایک مرتبہ یہ افسر نبو کے گھر میں مہمان تھا اور اس کے ساتھ اُس کا نوکر بھی تھا۔اس نوکر نے اپنے افسر کی خوشنودی کے لیے نبو کی میز سے ایک پلیٹ چرا کر افسر کو دی تھی اور اب وہی پلیٹ میز پر جلوہ نما تھی۔نوکر عام طور پر ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ذاتی طور پر میرا ایک نوکر جو اس چال سے واقف ہے۔وہ مجھ سے ہر بار کہتا ہے کہ میں اپنے دوستوں کو یاد دلاؤں کہ جب بھی نوکر اُن کے گھروں سے باہر جائیں تو وہ سارے چمچے اور چھری کانٹے وغیرہ گن کر وہاں سے چلیں۔

ایک دوسرا رواج بھی مجھے دلچسپ لگا:

میں نے ایک قلی کو سڑک پر دیکھا جس کا منہ زمین پر تھا جس سے دھواں نکل رہا تھا۔جب میں نے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو مجھے بتایا گیا کہ وہ گھر سے اپنا حقہ لانا بھول گیا تھا۔چونکہ وہ تمباکو کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا اس نے زمین میں ایک چھوٹی سرنگ کھود کر اس میں دو سوراخ کیے تھے۔ایک سوراخ کے اوپر اس نے تمباکو اور چند انگارے رکھے تھے اور دوسری طرف وہ کش لگا کر تمباکو نوشی کر رہا تھا۔تعجب ہے کہ کس طرح ایک شخص سیکھتا اور زندہ رہتا ہے۔

ملبے سے گزر کر ہم نے کاروان کی سڑک چھوڑ دی تا کہ ہم سورو کے راستے نُن کُن کے نیچے سے وارڈن نالے پر پہنچ سکیں۔

ہم شیر گل خانقاہ سے گزرے جسے ایک چٹان میں بنایا گیا ہے۔اس کی کھڑکیاں چٹانوں میں سے نکلی ہوئی ہیں۔اس میں اندر جانے اور باہر آنے کے راستے بھی عجیب ہیں۔رسی سے باندھی گئی ایک ٹوکری میں آنے والے شخص کو بٹھا کر اسے انتہائی نفاست سے اوپر کھینچا جاتا ہے تا کہ بن بلائے لوگوں کو اندر آنے نہ دیا جائے۔ہم نے جب سورو دیا کو پہلی بار دیکھا تو یہ نظارہ قابل دید تھا۔اس نے مجھے جنت کی وہ تصویریں یاد دلائیں جو میں نے بچوں کی تصویری کتابوں میں

دیکھی تھیں۔ ہم ایک چوٹی سے سوردکو دیکھ رہے تھے جہاں اس میں وسعت پیدا ہوئی تھی اور یہاں چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بید کے درخت قطار اندر قطار اُگے تھے۔ پیچھے اور اوپر دیو قامت چوٹیاں بلند ہوتی ہوئی بیچ میں ایک وادی کو گود لیے ہوئے تھیں۔

جب ہم پُل پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ یہ ہمارے ٹٹوؤں کے لیے بہت کمزور تھا۔ دریا کو بھی پار نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس کی رفتار طوفانی تھی اور وہ گھن گرج والا موجیں مارتا تھا۔ ٹٹو اسے پار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ اب کیا کریں؟ ٹٹوؤں کے مالکوں نے جلد ہی اس معمے کو حل کیا۔ انھوں نے ٹٹوؤں سے بوجھ اتار کر انھیں دریا پار کروانے کا قصد کیا۔ انھوں نے ٹٹوؤں کی گردنوں میں ایک رسی باندھی۔ ٹٹوؤں کو پانی میں گھسیٹا گیا اور ٹٹو والوں نے پل پر چلتے ہوئے رسی کو زور سے اوپر کی طرف کھینچ کر رکھا تا کہ ٹٹوؤں کے سر پانی کی سطح سے اوپر رہیں۔ اس طرح ہمارا ذہنی تناؤ کم ہو گیا۔ ہمارے سبھی ٹٹو بحفاظت پار پہنچے لیکن ایک ٹٹو والے کو پل پر اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے بہت مزاحمت کرنا پڑی۔

سورو کا گاؤں نُن کُن چوٹیوں کے نیچے واقع ہے جو سطح سمندر سے ساڑھے تیئیس ہزار فٹ اونچی ہیں۔ یہی وہ چوٹیاں ہیں جو سری نگر سے دکھائی دیتی ہیں اور یہ سفید اہرام مصر کی شکل رکھتی ہیں۔ ہم جہاں سورو دریا کے پاس کھڑے تھے وہ ایک شاندار نظارہ تھا اور اس کے دیوہیکل گلیشیر سورج کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔

سورو سے نکلنے کے بعد ہم نے گلہری جیسے موش خرمائی نام کے جانوروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو دیکھا جو خرگوشوں کی طرح اپنے جھنڈوں میں رہتے ہیں۔ وہ گاجر کے رنگ کے ہوتے ہیں اور ان کا قد چھوٹی لومڑی جتنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کا کام کرتے ہیں جب وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر دیہاتیوں کے دشمن پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر انھیں ایسا کوئی آدمی نظر آ جائے تو وہ زور زور سے سیٹی بجاتے ہیں اور پھر اپنے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔ یہ ایک پُرکشش جانور ہے۔ انھیں جنگلی لہسن پسند ہے جو اس خطے میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

ہم دو نالہ درے سے وارڈن وادی میں داخل ہوئے اور ہمیں ایک گلیشیر پر سات میل تک چلنا پڑا۔ جب ہم یہاں اونچائیوں سے نیچے چھلانگ لگاتے تھے تو ہمارے خون میں حرارت کی لہر

دوڑتی لیکن ہمیں اس یخ بستہ برفانی تودے پر پھسلنے سے بچنے کی خاطر جتن کرنے پڑتے۔ ہمارا ایک قلی ایک ایسی ہی گہرائی میں گر گیا مگر اس کی پیٹھ پر جو بوجھ تھا وہ یخ کی سلوں میں اٹک گیا اور وہ بال بال بچ گیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے سبھی ساتھی کیمپ تک سلامت پہنچ چکے ہیں۔ ہمیں اپنے خیموں کے لیے کسی محفوظ جگہ کو تلاش کرنا تھا کیونکہ ہم اُس جگہ سے گزرے تھے جہاں جنرل بی۔ آئی۔ ایم۔ ایس خیمہ زن تھا۔ رات کو ایک بھاری پسّی نے اسے اور اس کے سارے نوکروں کو موت کی نیند سلا دیا۔

وارڈن ایک تنگ وادی ہے جو بہت ترچھی اور عمودی چٹانوں سے بھری ہے۔ لہٰذا برفانی تودے اور پسیاں بار بار گرتی ہیں اور ہر ایک کو چاروں پہر اپنی آنکھ کھلی رکھنا پڑتی ہے۔

ہمارے سفر کے دوران ڈاکٹر نیو نے اچھا خاصا طبی کام سرانجام دیا۔ وہ چائے کے بعد بیماروں کو دیکھتا اور یہ کام صبح بھی جاری رہتا۔ کچھ بیمار ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک ہمارے ساتھ ساتھ آجاتے جب انھیں متواتر علاج کی ضرورت رہتی۔ اس سفر میں ڈاکٹر نیو نے موتیابند کے بیالیس آپریشن کیے۔ ہمیں ان لوگوں کی شادمانی دیکھ کر خود بھی خوشی ہوتی جن کی بینائی بحال ہو چکی تھی۔ آپریشن کے بعد، جو صرف چند لمحوں میں کیا گیا تھا، ڈاکٹر نیو بیمار کے ہاتھ پکڑ کر اس سے کہتا کہ وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں گن لے۔ جب کسی بیمار نے انگلیوں کی صحیح تعداد بتائی تو ڈاکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر یہ مسکراہٹ قہقہوں میں تبدیل ہو گئی جب بیمار کو پتہ چلا کہ یہ کوئی خواب یا جادو نہیں تھا ایک حقیقت تھی۔ پھر آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور بیمار سے تاکیداً کہا گیا کہ وہ دو ہفتوں تک اسے نہ کھولے۔ موتیابند کا آپریشن ایک صاف ستھرا اور جراحی کا حیران کن عمل ہے۔ اس شخص پر واقعی رشک آتا ہے جو صرف چند لمحوں میں دوسروں کو بینائی بخشے۔ اسے کسی حد تک ایک معجزہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ اُس معالج کی طرح کا کارنامہ ہے جس نے گلیلی میں بھی بیماروں کا علاج کیا تھا(1)۔

وارڈن سے ہم درے پر چڑھ گئے اور پھر صنوبر کے درختوں کے جنگل سے گزر کر وادیٔ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ اس دوران ہم نے گھاس سے بھری پیاری مرگیں اور جگمگاتی ندیاں دیکھیں جب تک کہ ہم اسلام آباد میں دریا تک نہیں پہنچے۔

اب ہمیں کتنا اچھا لگ رہا تھا کہ ہم کشتی میں ٹانگیں ہلائے بغیر سفر جاری رکھیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اس سفر کا اتنا لطف کس طرح لیا؟ اب میں رفتہ رفتہ اڑتالیس میل دور سری نگر میں اپنے گھر پہنچ رہا تھا۔

فٹ نوٹ:

(1) گلیلی شمالی اسرائیل کے ایک قدیم صوبہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰ نے اپنی زندگی کے کم از کم تیس سال گزارے۔ یہیں پر اس نے اندھوں کا علاج کر کے ان کی بینائی بحال کی۔ یہاں اسی معالجے کی طرف اشارہ ہے۔

اُنیسواں باب

کشمیر میڈیکل مشن

سری نگر میں دریائے جہلم پر اولین پل امیرا کدل کے قریب عیسائیوں کا ایک قبرستان ہے۔ یہاں ایک قبر ہے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں تو احتراماً اپنی ٹوپی اُتارتا ہوں کیونکہ اس قبرستان میں رابرٹ تھورپ کی باقیات دفن ہیں جس نے 1867 میں کشمیریوں کے لیے اپنی جان قربان کردی۔

یہ قبر اُن خوبصورت چناروں کی چھاؤں تلے واقع ہے جو گرمیوں میں ہر ایک کو تراوت بخشتے ہیں اور ان سے موسم خزاں میں بھی اس وقت انتہائی لطف حاصل ہوتا ہے جب ان کے پتے گلابی اور پیازی رنگ اختیار کرتے ہیں۔

رابرٹ تھورپ کئی دیگر برطانوی افسروں کی طرح کشمیر کے پہاڑوں میں شکار کی غرض سے یہاں آیا۔ لیکن یہاں پہنچ کر اس کا خیال ایک پریشان کن صورت حال کی طرف گیا۔ حکومتی بے راہ روی کے تحت کشمیری عوام کے مصائب کو اس نے بری طرح محسوس کیا۔ اس نے دیکھا کہ کس طرح مسلمان کسان ہندو اہل کاروں کے ہاتھوں ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں جو اُن کا خون تک چوسنے سے گریز نہیں کرتے۔ مظلوم کسان اپنا مالیہ جنس کی شکل میں ادا کرتے ہیں جو ان کی

فصلوں کا نصف حصہ ہوتا ہے۔باقی جو اناج بچتا ہے اس میں سے بھی سرکاری کارندے وافر حصہ ہڑپ کر تے ہیں۔اس طرح کھیتوں میں خون پسینہ بہانے والے کاشتکاروں کے لیے جو کچھ بچتا ہے وہ ان کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔بعض اوقات وہ درختوں کی جڑیں کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔اس کے علاوہ جو بھی چیز ان کی بھوک مٹانے کے کام آئے وہ اسے بھی کھاتے ہیں۔
اس حوالے سے کشمیر کے لوگ یہ واقعہ سناتے ہیں:

کسی زمانے میں ایک نیک دل افغان کشمیر کے شمال مغرب کی جانب پہاڑوں کے درمیان رہتا تھا۔اُس کا نام موسیٰ دین خان تھا۔ایک دن وہ سری نگر کے سفر پر نکلا تا کہ ملک کے بادشاہ کے حضور میں آداب بجالائے۔وہ اپنے محبوب گھوڑے پر سوار ہوا جسے وہ بے حد چاہتا تھا۔وہ گھوڑا اسے اس قدر پیارا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس کا باپ کہتا تھا۔جب موسیٰ دین خان سری نگر میں دریائے جہلم پر صفا کدل نامی ساتویں پل پر پہنچا وہ گھوڑے سے اتر کر پیدل چلنے لگا تا کہ احتراماً شاہی محل تک اسی طرح پہنچے۔اس نے گھوڑے کو اپنے نوکر کے حوالے کر کے اسے تاکید کی کہ وہ جانور کا پورا خیال رکھے اور کسی بھی صورت میں اس کی سواری نہ کرے۔

لیکن محل کے قریب پہنچ کر اسے گھوڑے کا خیال ستانے لگا کہ نوکر نے نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔اس نے فوراً دوسرے نوکر کو یہ دیکھنے کے لیے بھیجا کہ وہ گھوڑے کا اصل حال معلوم کرے۔جب یہ نوکر پہلے نوکر کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ تو گھوڑے پر سوار ہو چکا ہے۔اس نے سوچا کہ میرے لیے بہتر یہی ہوگا کہ میں اس نوکر کی دشمنی مول نہ لوں مبادا کہ وہ الٹا مجھی کو غلط الزام دے کر پھنسائے۔لہٰذا وہ بھی گھوڑے پر سوار ہوا۔

جب موسیٰ دین خان محل کے بالکل نزدیک پہنچا تو اسے پھر یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ایک اور نوکر کو جانچ کے لیے بھیجا جائے۔جب تیسرے نوکر نے دونوں نوکروں کو بیک وقت گھوڑے پر سوار دیکھا تو وہ بھی انہی میں شامل ہو کر سوار ہوا۔بے چارہ گھوڑا جو ایک سوار کو برداشت کر سکتا تھا جب تین تین سواریوں کو اٹھانے پر مجبور ہوا تو وہ تھک کر چور ہوا اور اصطبل تک پہنچتے پہنچتے مر گیا۔

اس کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیری لوگ کس قدر مذاق کے عادی ہیں۔اس کے علاوہ ایک اور پریشان کن مسئلے نے تھورپ کو بے چین کیا۔یہ گلگت تک مجبور کشمیریوں کو بیگار پر لے

جانے کا غیر انسانی عمل تھا۔ گلگت سری نگر سے کشمیر کے شمال میں دو سو میل کی دوری پر ہے جہاں فوجیوں کی ایک چھاؤنی ہے۔ چونکہ گلگت تک کوئی سڑک نہیں ہے لہٰذا سپاہیوں کے لیے رسدات قلیوں کے ذریعے ہی اٹھوائی جاتی تھیں۔ ان قلیوں کو دیہاتوں میں سرکاری کارندوں کے ذریعے جمع کیا جاتا تھا۔ بھاری بھرکم بوجھ کے علاوہ ایک سیر چاول اور گھاس کے جوتے (کشمیری: پلہ ہور) بنانے کے لیے انھیں رسے دیے جاتے تھے۔ برف پوش دروں سے گزرنے کے لیے انھیں کوئی سہولت فراہم نہیں تھی لہٰذا ان میں کئی راستے ہی میں مر جاتے اور جو گلگت پہنچ جاتے تو انھیں اس ویران خطے کے وحشی باشندوں کے ہاتھوں فروخت کیا جاتا۔ میرے ایک نوکر کا دادا جب وہاں پہنچا تو اسے ایک چینی کتے کے عوض خرید اگیا لیکن وہ بھاگ گیا اور اس کی جان بچ گئی۔

ڈاکٹر نیو نے اپنی کتاب Thirty Years in Kashmir میں لکھا ہے:

''انگریزوں کے لیے گلگت کا نام ایسی بہت سی یادیں لے کر آتا ہے جب انیسویں صدی کے وسط میں چترال کے صدر مقام ہنزہ اور پامیر کیشن پر قبضہ کیا گیا۔ کشمیر صرف ایک ایسی ہندوستانی ریاست ہے، جس کا رقبہ بڑھ چکا ہے۔ اگر چہ اس توسیع کی کوئی ضرورت نہیں تھی البتہ برطانوی سرکار پر اسے ٹھونسا گیا کیونکہ روسی سلطنت پیش قدمی کر رہی تھی اور سازشوں میں سرحد کے افسر بھی شامل تھے''۔

پہاڑوں کا سہ طرفی سلسلہ جو جنوب میں کشمیر، شمال میں روسی وسط ایشیا اور مغرب میں افغانستان تک پھیلا ہے، دنیا میں ایک بہت ہی وحشیانہ علاقہ ہے جہاں تک کم سے کم رسائی حاصل ہوسکتی ہے۔ ان پہاڑوں کے دونوں طرف عظیم سلطنتیں برسر اقتدار رہی ہیں اور افواج نے زمانۂ قدیم سے جنوبی گزرگاہوں سے ہندوستان کو فتح کرنے کی خاطر کوچ کیا ہے۔ اسی طرح شمال میں وسط ایشیا کی زرخیز ریاستوں کو زیر کرنے کی خاطر بھی ایسی مہم بازی کی گئی ہے۔ وقت وقت پر منگولیا کے وسیع میدانوں سے مغرب پر حملہ کرنے کے لیے بڑی یلغاریں ہوئی ہیں لیکن ہندوکش کی وادیاں ان حملوں سے مفتوح نہیں ہوسکی ہیں اور وہاں کی زبان اور نسل کے بارے میں صحیح جان پہچان حاصل کرنے میں بیرونی جارحوں کو زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

کشمیر آنے کے کئی سال بعد تک بھی گلگت کا نام ہی یہاں کے لوگوں کے دلوں پر خوف اور

دہشت کا عالم طاری کرتا تھا۔ ایک کشمیری کے لیے یہ نام نہایت چونکا دینے والا تھا۔ اس کے لیے اس کے معنی جبری مزدوری، برف میں پاؤں کی انگلیوں کا سڑنا، اور موت کی وادیوں کو پار کرنا تھا جہاں مزدوروں کے خیموں میں وبا اور بھوک کا دور دورہ تھا۔

ایک سال اپریل کی ابتدا میں یہ خبر پھیل گئی کہ سرحدی قبیلے جنگ و جدل پر تلے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں پانچ ہزار قلیوں کو فوج کی دو رجمنٹوں کے ساتھ وہاں جانے کا حکم دیا گیا تا کہ گلگت میں موجود سپاہیوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ میں اُس وقت اسلام آباد میں وبا کو پھیلنے سے روکنے کے لیے وہاں صفائی کے انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ قلیوں کو تمام ملحقہ علاقوں سے اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک کمبل، گھاس کے جوتے، بیساکھی اور چند چھڑیاں اور رسیاں دی جا رہی ہیں۔ میں اس وقت ایک مسجد کے سرسبز میدان میں موجود تھا جب اس خطرناک سفر پر جانے والوں کو رخصت کرنے کے لیے ایک تقریب منعقد کی جا رہی تھی۔ ان میں اکثر زور زور سے آہیں بھر رہے تھے۔ پھر ایک ملاّ نے ان کے لیے دعائیں مانگیں۔ اس موقعے پر سخت جان لوگ بھی ناراض تھے اور سوچ رہے تھے کہ ان جانے والوں کے بعد ان کے کھیتوں کی رکھوالی کون کرے گا؟ ان کی طویل غیر حاضری میں ان کی بیویوں اور بچوں کا کیا ہوگا؟ اور یہ کہ گلگت کے قہر آلود خطے میں انھیں کن کن مصائب اور خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا؟

یہ اس قدر دردناک منظر تھا کہ مختلف کنبوں کے افراد اس وقت اپنے عزیزوں کو الوداع کہہ رہے تھے جب کھیتوں میں ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ انھیں اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ کیا وہ پھر ان کو دیکھ سکیں گے؟

ہندسرکار نے لارڈ رابرٹس کو اس لیے کشمیر بھیجا کہ وہ اس بے جا مصیبت کا خاتمہ کرے۔ کشمیر کے مہاراجہ نے اسے یہاں آنے کی دعوت دی تھی تا کہ وہ فوج کو ازسرِ نو تشکیل دے اور گلگت تک ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بھی اسی تناظر میں درپیش تھا۔

اب گلگت کا نام کسی ہلچل کا باعث نہیں کیونکہ اب وہاں تک ایک اچھی سڑک تعمیر کی گئی ہے جو بوجھ لدے حیوانوں اور لوگوں کو بغیر کسی تشویش کے وہاں لے جاتی ہے۔ راستے میں چھ سے بیس فٹ اونچی چھوٹی چھوٹی قیام گاہیں بنائی گئی ہیں تا کہ راہ گیر برف اور برفانی طوفانوں سے گھرے

دروں کو پار کر کے ان میں ٹھہر کر ستالیں۔

کسانوں کی طرح کشمیری شال بافوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ وہ عملی طور پر غلام تھے اور انھیں ملک سے باہر جانے کی ہرگز اجازت نہیں تھی جیسا کہ میں نے اسی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے۔ کشمیری عورتوں کے لیے بھی ملک سے باہر جانا ممنوع تھا۔ اس سے یہ باور کرنا مقصود تھا کہ پھر ان کے شوہر بھی باہر کا رخ کریں گے۔

اس سلسلے میں ایک مثال اس طرح بیان کرتے ہوئے مرحوم ڈبلیو۔ آئی۔ سٹورز نے مجھ سے کہا کہ جب وہ کشمیر میں ایک پادری کے فرائض انجام دے رہا تھا، تو وہ پیر پنچال کے راستے باہر جارہا تھا جب اس درے پر سپاہیوں کے ایک دستے نے اسے روکا جنھوں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے قلی ان کے سپرد کرے۔ یہ قلی دراصل کشمیری شال بافت تھے جو باہر جانے سے محرومی کے باعث قلیوں کا روپ دھار کر سٹورز کے ساتھ جانے پر تیار ہوئے تھے اور اس گروہ میں ان کی ایک عورت بھی شامل تھی جو کھانا پکانے کے لیے کشمیر سے باہر جارہی تھی۔ اپنے اصلی چہرے کو چھپانے کی خاطر اس نے ایک پنجابی عورت کا لباس پہنا تھا۔ اس عورت کو بھی واپس کشمیر بھیجا گیا۔

رابرٹ تھورپ نے اپنے قیامِ کشمیر کے دوران یہ ٹھان لی کہ وہ کشمیر میں ان مقامی لوگوں پر ظلم و جبر کے اعداد و شمار جمع کرے جو ناقابلِ بیان مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ اس نے عوام کی حالت زار کو ہندسرکار کی نوٹس میں لایا اور برطانوی اخباروں میں بھی اس صورت حال پر مضامین تحریر کیے تاکہ سلطنت انگلستان اس پر کوئی کارروائی کرے اور مظلوم عوام کو اس سے نجات دلائے۔ بہرحال تھورپ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور اسے کشمیر سے باہر جانے کو کہا گیا۔ اس نے یہ حکم ماننے سے انکار کیا۔ اسے اسی کے پلنگ کے ساتھ باندھا گیا اور سپاہی اسے درے کی جانب لے گئے۔ وہ بہرحال بھاگنے میں کامیاب ہوا اور سری نگر واپس لوٹا۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد وہ زہر دیے جانے سے فوت ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس نوجوان افسر نے یہ سوچا کہ کشمیری مظلوموں کو مصائب سے نجات دلانے میں اس کی کوششیں رائگاں ہوئیں تو اُس کی غلط سوچ ہے اور شاید اب اسے معلوم ہوگا کہ اس کی جان کی بازی ضائع نہیں ہوئی۔

کئی برطانوی افسروں نے یہ جانکاہ خبر سنی تھی اور اس کا ردعمل بھی ظاہر کیا تھا۔ ان میں سر رابرٹ منٹگمری، پنجاب کا گورنر سر ہربیرٹ ایڈوارڈس، کرنل مارٹن اور کرنل ارمسٹون شامل تھے۔ ارمسٹون کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس نے ہندو بیواؤں کی ستی کی رسم کو ختم کروایا۔ ان سبھی نے ایک اجتماع میں اس بات پر سوچ بچار کیا کہ وہ کس طرح کشمیر کی مدد کر سکتے ہیں۔ انھوں نے طے کیا کہ اہل کشمیر کو روحانی اور جسمانی امداد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انھوں نے چودہ ہزار روپے کا چندہ جمع کر کے کرسچن مشن سوسائٹی کو بھیجا اور سوسائٹی سے کہا گیا کہ ایک طبی مشن کشمیر بھیجا جائے تاکہ اسے لوگوں کا اعتماد حاصل ہو جائے۔ انھوں نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ مہاراجہ اپنے ملک میں ایک ڈاکٹر کو خوش آمد کہے گا۔

سوسائٹی نے اسکاٹ لینڈ کے ڈاکٹر ایلمسلی کو ہند آنے اور پہلا طبی مشنری بننے کے لیے منتخب کیا۔ ڈاکٹر ایلمسلی 1864 کے موسم بہار میں سری نگر پہنچا۔ وہ ایک سخت اور مشکل زندگی گزار رہا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی ہسپتال نہیں تھا۔ وہ درختوں کے نیچے جراحی کا عمل انجام دیتا تھا۔ لوگوں کو بھی ہدایت کی گئی کہ وہ ڈاکٹر کے پاس نہیں آئیں۔ اس غرض کے لیے سپاہیوں کو تعینات کیا گیا۔ کیونکہ بیمار ڈاکٹر کے پاس آنے کا اصرار کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں احکامات کی عدولی کے الزام میں کئی بیماروں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔

ان دنوں کسی یورپی باشندے کو سردی کے موسم میں کشمیر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی اور اس ڈاکٹر کو بھی یہ حکم ماننا پڑا۔

کشمیر میں آٹھ سال تک کام کرنے کے بعد ڈاکٹر 1872 میں اس وقت انتقال کر گیا جب وہ یہاں سے واپس جا رہا تھا۔ ٹی۔ آر۔ واڈے اس کا شریک کار رہا جس نے طبی مشن کے ابتدائی دنوں میں قابل تحسین خدمات انجام دی تھیں۔ سوسائٹی نے پھر ڈاکٹر تھیوڈور میکس ویل کو بھیجا، چونکہ وہ دہلی کے ہیرو جنرل نکولسن کا بھتیجا تھا لہٰذا مہاراجہ نے اسے رستم گڑھی کی پہاڑی پر ایک خطۂ زمین دیا۔ یہ پہاڑی تخت سلیمان ہی کا ایک زیریں حصہ ہے جہاں سے جھیل ڈل کا خوب نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر میکس ویل 1976 تک یہاں رہا جب صحت کی خرابی کی بنا پر وہ سبکدوش ہوا۔ جس

میں اس کی گوناگوں پریشانیاں بھی شامل تھیں۔ دریں اثنا ایک نوجوان توپچی افسر ایڈمنڈ ڈونز کو یہاں بھیجا گیا، اُس نے اپنے کمیشن سے ہند میں استعفیٰ دیا تھا تاکہ وہ ایک طبی مشنری بن جائے اور وہ کشمیر کے حوالے سے کام کررہا تھا۔ اس طرح پھر ایک اور سپاہی مفلوک الحال کشمیریوں کی سہولت کے لیے کشمیر آیا۔

اسی دوران یہاں قحط پڑا جس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ جاڑا بہت جلدی آچکا تھا اور کسان اپنی فصلیں کاٹ نہیں سکے تھے۔ یہ فصلیں سرکاری پیمائش اور حساب کتاب کے بعد ہی کاٹی جاتی تھیں۔ سرکاری ہندو اہل کار فصلوں کو کاٹنے کے لیے غیر قانونی طور پر کسانوں سے بھاری رقومات مانگ رہے تھے جوان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ انھوں نے اہل کاروں سے التجا کی کہ رقم میں کچھ کمی کی جائے مگر بے رحم اہل کار ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی زوروں کی برف باری ہوئی اور فصلوں کی کٹائی تو درکنار ان میں سے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں مسلمان گھرانے موت کے منہ میں چلے گئے۔ ہندوؤں پر اس کا کوئی خاص منفی اثر نہیں پڑا کیونکہ انھیں سرکاری گوداموں سے اناج کی فراہمی برابر جاری تھی۔

یہی وہ وقت ہے جب مزید مشنری ڈاکٹر ڈونیز اور ٹی، آر، واڈے لوگوں کی مدد کے لیے کشمیر آگئے۔ انھوں نے اپنے گھر والوں کو بھی امداد بھیجنے کے لیے خطوط لکھے اور وصول شدہ رقم سے ہندوستان سے خچروں پر خوراک یہاں پہنچائی۔ انھوں نے امدادی کام شروع کیے۔ انھوں نے دریا سے ڈل تک ایک کنال کھودی تاکہ کشتیاں اِدھر سے اُدھر جاسکیں۔ یہ کنال اب چوڑی کی گئی ہے اور اب اسے ایک اہم آبی راستے کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے یتیم بچوں اور بے یار و مددگار عورتوں کے لیے یتیم خانہ قائم کیا اور ہر طرح سے مصیبت زدگان کی مدد کرتے رہے۔ دوسری طرف ہندو سرکاری کارندوں نے ان کے خلاف یہ مہم چلائی کہ کشمیری عوام کے لیے برطانوی انگریزوں کی خدمات کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن خوش قسمتی سے برطانوی ریزیڈنٹ نے، جو ایک مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا، عام لوگوں کے حق میں رائے دی اور انھیں مشکلات سے نجات پانے کے اقدامات کا خود جائزہ لیتا رہا۔ البتہ وبا نے ڈاکٹر ڈونیز کو ہم سے دور کیا کیونکہ اس کی بیوی کی بھی صحت بگڑ چکی تھی۔ جیسا کہ اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ کشمیریوں کی بری حالت

دیکھ کر ذہنی تناؤ کا شکار ہوئی تھی۔

انہی دنوں ڈاکٹر آرتھر نیو یہاں آیا۔اس کا خیال تھا کہ اسے اپنے دوست بشپ ہنگٹن کے ساتھ خط استوائی افریقہ میں لیک نیانا کے آس پاس بھیجا جائے گا لیکن کشمیر میں ایک ڈاکٹر کی اشد ضرورت تھی لہٰذا نیو مشرق کی جانب چلا اور اس نے کشمیریوں کے لیے بہترین خدمات انجام دیں۔

جب وہ کشمیر پہنچا تو اس نے اس پہاڑی پر مٹی کی تعمیروں کی ایک قطار دیکھی جو ایک ہسپتال کے شایان شان نہیں تھیں۔آرتھر نیو ایک دور اندیش اور بھرپور خیالات کا مالک تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس کے خیالات کو عملی شکل دی جائے۔اس کی نظروں میں جدید سائنسی آلات اور ساز و سامان سے لیس ایک جدید ہسپتال تھا۔اس خواب کو پورا کرنے کی اس کی تمنا ہمیشہ اسے بیقرار رکھتی تھی جو بہر حال پورا ہو کے رہ گیا۔اس کے بھائی ڈاکٹر ارنیسٹ ایف۔نیو نے، جو چار سال بعد اس کے ساتھ جا ملا، چندہ اور بیماروں کی فیس سے ایک خاطر خواہ رقم جمع کر لی جس نے ایک اچھے ہسپتال کی تشکیل کو ممکن بنا دیا۔لیکن اس وقت جو عمارات اس ہسپتال کی زینت ہیں وہ بعد میں تعمیر کی گئیں۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاں 1860 میں مہاراجہ طبی خدمات کے لیے زمین کا ایک انچ بھی دینے پر راضی نہیں تھا، موجودہ مہاراجہ ہر سال ہسپتال کو چندہ اور مفت بجلی دیتا ہے۔اس نے بذات خود ہسپتال کے لیے نئی تعمیرات کو بنتے ہوئے دیکھنے کے لیے وہاں کا معائنہ کیا۔پہلے پہل سرکاری کارندوں نے ڈاکٹر اور بیماروں کو تنگ کرنے کی بارہا کوششیں کیں۔اب ان کے خاندان بھی یہاں سے طبی امداد اور ڈاکٹروں کی صلاحیتوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس ہسپتال میں 150 بستر ہیں۔

داخل بیماروں کی سالانہ تعداد: 1,719

ہسپتال کے باہری بیماروں کی تعداد: 16,158

جراحی کے اعداد: 4,143

کل حاضری: 38,954

ہسپتال میں یورپی عملہ تین ڈاکٹروں پر مشتمل ہے جس میں ای، ایف، نیو، سیسل واسپر اور

ایم۔آر۔رو چے شامل ہیں۔اس کے علاوہ دوانگریزی نرسیں مس نورانیو جوڈاکٹر نیو کی بھانجی ہے اور مس کورنک، بھی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔حال ہی میں مس سمتھ بھی اس عملے میں شامل ہوئی ہے۔ان خواتین کا کام کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ مغربی خدمت گزاروں کے مقابلے میں مشرقی خدمت گزار اپنے فرائض کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔ہسپتال میں کام کاج کو صحیح طریقے سے چلانے کی غرض سے مکمل نگرانی کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ تھوڑی سی لاپروائی یا غفلت بیمار کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔

ہندوستان کے کئی ہسپتالوں کی طرح اس میں بھی بیماروں کے اہل خانہ اور تیمار دار وارڈوں میں آکر بیماروں کی مدد کرتے ہیں۔اگر چہ اس سے کام کا بوجھ کم ہو جاتا ہے مگر بھی یہ بڑھ ہی جاتا ہے۔موسم گرما کے دوران کام بہت بڑھ جاتا ہے اور اس دوران باہر سے مخیر حضرات اپنی امداد بھیجتے رہتے ہیں۔ان کی فہرست طویل ہے۔اسی لیے سبھی کے ناموں کا ذکر مشکل ہے۔اب میں ڈاکٹر آرتھر نیو کے اُس اقتباس سے استفادہ کروں گا جو اس حوالے سے دلچسپ ہے:

''گزشتہ دو دن کے اندر شہر کو جانے والی سڑکیں دیہاتیوں سے بھری پڑی ہیں۔گاؤں گاؤں سے لوگ جوق در جوق ایک مخصوص رفتار سے گاتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔وہ حضرت بل درگاہ کے زائرین ہیں جہاں حضرت محمد ﷺ کا موئے مقدس خاص تہواروں پر دکھایا جاتا ہے۔ان مقدس دنوں کی طرف خاص کر خواتین اور بچے آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔یہ نہ صرف اس لیے کہ وہاں موئے پاک کے دیدار ہوتے ہیں بلکہ اس میں بچوں کی یہ خوشی بھی شامل حال ہوتی ہے کہ انھیں نئے نئے کپڑے دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔وہ یہاں الگ الگ اشیا کی دکانوں سے خریداری بھی کرتے ہیں۔مرد زائرین اپنے کندھوں پر چند دنوں کے لیے چاول اور عورت ایک موٹا تازہ مرغا ملاؤں کے لیے لے جاتے ہیں''۔

سری نگر میں اس کے علاوہ ایک اور قابل دید جگہ ہے جو امراض چشم میں مبتلا اور جراحی کے ضرورت مند سینکڑوں دیہاتیوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔یہ ہے مشن ہسپتال جس کے دروازے اب مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر تنگ پڑ رہے ہیں جنھیں کشادہ کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔اس سال یہ تعداد حد سے زیادہ رہی ہے اور اس میں 107 بستر پہلے ہی بھر

چکے ہیں۔ان کے علاوہ دیگر بیماروں کا دس بجے سے پہلے ہی علاج کیا گیا ہے۔گیارہ بجے پہلی دعائیہ مجلس ہوتی ہے۔ پھر کوئی تیس مددگار بیماروں کو ایک ایک کر کے علاج معالجے کے کمرے میں بھیجتے ہیں۔کئی ایک تو معمولی دوائی سے صحت یاب ہو جاتے ہیں اور دوسرے آپریشن کے کمرے میں بھیجے جاتے ہیں۔خواتین کو وارڈوں میں بھیجا جاتا ہے اور دوپہر تک ایک سو بیماروں کو فارغ کیا جاتا ہے۔

جن بیماروں کی حالت غیر ہوتی ہے انھیں الگ سے اور زیادہ احتیاط سے جانچا جاتا ہے۔ ان میں ایک بچہ بھی شامل تھا جو مکان کی اوپری منزل سے گرا تھا اور اس کی کھوپڑی ٹوٹ چکی تھی۔ایک عورت کو اندر اور باہر سے گہری چوٹیں آئی تھیں(وہ تو جان بر نہیں ہو سکی البتہ بچہ بچ گیا)۔ایک اور شخص کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔اسے اور کئی ایسے ہی بیماروں کو جراحی کی ضرورت تھی لیکن دوپہر کو ہم نے یہ کام ملتوی کیا اور اپنے مددگاروں کے ساتھ دعائیہ کے لیے گرجے میں چلے گیے۔اس کے بعد ہم الگ الگ وارڈوں میں انجیل کا درس دینے کی خاطر داخل ہو گئے۔

پونے ایک بجے پھر سارا کام زوروں پر ہے۔ایک کمرے میں فیس ادا کرنے والے چند بیمار ہیں جن میں ایک اعلیٰ ریاستی افسر بھی ہے۔ان کی بھی نگہداشت ہو رہی ہے اور ساتھ ساتھ جراحی کا عمل بھی انجام دیا جا رہا ہے۔ڈھائی بجے کے قریب سبھی بیماروں کا علاج کیا جا چکا ہے۔ عملے کے یورپی اراکین جلدی دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔پھر ہمیں آپریشن کے کمرے میں چھ بڑے اور چالیس چھوٹے آپریشن کرنے ہیں۔

دس دن تک سفر میں رہنے کے بعد ایک بے حال مریض کو ایک ایسے قصبے سے لایا جاتا ہے جہاں پہلے ہی ایک ڈاکٹر موجود تھا۔"تم کیوں یہاں آئے؟"۔اُس نے جواب دیا۔"ارے! ڈاکٹر صاحب! کیا بتاؤں۔اُس ڈاکٹر نے میرے بیٹے کی ٹانگ کو کاٹنا چاہا جبکہ ہم نے آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ ٹانگیں جوڑتے ہیں"۔اس بچے کو جراثیم سے بچانے کی دوائی سے صاف کیا گیا۔پھر اسے ایک اور زوداثر دوا دے کر اس کی ہڈی کا چھوٹا سا حصہ نکال کر اس کی ٹانگ بچائی گئی۔وہ دو مہینوں میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ چار بجے تک ہم نے 350 بیماروں کا علاج کیا تھا۔لیکن ہمارا آخری آپریشن سات بجے ختم ہوا۔اس کے بعد بھی مجھے اس لیے بلایا گیا تا کہ میں وارڈوں میں ان بیماروں کو دیکھ لوں جن کا دن میں آپریشن ہوا تھا مگر جن کے زخموں سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ یہ ایک مصروف ترین دن تھا۔ہم تین ڈاکٹروں اور دو سینئر مددگاروں نے اکیس بڑے اور پچاس چھوٹے آپریشن کیے تھے۔ ہمارا کام ختم ہو چکا تھا مگر نرسوں کا کام نصف شب تک جاری رہا۔

سال میں اپریل، مئی اور اگست ہمارے لیے مصروف ترین مہینے ہوتے ہیں۔اپریل میں ہم نے صرف ایک دن میں 438 بیماروں کو دیکھا۔انجیل کی تدریس ہمارے کام کاج کا ایک اہم حصہ ہے تا کہ ہمارے مقاصد کو غلط رنگ میں پیش نہ کیا جائے اور یہ کہ عیسائیت کا پیغام دکھی دل والوں اور غم زدوں کے لیے اطمینان قلب کا کام کرے۔ڈاکٹر ولفریڈ گرینفیل نے اس حوالے سے یہ الفاظ دوہرائے ہیں:

وہ مہربان ہو کر مہربانی کرتا رہا
اس سے اُس کا دل باغ باغ ہوا
جب اُس نے غریبوں کو خوش کیا
اور ہر روز صبح سے برابر شام تک کیا

ہسپتال میں کام وقت پر ہونا چاہیے۔کبھی کبھی اس سے جسمانی تکلیف بھی ہوتی ہے جو بعض اوقات مذاق سے کم ہو جاتی ہے۔ٹی۔آر۔واڈے نے کوئی پچاس سال قبل اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ کشمیری بیمار نہایت توہم پرست ہوتے ہیں۔جب انھیں ہسپتال سے چھٹی دی جاتی ہے تو وہ سیدھے اپنے پیر کے پاس جاتے ہیں تا کہ وہ اپنی صحت یابی کے لیے اس کا شکریہ ادا کریں اور نقد رقم کا نذرانہ دیں۔ان کا یقین ہے کہ یہی پیر اُن کی تندرستی کا باعث بنا ہے۔مسٹر واڈے ایسے بیماروں سے پوچھتا۔''تم ہمیں سارا کام اور تکلیف دیتے ہو مگر تعریف اپنے پیروں کی کرتے ہو؟''۔ایسے الفاظ تو کئی اور کشمیریوں کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔اگر چہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب وہ شک اور وہم کی اس دنیا سے رفتہ رفتہ نکل رہے ہیں۔

ایک دن میں نے ایک شخص کو ہسپتال سے نکلتے دیکھا جس نے ڈاکٹر آرتھر نیو کا ہاتھ پکڑا تھا

اور وہ اُس سے کچھ مانگ رہا تھا، نیو نے مجھ سے کہا۔ ''یہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ جو رسولی میں نے اس کی کمر سے نکالی ہے میں اس کا ایک حصہ اسے دے دوں۔ کیونکہ یہ مریض مجھ سے کہتا ہے کہ اگر مجھے اس کی رسولی نکالنے میں کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا تو میں اس آپریشن کے لیے اتنی محنت نہیں کرتا''۔

دوسری مرتبہ ایک چالیس سالہ مسلمان میرے پاس آیا اور آتے ہی زار و قطار رونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر لکڑی کے فرش کو گیلا کرتے رہے۔ آنسوؤں کا یہ سیلاب دیکھ کر مجھے یقین ہوا کہ کشمیریوں کے پاس واقعی پانی کے ذخیرے موجود ہوتے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا بات کیا ہے؟ تو وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں ایک یتیم ہوں، میں ایک یتیم ہوں''۔ اب میں سوچنے لگا کہ میں اسے کس طرح چپ کراؤں؟ خوش قسمتی سے مجھے یاد آیا کہ میں بھی تو یتیم ہوں۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اسے آنکھوں پر رکھا گویا میں بھی رو رہا ہوں لیکن میرے آنسو اس کے ذخیرۂ آب کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا میں صرف سسکیاں بھرتا رہا۔

''میں بھی تو ہوں، میں بھی تو ہوں''۔ ہمارے آنسو آپس میں خلط ملط ہو گئے اور نتیجہ معجزاتی تھا کہ ہمارے پانی کے ذخیرے جیسے سوکھ گئے اور پھر ہم کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور یتیم ہونے کے سارے غم بھلا دیے۔ وہ یہ ڈراما صرف اس لیے کر رہا تھا کہ میں ایک رحم دل ہوں اور اس کی نقلی اشک شوئی سے متاثر ہو کر اسے کچھ روپے پیسے دے دوں۔

اہل کشمیر ایک دلچسپ مخلوق ہے۔ جن کی آنکھوں میں پانی کے ذخیرے ان کی لطف اندوزی میں برابر اضافہ کرتے ہیں کیونکہ وہ بڑے اداکار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسے بے شمار مریض ہیں جنھیں اسی صورت میں علاج حاصل ہوسکتا ہے جب ڈاکٹر وادی میں اور اس سے بھی دور اُن کے علاقوں میں دورے پر جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ بدنصیب صرف اس وقت آرام پائیں گے جب انھیں موت اپنے پاس بلائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ جب ستمبر 1919 میں ڈاکٹر آرتھر نیو ہم سے بچھڑ کر عالم بالا میں چلا گیا تو اس کی قبر پر جو ہجوم جمع ہوا اس کی مثال پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ان کی تعداد دو سے تین ہزار سے

نہیں تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ زار زار رو رہے تھے بلکہ اگلے دن انھوں نے ایک مجلس بھی بلائی جس میں اس بات پر غور و خوض کیا گیا کہ اُس مرحوم کی یاد میں کیسی شایانِ شان یادگار منائی جائے جو چالیس سال تک ان کا ہمدرد اور دوست بنا رہا۔

بڑے ہسپتال میں کام کاج سنبھالنے کے علاوہ سرکار نے ان ڈاکٹروں کے ہاتھ میں کوڑھ کے مریضوں کے ہسپتال کا کام کاج بھی دیا ہے جس میں ایک سو سے زیادہ کوڑھی ہیں۔ یہ ہسپتال جھیل ڈل کے پاس ایک خوبصورت جگہ پر ہے۔ کوڑھیوں کو باغبانی کا کام کرنے کو کہا جاتا ہے تاکہ وہ مصروف رہیں اور اپنی اذیت ناک زندگی کی مصیبت کو وقتی طور پر بھلا سکیں۔ میں یہاں ڈاکٹر ارنیسٹ نیو کی کتاب Beyond the Pir Punjal ''پیر پنجال سے پرے'' سے یہ اقتباس نقل کرتا ہوں:

''کشمیر میں کوڑھیوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ انھیں الگ الگ رکھا جائے۔ جو ہسپتال میں آتے ہیں وہ رضا کارانہ طور پر خود ہی ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ مشکل پیدا ہوئی ہے کہ ان میں ہنر مندی کا کام کرنے کی دلچسپی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ یہ ضروری ہے ان میں جو ہٹے کٹے ہیں وہ کوئی کام کریں۔ لہٰذا ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ کم از کم اپنے کمرے صاف و پاک تو رکھیں۔ اسی طرح گھاس کاٹنا، چونے کی لپائی کرنا، راہ داریاں بنانا وغیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لیے ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ یہاں بچوں کے لیے ایک چھوٹا اسکول بھی ہے۔ اکثر مریض کشمیر کے تمام اضلاع سے آتے ہیں۔ کوڑھ کا مرض پشتینی نہیں ہے جیسا کہ اس قسم کی باتیں وہی کرتے ہیں جو پر ہجوم جھونپڑیوں میں غیر صحت بخش ماحول میں رہتے ہیں۔ اس بیماری کی دو قسمیں ہیں۔ یا تو زرد دھبے پیدا ہوتے ہیں جن میں حس نہیں ہوتی۔ یہ دھبے مریض کی انگلیوں یا انگوٹھوں پر ظاہر ہوتے ہیں جو پھر کٹ کر گر جاتے ہیں۔ اس قسم کا مرض اس سے مشابہت رکھتا ہے جس کا تذکرہ انجیل میں کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی بیماری میں جسم کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ جسم میں لنگڑا پن آ جاتا ہے اور چہرے کو بھی داغ بگاڑ دیتے ہیں۔ کئی معاملوں میں مرض آنکھوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا اور متاثرہ شخص اندھا ہو جاتا ہے۔

یہاں صورت حال یہ ہے کہ جو مریض اس بیماری کی زد میں پوری طرح آ چکے ہوں انھیں

گھروں سے باہر نکالا جاتا ہے اور اہل خانہ ان کے ساتھ کھانا پینا منقطع کرتے ہیں۔لہٰذا ان کا حال نہایت دردناک ہے۔ بیماری سے کم متاثرہ لوگ اپنے گاؤں میں ہی رہ پاتے ہیں مگر دوسرے انھیں اپنے لیے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں کشمیر کے پہاڑی علاقے میں سفر کر رہا تھا کہ میں ایک کٹیا میں پہنچا اور وہاں تھوڑا سا دودھ مانگا۔ایک شخص برتن میں دودھ لے کر آیا۔میں یہ پینے ہی کو تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ ایک کوڑھی ہے۔جب کوڑھی لوگوں کے ساتھ مل کر دہاں صحت مندوں کے یہاں کھاتے، پیتے، رہتے اور سوتے ہیں تو خطرات بڑھ ہی جاتے ہیں۔اسی لیے اگر ہسپتال میں زیادہ سے زیادہ مریض داخل ہوں تو باہر اس بیماری کا پھیلنا کم ہو جائے گا۔علاج معالجہ بھی مناسب ہے اور اکثر بیمار تندرست ہو جاتے ہیں۔انھیں خوراک، لباس اور بستر مہیا کیا جاتا ہے۔اگر رقومات فراہم ہوں تو ہسپتال کے لیے لوہے کے بستروں کا انتظام ہو جائے گا۔

روحانی مجالس کا سلسلہ بھی ہسپتال میں جاری وساری ہے۔اس سے کبھی کام کی مشکلات اور تساہل کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔کوڑھی ہسپتال میں مریض ہر طرح سے عیسائیوں کے طریق کار سے بندھے رہتے ہیں۔ان کے اپنے دیہاتوں میں اکثر اچھوت ہیں اگر چہ لوگ انھیں خیرات دیتے ہیں۔کوڑھی ہسپتال میں اس کے برعکس انھیں سب کچھ مختلف دکھائی دیتا ہوگا۔یہاں انھیں آرام دہ کمروں میں اور جاڑے کے لیے جلانے کی لکڑی کے ساتھ وافر کھانا اور کئی سہولتیں میسر ہیں۔ان کے زخموں پر روز پٹی باندھی جاتی ہے اور ان کے ساتھ دوستانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔جب ہم سارے بیماروں کو دیکھ کر ان کے پاس جاتے ہیں، ہم انھیں ایک جگہ جمع کر کے ان کے لیے صحیفے سے کوئی عبارت پڑھتے ہیں جس کی تشریح ہم آسان زبان اور لہجے میں کرتے ہیں۔اس اجتماع میں حاضر ہونا رضاکارانہ ہے۔گرمیوں میں سبھی آجاتے ہیں لیکن جاڑوں میں صرف تیس یا چالیس افراد ہی دکھائی دیتے ہیں۔مریض ان مجلسوں میں مذہبی ارشادات کو بغور سنتے ہیں۔اگر چہ وہ پوچھے گئے سوالات کے صحیح جوابات نہیں دے سکتے۔ان میں سے اکثر کو یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ دوسرے لوگ ان کے بارے میں یہ نہ سوچیں کہ وہ عیسائی بن گئے ہیں۔ان میں سے وقتاً فوقتاً عیسائیت قبول کر چکے ہیں جس کا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑا ہے۔انھیں دوسرے

کوڑھیوں کی طرف سے قسم قسم کی تکالیف دی گئی ہیں جو ان کے ساتھ کھانا کھانے سے دور رہتے ہیں اور ان کے کمروں میں رہنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ان کے تئیں زبردست تلخی کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی جب ہماری مذہبی مجلس اختتام کو پہنچتی ہے تو یہی لوگ خاموشی سے لب ہلاتے ہوئے آمین کہتے ہیں۔ دراصل وہ عیسائیت کو اپنانا چاہتے ہیں مگر بپتسمہ لینے سے کتراتے ہیں کیونکہ انھیں یقین ہے کہ بپتسمہ لینے والا محمدی برادری سے خارج ہو چکا ہے۔

کوڑھی ہسپتال میں سب سے پہلے عیسائی بننے والا کے۔ کے تھا۔ وہ ایک عقلمند اور آزاد خیال شخص اور کوڑھیوں میں سب سے بہتر ہے۔ پہلے پہل وہ عہد نامۂ جدید کے مطالعہ سے متاثر ہوا جو اسے پڑھنے کے لیے دی گئی تھی۔

کوڑھیوں کے ہسپتال میں کام کے بڑھ جانے اور اس کے پھیلنے کا رجحان اب بھی موجود ہے اور مجھے اس میں کوئی شک نظر نہیں آتا کہ ہم جلد ہی اس میں چار سو کوڑھیوں کو داخل کر سکیں گے۔ یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ مہارعبہ کشمیر کی عقلمندی اور وسیع القلبی کی بدولت یہ کام چرچ مشنری سوسائٹی کی مالی امداد میں کسی تبدیلی کے بغیر بخوبی چل رہا ہے۔ اگر یہاں کوئی انگریز نہیں ہوتا تو کام اور بھی دلچسپ ہوتا۔ پھر ان سے صرف یہی ایک بات نہیں کہنی پڑتی کہ: ''بیماروں کا علاج کرو اور ان سے کہو کہ خدا کی سلطنت تمھارے قریب ہے''۔ اگرچہ کئی کوڑھی بات نہیں مانتے پھر بھی اس کا کوئی افسوس نہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہم نے دس کوڑھیوں کو ٹھیک کیا مگر ان میں سے صرف ایک ہی شکریہ کرنے کے لیے ہمارے پاس آیا۔ کیا کہا جا سکتا ہے یہی کوڑھی خدا کے نزدیک ہو اور جو ہٹے کٹے ہوں اور شاہانہ زندگی گزار رہے ہوں اور اس بات سے بے خبر ہوں کہ چاہے کوئی بھی وقت ہو کام کرتے رہنا چاہیے۔

اہل کشمیر خوش قسمت ہیں کہ انھیں اچھی خاصی طبی سہولتیں میسر ہیں۔ ان کے لیے سری نگر میں مردوں اور خواتین کے لیے دو اعلیٰ سرکاری ہسپتال اور تمام اہم جگہوں پر دوا خانے موجود ہیں۔

موجودہ چیف میڈیکل افسر کا نام کرنل دھونی چند ہے جس نے ڈاکٹر لیونگ اسٹون کے سوانح پڑھ کر طب کا پیشہ اختیار کیا۔ لہٰذا ریاست کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ایسا معالج ملا جو دکھی

دلوں کوخوشی اور بیماروں کو ضروری علاج فراہم کرتا ہے۔زنانہ ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹروں کا ہونا بھی لوگوں کے لیے نیک شگون ہے۔ڈاکٹر جینیت واگن اس وقت مہتمم ہےاور شہر کی وہ خواتین بھی خوش قسمت ہیں جنھیں ایسی دوست ملی ہے۔

اسلام آباد میں ایک اچھی طرح چلنے والا ہسپتال ہے جس کی بنیاد مسز بشپ نے ڈالی تھی جو ایک سیاح اور ادیب کی حیثیت میں مس ازابیلا برڈ کے نام سے جانی جاتی ہے۔یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہاں دو فرض شناس خواتین ڈاکٹر منی گومری اور مس نیونہم کام کاج سنبھال رہی ہیں۔

سری نگر میں خواتین کی خوش قسمتی سے انھیں انگریز خواتین کی قربت حاصل رہی ہے جنھوں نے ان کی بیماری اور اضطراب میں ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ان میں سے ایک مس نیومین ہے جس نے تقریباً تیس سال تک رات دن یہ خدمت انجام دی ہے۔اسے جب بھی بیماروں نے بلایا وہ حاضر ہوئی۔بیماروں کا علاج اس نے نہ صرف ان کے گھروں میں کیا بلکہ وہ ان کی دور دراز جھونپڑیوں میں بھی ان کی دیکھ بھال کرتی رہی۔جو لوگ کشمیر کے بازاروں اور ہانجیوں کی زندگی سے واقف ہیں وہی جانتے ہیں کہ اس کے کیا معنی ہیں؟

بیسواں باب

تعلیم

کشمیر میں مقامی مدرسے ہمیشہ مسجدوں سے وابستہ رہے ہیں جہاں لڑکوں کو عربی سکھائی جاتی ہے تاکہ وہ قران کی تلاوت کرنے کے قابل بن جائیں اگرچہ قران کو سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔

اسی طرح برہمنوں کے اسکولوں میں سنسکرت پڑھائی جاتی ہے جس سے طلبا ہندوؤں کی مقدس کتابیں پڑھ سکیں۔ان دو زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت کے ساتھ فارسی زبان کا بھی اضافہ کیا گیا ہے اور اب ریاضی بھی کسی حد تک پڑھائی جاتی ہے۔طلبا کی عمر پانچ سے سولہ یا اٹھارہ سال تک کی ہوتی ہے۔انھیں ایک ساتھ جاڑوں میں ایک ہی کمرے میں پڑھایا جاتا ہے جبکہ گرمیوں میں یہ پڑھائی برآمدے میں کی جاتی ہے۔البتہ انھیں گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔کبھی کبھی ان کے لیے کتابوں کی تعداد ناکافی ہوتی ہے لہٰذا لڑکے ایک دوسرے سے سر جوڑ کر ایک ہی کتاب سے استفادہ کرتے ہیں۔یہ پرانی کتابیں عام طور پر طلبا کے والدین کی ہوتی ہیں جنھیں سالہا سال تک کام میں لایا گیا ہوتا ہے اور اب ان کی حالت خستہ ہوتی ہے۔ان کے اوراق پھٹے ہوئے ہوتے ہیں جن پر جگہ جگہ تیل کے داغ ہوتے ہیں۔کبھی کبھی ان کتابوں پر رس اور چاول کے داغ بھی

دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طالب علم سات انچ چوڑا اور گیارہ انچ لمبا لکڑی کا بورڈ ساتھ لاتا ہے جسے تختی کہتے ہیں۔ چاک کی مٹی اور پانی سے بھری ایک دوات اور شیشے کا ایک گول ٹکڑا بھی ہوتا ہے، جس سے اس تختی کو رگڑ کر چکایا جاتا ہے تاکہ اس کی سطح ہموار اور چمکیلی ہو جس پر نرقلم روانی سے چل سکے۔ اسکول میں بہت سارا وقت کالے بورڈ سے چاک مٹی کو صاف کرنے اور اسے پالش کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے مگر طلبا کو ورزش فراہم کرتا ہے۔ یہی ایک ورزش لڑکوں کو اسکول میں نصیب ہوتی ہے۔ کھلاڑی تو شریفوں سے رابطہ نہیں رکھتے جبکہ طلبا شریف ہوتے ہیں۔ کسی کے اسکول میں پہنچنے سے پہلے ہی لڑکوں کی جماعت کے کمرے میں زور کا شور سنائی دیتا ہے، جس کے معنی یہ ہے کہ پڑھائی پوری لگن سے ہو رہی ہے۔

جماعت میں داخل ہوتے وقت دیکھا جاتا ہے کہ تیس سے پچاس لڑکے فرش پر بیٹھ کر اپنے آپ کو جھولوں کی طرح آگے پیچھے ہلاتے رہتے ہیں تاکہ جو کچھ وہ پڑھیں وہ انھیں زبانی یاد رہے۔ چونکہ ہر طالب علم الگ الگ الفاظ سیکھتا ہے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں کا شور وغل کس قسم کا ہوگا؟ یہ منظر اس قدر جاذب نظر ہوتا ہے کہ آپ خود بھی اس میں شامل ہو کر بچوں کا کوئی گیت اُن کے ساتھ گانا چاہتے ہیں۔

دریں اثنا مدرس اپنی جماعت کے نصاب کے مطابق عربی یا سنسکرت میں بڑبڑاتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں چھڑی کی بجائے خارش زدہ گھاس کی ٹہنیں ہوتی ہیں جنھیں وہ طلبا کی ٹانگوں پر مار کر انھیں دیر تک درد سے تڑپاتے ہیں۔ (1) اس کے علاوہ استادوں کے پاس نقش و نگار والی لکڑی کے تراشے گئے سانچے ہوتے ہیں جن سے سفید سند کی چادروں کو سجانے کے لیے گل بوٹوں کی چھاپ ثبت کی جاتی ہے۔ اس سے طالب علموں کی ٹانگوں کو داغا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ نہانے کے لیے پانی کا رخ نہ کریں۔ چونکہ اکثر طالب علم تیرنا نہیں جانتے لہٰذا ان کے ڈوب جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اگر وہ نہائیں تو یہ چھاپ مٹ جائیں گے اور ان کی حرکت کا پتہ چل جائے گا۔ استاد اس عمل سے یہ باور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے بچوں کو خطروں سے بچانے کے لیے کتنا خیال رکھتے ہیں۔

اگر آپ کسی وقت جماعت کے اندر داخل ہوں گے تو اندر قدم رکھتے ہی آپ کو طلبا کے

کپڑوں سے ایک عجیب قسم کی بو آئے گی۔ اس کی یہ بھی وجہ ہے کہ انھیں پانی سے دور رہنے کا حکم ہے لہٰذا وہ کپڑے بھی نہیں دھوتے جبکہ استاد خود صاف و شفاف لباس پہنتے ہیں۔ سردیوں میں جب جماعت کی ساری کھڑکیاں بند ہوتی ہیں تو آپ بدبو چھوڑتی ہوئی اس جگہ پر صرف چند لمحے گزار کر ہی وہاں سے نکلنے کو ترجیح دیں گے۔

ادھر مدرس سے لے کر طالب علم تک اپنے پھرن (2) کے نیچے کانگڑی (3) لیے ہوتا ہے۔ اس مضر صحت ماحول کے پیش نظر اگر کسی سے کہا جائے کہ وہ جماعت کا معائنہ کرنے کے بعد متعلقہ کتاب میں اپنے تاثرات قلم بند کرے تو وہ ضرور یہ رائے دے گا کہ طلبا کے نصاب میں ماحولیات کے مضمون کا بھی اضافہ کیا جائے۔

اگر آپ گرمیوں میں کلاس کا معائنہ کریں گے تو یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہوگی کہ استاد ایک کونے میں دبکا ہوا سویا ہے اور گہری نیند کے مزے لے رہا ہے۔ طلبا اس دوران نہایت نظم وضبط کے ساتھ شور بالکل نہیں مچاتے مبادا استاد ایک لمبی نیند سے جاگ جائے جس میں اسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھنے کا اضطراب نصیب نہیں ہوگا۔

یہ کوئی چالیس سال پہلے کی بات ہے کہ یہاں مشن اسکول شروع کیا گیا۔ پھر سرکار نے بھی ایک اسکول اور پھر دو اسکول کھولے جو بعد میں مڈل اسکول بن گئے اور آخر میں ہائی اسکول بنائے گئے جن کو پھر پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کیا گیا۔ اس وقت سری نگر میں دو سرکاری ہائی اسکول ہیں۔ ان میں سے ایک اسلامیہ ہائی اسکول اور ایک سی۔ ایم۔ ایس اسکول ہے۔ ان میں لڑکے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کرتے ہیں جس کا نصاب پنجاب یونیورسٹی کا مقرر کردہ ہوتا ہے۔ یہ امتحان پاس کرنے کے بعد طلبا سری نگر میں سری پرتاپ اسٹیٹ کالج میں داخلہ لیتے ہیں جبکہ چند سال پہلے تک وہ لاہور کے کالج یا کشمیر اسٹیٹ کالج جموں میں پڑھتے تھے۔

ریاست میں تعلیم مفت ہے۔ بارہمولہ میں طلبا کے لیے رومن کیتھولک ہائی اسکول اور اسلام آباد میں سی۔ ایم۔ ایس ہائی اسکول ہے۔ کشمیر میں اس علم کی تمام سہولتیں موجود ہیں جو لڑکوں کے لیے امتحانات کا مرحلہ طے کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

روپے پیسے کے بعد امتحانات میں پاس ہونا کسی بھی طبقے کے لیے خدا کو پانے کے برابر

ہیں کیونکہ یہ پاس کرنے کے بعد انھیں سرکار میں نوکری مل جاتی ہے اور اس طرح وہ ان بیویوں کے خاوند بن جاتے ہیں جو متمول گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے مفت ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ تمام طبقوں کے طلبا مدارس میں جوق در جوق داخلہ لیتے ہیں اور ہر سال دو سو سے زیادہ لڑکے دسویں جماعت کے امتحان میں نظر آتے ہیں۔ان میں سے ایک سو سے زائد کامیاب ہوتے ہیں جن میں سے پھر چالیس یا پچاس کالجوں میں داخل ہوتے ہیں۔باقی ماندہ لڑکے بیکاروں کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں جو سرکاری ملازمت پانے کے لیے سارے جتن کرتے ہیں۔ہندوستان کی طرح کشمیر میں بھی مایوس بے روزگاروں کا ایک جم غفیر موجود ہے۔انھیں زندگی کے دائرے سے باہر کیا گیا ہے جہاں انھیں کوئی کام مل جاتا لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو مزدوروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں انھوں نے کلرکی کے مقام تک پہنچنے کی کوشش تو کی۔اگر چہ وہاں مشاہرہ قلیل ہی تھا لیکن وہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح لوٹ مار کر کے اپنی قسمت سنوار تو سکتے تھے۔

ایک دیرینہ ضرورت کو اب ٹیکنکل اسکول کی شکل میں پورا کیا گیا ہے جسے راجہ سر امر سنگھ کے۔سی۔ایس۔آئی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔یہ شہر سے باہر ایک وسیع عمارت میں واقع ہے جہان اسے وسعت دینے کی بہت گنجائش ہے۔مسٹر ایف۔ایچ۔انڈریوز کو اس اسکول کا پرنسپل مقرر کرنے کے لیے سرکار مبارک باد کی مستحق ہے کیونکہ مسٹر انڈریوز اس معاملے میں بہت کچھ آگاہی رکھتا ہے۔البتہ یہ شخص ایک معاملے میں کشمیریوں سے مات کھا گیا۔یہاں عام دستور یہ ہے کہ اگر آپ نے ایک اخروٹ کی لکڑی کا بنا بے حد خوبصورت میز غور سے نہ دیکھا اور گھر جا کر اسے جانچنے کی ضرورت محسوس کی تو آپ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوگی کہ اس کے نچلی طرف کے جوڑ معمولی لکڑی کے کمزور ٹکڑوں سے ٹھوکے گئے ہیں اور جگہ جگہ پُٹین سے اس کی درازوں کو بند کیا گیا ہے۔نتیجہ ظاہر ہے کہ صرف کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہی اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور یہ کباڑی کے سوا کسی اور کے کام کا نہیں رہتا۔

اس کے برعکس جب میں برما میں خانقاہوں میں جاتا ہوں جو اندر باہر سے محرابوں کی شکل میں تعمیر کیے گئے ہیں اور جن پر اس نزاکت سے کاریگری کی گئی ہے کہ ان کے سارے نقوش دور

سے اچھی طرح سے نہیں پہچانے جاتے اوران پر جو باریک کام کیا گیا ہے تو لگتا ہے کہ وہ غالباً صرف خدا ہی پوری طرح دیکھ سکتا ہے۔

مسٹر انڈریوز نے ایک مشکل کام ہاتھ میں لیا تھا کہ وہ کشمیریوں کو ایماندار ہونے کا درس دیا کرتا۔ اوران سے کہتا کہ وہ اپنی بہترین کاریگری سے زیادہ کسی اور شے سے مطمئن نہ ہوں۔ مجھے اس کی برداشت پر ناز ہے کہ وہ بہت حد تک اس مشن میں کامیاب ہوا۔ مسٹر انڈریوز نے تبت کی سطح مرتفع پر وہ دفون خزانے بھی تلاش کیے جنھیں سر آریل اسٹائین نے وہاں دریافت کیا تھا۔

کشمیر میں لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ رواں صدی کی نویں دہائی میں ایک مشنری خاتون نے شہر میں لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا۔ جو لڑکیاں تعلیم پانے کے لیے بہادری کے جذبے سے سرشار تھیں، بہت سہمی سہمی سی تھیں اوران کے والدین بھی ایک اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھے کیونکہ رائے عامہ ان کے خلاف تھی۔ یہ اسکول پہلے انعامات کی تقسیم کے دن تک جاری رہا۔ اسکول کی خاتون سپرانٹنڈنٹ نے چند یورپی عورتوں کو اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی تاکہ ان کی موجودگی سے طالبات اور والدین کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ تمام لڑکیاں جمع ہو چکی تھیں کہ جونہی یورپی خواتین ظاہر ہوئیں تو کسی نے باہر سڑک پر زور سے چلا چلا کر کہا کہ انگریز عورتیں لڑکیوں کو اغوا کرنے کے لیے آئی ہیں۔ دوسرے لوگ بھی اس شور وغوغا میں شامل ہو کر اسکول کی طرف لپکے اور طالبات سے کہنے لگے کہ وہ کھڑکیوں سے کود کر بھاگ جائیں۔ نیچے جو مرد موجود تھے وہ انھیں سنبھال کر زخمی ہونے سے بچاتے رہے۔ انگریز خواتین کے اسکول میں داخل ہونے سے پہلے ہی سبھی اساتذہ بھاگ چکے تھے۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ اس سانحہ کے ساتھ ہی یہ اسکول بند ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کو مندمل کرتا ہے۔ لڑکیاں پھر سے اسکول آنے لگیں اور اب یہاں لڑکیوں کے لیے تین مشن اسکول، ایک اسلامیہ اسکول اور لڑکیوں ہی کے لیے پانچ ہندو اسکول قائم ہیں۔ ان میں سے تین مڈل اسکول ہیں جنھیں جلد ہی ہائی اسکولوں کا درجہ دیا جائے گا۔

اسلام آباد میں مِس کوورڈیل کا ایک سو لڑکیوں کا اسکول ہے جہاں طالبات کے ساتھ انتہائی شفقت اور پیار کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے کیونکہ

وہی اگلی نسل کی مائیں ہوں گی۔

موجودہ حالات میں عورتیں سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی مخلوق ہیں۔ وہ اپنی لاعلمی اور توہم پرستی کی وجہ سے قدامت پسند ہیں۔ وہ مردوں کے مقابلے میں بے علم اور جاہل ملاؤں کے زیر اثر ہیں۔ چونکہ اب لڑکے تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ان کے ذہنوں کے دریچے کھل رہے ہیں یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ ہم خیال بیویوں کو پا سکیں۔ بجائے اس کے کہ ان کی شادی ناخواندہ اور غیر منظم لڑکیوں کے ساتھ ہو جو ان کے لیے عام طور پر ایک بوجھ بنی رہتی ہیں اور جنھیں وہ حیوانوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ سی۔ ایم۔ ایس اسکول نے اب لڑکیوں کے اسکول کو بھی اپنے ساتھ منسلک کیا ہے جہاں طلبا بھی علم کے نور سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں پرنسپل مس فٹز نے اپنی وابستگی، صبر اور طریق کار سے طلبا کے لیے شاندار کام کیا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ بدنظم اور گندی لڑکیوں کے ایک گروہ سے صاف و پاک اور خوددار چھوٹی چھوٹی بچیوں کا ایک حلقہ ابھر کر سامنے آیا ہے جو بہترین طریقے سے زندگی گزار رہی ہیں اور وقت آنے پر اپنے بھائیوں اور لڑکوں کے مدرسے میں ہم جماعتوں کی مددگار ثابت ہو سکیں۔ اسی طرح جب لڑکوں نے توہم پرستی کی کینچلی اتار کے پھینک دی ہو تو انھیں اپنی پسند کی بیویاں نصیب ہوں گی۔ اس طرح وہ دونوں اپنے بچوں کو ایسی تربیت دیں گے جو سماج میں ایک کارآمد نسل کہلائے گی۔

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ شہر بھی صاف ستھرا ہو۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال سرکاری کالج سے بیس سے پچاس تک گریجویٹ نکلتے ہیں جن میں چند لاہور میں تعلیم جاری رکھتے ہیں اور ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری لیتے ہیں۔ انھیں سرکاری انتظامیہ میں جگہ دی جانی چاہیے جس کے لیے سرکار نے خود انھیں تربیت دی ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ تمام اعلیٰ عہدوں پر پنجابیوں اور بنگالیوں کا قبضہ ہے۔ میرے خیال میں یہ واجب نہیں۔

ہندوستان میں آج کل چیخ چیخ کر نعرے بلند کیے جاتے ہیں کہ ''ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے ہے'' اور یہ کہ غیر ملکیوں کو ہندوستانیوں کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے۔ اگر یہ چیخ پکار درست ہے تو یہی ہندوستانی کیوں کہتے ہیں کہ ''کشمیر ہندوستانیوں کے لیے ہے؟'' کشمیر کے

بیٹوں کے لیے کشمیر میں کیوں جگہ نہیں ہونی چاہیے؟ ایسا بالکل نہیں ہے اور صرف بیگانے ہی ہر عہدے پر قابض ہیں۔ جو اپنے لیے حسنِ سلوک کے متلاشی ہیں انھیں دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے۔

فٹ نوٹ:

(1) یہ ایک خودرَو گھاس ہے جس سے اگر جسم کے کسی حصے کو چھوا جائے تو وہاں پر چھالے پڑتے ہیں اور زبردست سوزش ہوتی ہے جو گھنٹوں تک رہتی ہے۔ کشمیری زبان میں اسے سوے کہتے ہیں۔ دیگر کئی زبانوں میں اس کا کوئی متبادل نام نہیں ہے۔

اکیسواں باب

کشمیر مشن اسکول (1)

جب بھی میں مشن اسکولوں کا ذکر کرتا ہوں تو میں پادری جے۔ ہنٹن۔ نوولز جیسی عظیم ہستی کا نام لیے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے ان درس گاہوں کی بنیاد ڈالی۔ اسے ان اسکولوں کی بنیادیں ڈالنے میں دس سال کا عرصہ لگا۔ پھر میرے ساتھی مزدوروں نے ان کی عمارات کو مضبوطی بخشی اور اخیر پر ان کشمیری اساتذہ کو کیسے بھولا جا سکتا ہے جنھوں نے انتہائی ایمانداری سے اور خوشی خوشی انھیں موجودہ حالت تک پہنچانے کی سعی کی۔ ابتدا میں میرے بھائی جارج نے کئی سال تک ایک ٹھوس کام کیا۔ اس کے لیے اس نے کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا اور دیگر عملے کے لیے ایک مثال قائم کی۔ اسی لیے جب بھی کوئی اچھا کام یہاں پر انجام دیا جاتا ہے تو دوسرے کہتے ہیں: ''گوگ صاحب'' یعنی ''گڈ صاحب''۔

ان کے علاوہ کم مدت کے کارکن بھی شامل رہے ہیں جنھوں نے اس عمل میں اور اضافہ کیا۔ ان میں ٹریننگ کالج کا سی۔ ایل۔ ای۔ برگیز ہے جس نے ریاضی پڑھائی۔ آکسفورڈ کالج کا سند یافتہ اے۔ بی۔ ٹنڈیل جس نے تکنیکی اسکول جاری کیا اور برہمن لڑکوں کو نجاری کا کام سکھایا۔ اس طرح سے اس پیشے پر مسلمانوں کی وہ اجارہ داری کسی حد تک ختم ہوگئی جس کی رو سے وہ

غیر مسلم لڑکوں کو یہ ہنر نہیں سکھاتے تھے۔

مجھے ایک اور ایسی مشکل کا ذکر کرنا چاہیے جس کا سامنا ان چھوٹے برہمن ترکھانوں کو کرنا پڑتا ہے۔ ایک برہمن نوجوان جب شادی کی عمر کو پہنچا تو کوئی برہمن اپنی لڑکی اس کی زوجیت میں دینے پر راضی نہیں ہوا کیونکہ نجاری کا کام ان کی نظروں میں شریفوں کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ بے چارہ کچھ عرصے تک تن تنہا ہی رہا لیکن اس پر محبت غالب آ گئی اور اس نے آری اور رندے کو خیر باد کہہ کے ایک چپراسی کی نوکری حاصل کر لی جسے برہمن عزت دار کام سمجھتے تھے۔ برہمنوں نے اس پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نچھاور کی اور وہ ان کی دعاؤں سے شادی شدہ ہو گیا۔

مس ہیلن برگیز نے اسکول میں اولین جماعتوں کی تدریس کا کام سکھایا۔ اس سے بھی مشکلات پیدا ہوئیں کیونکہ والدین نے شکایت کی کہ وہ بچوں کو صرف پڑھائی کے لیے اور کھیلنے کے لیے درس گاہ میں نہیں بھیجتے ہیں۔

ٹرینٹی ہال کیمبرج کا پادری سیسل بارٹن کئی سال تک اسکولوں کے ساتھ وابستہ رہا۔ اس کی زندگی اور تدریسی عمل کئی لوگوں کے لیے مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی یاد ہمیشہ تر و تازہ رہے گی۔ اُس کے بعد پادری ایف۔ ای۔ لوی آیا جو ایم۔ اے اور آکسفورڈ کے ووسیسٹر کالج کا فارغ التحصیل تھا۔ اس نے کالج کی کشتی کو چلانے کا آغاز کیا۔ ایف۔ سی۔ ہال صرف ایک سال تک رہا کیونکہ اسے کہیں اور کام کرنے کے لیے بلایا گیا۔ لوی کئی سال تک میرا ساتھی رہا اور اس سے زیادہ نیک نیت اہل کار نصیب ہونا مشکل ہے۔ وہ اپنی اس دماغی اپج سے دوسروں کو بہت کچھ سکھاتا تھا جس سے میرا دماغ خالی ہے۔

ڈاکٹر کیٹ نولز، ایم۔ بی۔ لندن نے اپنے آپ کو سالہا سال تک وابستہ رکھا۔ اس نے عملے کی خواتین کے لیے قابل تعریف کام کیا اور ان کی اور ان کے پڑوسیوں کی وقت وقت پر مدد کرتا رہا۔

ہم مغربی لوگوں نے جو بھی کام سرانجام دیا اسے تکمیل تک پہنچانا کشمیری احباب کے بغیر ممکن نہیں تھا جن کی تعداد اب مختصر ہو چکی ہے۔ انھیں طلبا کی ساری عادات و اطوار سے پوری واقفیت حاصل ہے۔ عملی طور پر پرانے طلبا ہی مدرس بن چکے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم سبھی ایک کنبے

میں گزر چکے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے لڑتے رہے ہیں۔ ہم نے دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور کامیابی کے بعد مل جل کر خوشیاں منائی ہیں۔

ہسپتال کے ساتھ ہی اسکول چلانے میں بھی کئی رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ والدین کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول نہ بھیجیں۔ چونکہ ان دھمکیوں پر کسی نے کان نہیں دھرا لہٰذا ایک دو اساتذہ کو پولیس تھانوں میں رکھا گیا کہ وہی لڑکوں کو ان درس گاہوں میں داخلہ دینے کی ترغیب دیتے ہیں۔

وقت بدلتا ہے اور جب 1888 میں جے۔ ایچ نولز یہاں پہنچے تو اس نے فوراً ایسے شائستہ شاگردوں کی ایک جماعت قائم کر لی جو انگریزی سیکھنے کے خواہش مند تھے کیونکہ اس زبان نے سرکاری دفاتر میں فارسی کی جگہ لی تھی۔ جب میں اسکول میں نولز کا ہاتھ بٹانے 1891 میں آیا تو اُس وقت وہاں 250 مدرس تھے۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح یہ لوگ فرش پر تھوکتے تھے اور ان کے منہ ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ ان کے لباس بھی بدزیب تھے۔ ان کی پیشانیاں سرخ روغن سے لپی ہوئی تھیں اور ان میں سے اکثر کانوں میں بڑی بڑی بالیاں پہنے ہوئے تھے جو ان کے کانوں کو پھاڑتیں اگر انھوں نے انھیں ان دھاگوں سے باندھا نہ ہوتا جو ان کے سروں کے اوپر بندھے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں سے اٹھنے والی بدبو ساری جماعت کو آلودہ کر رہی تھی۔ ان کے لباس تلے آگ کے انگاروں سے بھری کانگڑیاں تھیں جن سے کاربن کے بخارات اٹھ کر ان کے گندے جسموں اور بغیر دھلے کپڑوں سے ابکائی لانے والی بو چھوڑ رہے تھے۔ ان کے کپڑوں سے لپٹا ہوا کیچڑ جماعت میں بھی پھیل رہا تھا۔ وہ اپنے ایک ہی لباس کو رات دن استعمال میں لا کر اسے شاید کبھی نہیں دھوتے تھے۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سارے شہر پر برف کی چادر تنی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر کالا کیچڑ جما ہوا تھا۔ لہٰذا ان کے لباس کے ساتھ ڈھیر سارا کیچڑ کلاس میں بھی داخل ہوتا تھا۔ پھر میں نے غور سے دیکھا کہ ان کی انگلیوں کے ناخن بے حد لمبے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ لمبے ناخن شرافت کی نشانی ہیں۔ اس سے، بہر حال انھیں یہ دکھانا مقصود تھا کہ وہ ایسا کوئی جسمانی کام نہیں کرتے جس سے ان کے ناخن گھس جاتے۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو سفید پوش یعنی سفید پھول کہتے تھے جو اونچے طبقے کا نشان ہے (1) میں نے اسکول میں ان سے کہا کہ کالے ناخن

ان کے دعویٰ کی تردید ہے۔لہٰذا انھیں وقت وقت پر اپنے گندے ناخن صاف کرنے چاہئیں۔

انعامات دیے جانے کی میری پہلی تقریب پر ریذیڈنٹ کرنل ڈیوڈ اسکول کے ہال میں انعامات دینے کے لیے حاضر تھا۔اُس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھے لگا کہ وہ کوئی مژدہ سنانا چاہتا ہے۔لیکن اس نے میرے کان میں کہا۔'' آپ کے یہاں یہ بچے کتنے گندے ہیں۔دیکھو بسکو! میں اگلے سال صاف ستھرے بچوں کو انعام دوں گا''۔لڑکے بہترین پوشاک پہن کر آئے تھے اور اعزازات حاصل کرنے کے لیے بیتاب تھے۔اب آپ میری خفت کا خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔مجھے یاد آیا کہ ریذیڈنٹ کی ناک میری طرح اس بدبو کی عادی نہیں تھی۔

میرے تعارف کے بعد میں نے پرنسپل سے اجازت مانگی کہ میرے اعزاز میں اسکول میں نصف دن کی تعطیل ہو۔مسٹر نوولز نے از راہِ مہربانی یہ التجا قبول کر لی۔میں نے طلبا کو جگا کر اُن کے ذریعے کوئی شور انگیز کارروائی انجام دینے کا قصد کیا لیکن اس کے برعکس میں نے صرف ان کی غرغراہٹ سنی۔میں نے ان سے پوچھا کہ کیا کشمیری اسی طرح شادمانی کا اظہار کرتے ہیں۔انھوں نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے۔اگر وہ اسکول میں پڑھائی کے لیے آتے ہیں تو تعطیل کا کیا مطلب ہے؟ مجھے احساس ہوا کہ میں کشمیر میں سکھانے کے لیے نہیں بلکہ سیکھنے کی خاطر آیا ہوں۔لہٰذا میں نے اسکول کے اساتذہ اور طلبا سے سیکھنے کا آغاز کیا جس میں مجھے ایسی باتیں ازبر کرنی پڑیں جو میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔

دو سو پچاس طلبا میں تقریباً سبھی برہمن زادے تھے جو ہندوؤں کی اونچی ذات کہلاتی ہے۔انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ان کا دوسرا جنم تھا۔اس حوالے سے انھیں کہا گیا تھا کہ انھیں کیا کھانا اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔مثال کے طور پر وہ ان اشخاص کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے جنھوں نے دوسرا جنم نہ لیا ہو۔اگر مہاراجہ بھی انھیں دعوت دیتا تو وہ اس کے ساتھ بھی ماحضر تناول نہیں کرتے کیونکہ مہاراجہ کم تر ذات یعنی کھشتری یا سپاہیوں کی ذات سے متعلق تھا۔وہ صرف وہی کھانا کھاتے تھے جسے ایک برہمن نے پکایا ہو۔اس باورچی کو کھانا پکاتے وقت پائجامہ پہننے کی اجازت نہیں تھی۔اسی طرح جس جگہ کھانا پکانا مقصود ہو اس کی لپائی پہلے گائے کے گوبر سے کی جاتی تھی۔گائے برہمنوں کے لیے ایک مقدس جانور ہے۔کیڑے مکوڑے گائے کے گوبر پر نہیں بیٹھتے۔(2)

پھر انھوں نے مجھے کھانے کی ان اشیا کی فہرست دی جو وہ نہیں کھاتے۔ مثال کے طور پر پرندے یا انڈے ان کی غذا میں شامل نہیں ہوتے۔ وہ سرخ سیب یا سرخ ٹماٹر بھی نہیں کھاتے بلکہ ان کی جگہ زرد رنگ کا ہی میوہ ہضم کرتے ہیں۔ یہ ایک حیران کن بات ہے کہ اگر چہ وہ کسی جاندار کو مارنا نہیں چاہتے مگر وہ گوشت بھی کھاتے ہیں بشرطیکہ جانور کو کسی غیر برہمن نے ذبح کیا ہو۔ اس صورت حال میں صرف اُن کی نا نا یا ہاں ہاں سنی جاتی ہے۔ میرے پاس دو برہمن الگ الگ طریقوں سے کام کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ میں ایک بار جھیل میں ہاؤس بوٹ میں ٹھہرا تھا کہ میں نے حیرانی سے دیکھا کہ ایک منشی مچھلی پکڑ رہا تھا۔ میں جب اس کے پاس پہنچا تو وہ بولا۔ ''صاحب! اسے میرے لیے ذبح کیجیے''۔ میں نے پوچھا۔ ''تم خود اسے کیوں نہیں مارتے؟'' اس نے جواباً کہا۔

''صاحب! میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ ہم کسی کی جان نہیں لیتے''۔ ''پھر تم کیوں مچھلی پکڑتے ہو؟''۔ وہ فوراً بولا۔ ''مچھلی پکڑنے کے لیے کوئی قانون نہیں ہے البتہ قانون اسے مارنے کی اجازت نہیں دیتا''۔ میرے منشی نے کئی مچھلیاں پکڑیں۔ میں انھیں ذبح کرتا رہا اور وہ مزے لے لے کر کھاتا رہا۔

اس واقعے کے کچھ ماہ بعد میں وادی میں ایک اونچی جگہ پر خیمے میں قیام پذیر تھا اور ماہی خور برہمن منشی میرے ساتھ تھا۔ میں نے مچھلی پکڑنے سے پہلے اس سے کہا کہ وہ اپنے لیے مچھلی پکڑنے کے لیے ایک اور کانٹا اور ڈوری لے کر آئے۔ ہمارے پاس بہت کم غذا تھی لہٰذا اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''صاحب! میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں ایک برہمن ہوں''۔ میں نے اس سے کوئی اور بات نہیں کی۔ وہ میرے پاس آ کر میرے مچھلی پکڑنے کو دیکھتا رہا۔ جب ایک مچھلی کانٹے میں پھنس گئی تو میں نے اسے کھینچ کر اس کے ہاتھ میں ڈال دیا اور اس سے کہا۔ ''منشی! ذرا یہ مچھلی مجھے پکڑوانا''۔ اس نے بغیر کسی تاخیر کے اسے ہاتھ میں لے کر مار ڈالا۔ اس کے بعد جب بھی میں مچھلی کے شکار کو جاتا تو یہ برہمن زادہ شوق سے یہ کام کرتا رہا مگر خود اس نے کبھی مچھلی نہیں پکڑی۔ دراصل وہ برہمن نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہ دو بھائی مچھلی کے کاروبار میں ایک دوسرے کے شریک کار بن کر خوب کمائی کر رہے تھے۔

کسی برہمن کی اخلاقیات کو سمجھنا بہت دشوار ہے۔ گرمیوں میں جماعت میں جب بھی ہاتھ پر کوئی مکھی یا مچھر بیٹھتا ہے تو میں اسے فوراً ختم کر دیتا ہوں۔ کلاس کے برہمن لڑکے اسی وقت کھڑے ہو کر چلاتے ہیں۔ ''ارے آپ نے تو قتل کیا ہے، قتل''۔ پھر وہ اپنی انگلیوں کو دانتوں تلے دباتے جو کوفت اور خوف کی علامت تھی۔ اس کے بعد وہ ایسے موقعوں پر حیرانی کا اظہار نہیں کرتے۔ پھر بھی وہ کیڑوں کو مارنے سے احتراز کرتے۔ میں نے خود ایک لڑکے کو ایک کیڑا اٹھاتے دیکھا جسے اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکے کی گردن میں ڈال کر حفاظت سے رکھا۔ اگر وہ اسے فرش پر ڈال دیتا تو وہ شاید پاؤں تلے روندا جاتا یا اسی کے جسم پر دوبارہ نمودار ہوتا۔ کیڑوں مکوڑوں کو اس طرح سے محفوظ رکھنے کی ان کی یہ عادت بے حد افسوس ناک ہے کیونکہ اس طرح یہ برہمن کتابوں اور تصاویر کو تباہ کرتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ ہر گھر میں کاغذ کے کیڑوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ لیکن انھیں کوئی مارتا نہیں۔ وہ کتابوں کو جھاڑ کر انھیں نیچے پھینک دیتے ہیں مگر یہ کیڑے دم زدن میں پھر انہی کتابوں میں اپنا تخریبی کام کرتے ہیں۔ چوہوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ انھیں زیادہ سے زیادہ پنجروں میں بند کر کے دریا کی دوسری طرف لے جا کر رہا کرتے ہیں۔ چونکہ دریا کے دونوں اطراف میں یہی تماشا ہوتا رہتا ہے لہٰذا چوہوں کی آبادی میں کمی ہونا ممکن نہیں۔

درس و تدریس کے دوران میں نے محسوس کیا کہ مجھے طلبا کو وہ نہیں سکھانا چاہیے جس سے ان کی انا مجروح ہو۔ میں اس غرض سے کبھی ان کے سر تھپتھپاتا یا ان کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتا لیکن مجھے بار بار ایسا لگا کہ وہ مجھے ان نظروں سے دیکھتے ہیں گویا میں ایک کوڑھی یا اچھوت ہوں۔ انھیں چھونا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ لگ بھگ وہ سبھی سر درد یا جلد کی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ ایک بار جب میں نے ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھا جو پگڑی کی بجائے خالی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے اپنی ٹوپی کے نیچے کیا پہن رکھا ہے؟'' وہ خاموش رہا۔ میں نے اس کی ٹوپی اٹھائی تو یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ اس کا سارا سر چیچک سے بھرا ہوا تھا۔ پھر دوبارہ میں نے کبھی اس کے سر کو نہیں تھپتھپایا۔ میں نے اسکول میں یہ بھی دیکھا کہ یہ لڑکے چمڑے سے نفرت کرتے تھے۔ اسی لیے جب انھیں کشتی کے دستانے، فٹ بال یا ناؤ کھینے کے لیے دستانے

پہننے کی ضرورت تھی تو وہ ہچکچاتے تھے اگر چہ میں ان سے کہتا کہ ان اشیا میں انھیں چمڑے کو نہیں چھونا ہے۔

ان رکاٹوں پر قابو پانے میں مجھے مہینوں لگے۔ البتہ وہ کشتی لڑنے والے اور پہلوان بننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی انا کے جال میں پھنس کر کوئی کام نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے لیے عام طور پر نچلے طبقے کے افراد پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ان دنوں کشمیر میں یہ عالم ہے کہ جو بھی شخص اس خودنمائی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ کبھی ایک گھنٹے میں دو فرلانگ سے تیز نہیں چلتا بلکہ اس کی رفتار ایک بیل کی سی ہوگی۔ لہٰذا ان سے کسی ایسے کام کی توقع رکھنا بے سود ہے جس کے لیے جسمانی مشقت مطلوب ہو۔

میں نے کھیلوں کی یہ بات اس لیے نہیں کی کہ ایسے طلبا کو جگایا جائے اور انھیں لڑکوں سے مرد بنایا جائے۔ لیکن یہ ساری تگ و دو انھیں سماجی خدمات کے قابل بنانا تھا اور یہ کہ دوسروں کی خدمت کرنے سے کس قدر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تین وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ وہ اپنی ماضی کی تاریخ کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔ دوم یہ کہ میں نے سری نگر کی سڑکوں پر ہر روز کیا دیکھا کہ کس طرح کمزوروں اور نچلے طبقوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا ہے اور بے رحمی کس حد تک جاری ہے اور سوم یہ کہ عیسائی ہونے کے ناطے میں انھیں اُس خدا سے متعارف کراؤں جس نے بنی آدم کو ہر ایک کے ساتھ ایسی محبت کرنا سکھایا جو زبان سے نہیں بلکہ عمل سے کی جاتی ہے۔

یہ برہمن لڑکے اُن سرکاری کارندوں کے بیٹے یا پوتے تھے جنھوں نے سالہا سال تک کشمیری کاشتکاروں کو گزشتہ برسوں میں اپنے استبداد اور ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ شہر میں ان استیصالی عناصر کے بڑے بڑے مکانات اور بے حساب دولت اس بات کی صاف گواہ تھی کہ انھوں نے کس طرح لوٹ مار سے یہ سب کچھ حاصل کیا تھا کیونکہ جو تنخواہیں انھیں سرکار سے ملتی تھیں وہ اس ٹھاٹھ باٹھ کے لیے بہت کم تھیں۔ ان کے والدین نے انھیں اسی غرض سے اسکول بھیجا تھا کہ وہ بھی سرکاری ملازمتیں حاصل کریں اور اپنے بڑوں کی طرح رشوت ستانی کا بازار گرم رکھیں۔ انگریزی پر عبور حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے آباواجداد سے بھی زیادہ مرتبہ پا سکتے تھے۔ اب اس بیہودگی پر کیسے قابو پایا جا سکتا تھا؟ یہ صرف اس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ انھیں غلط سے نفرت اور صحیح سے محبت

کرنا، زور زبردستی کی مخالفت اور کمزوروں سے پیار کرنا سکھایا جائے۔ یعنی اس کے سراسر برعکس زندگی گزارنا سکھایا جائے جو اُن کے بزرگوں نے بسر کی تھی۔

خالی خولی باتوں سے یا کتابوں کے مطالعہ سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ انھیں سکھایا جائے کہ وہ اچھائی کی طرف داری اچھائی کے مظاہرے سے اور برائی کا خاتمہ برائی کے خلاف عملی جد و جہد سے کریں۔ اس کے لیے اگر انھیں مشکلات کا بھی مقابلہ کرنا پڑے تو وہ بہر حال کرنا چاہیے۔ چونکہ لڑکے ایسا کرنے پر آمادہ نہیں تھے لہٰذا انھیں پہلوانوں جیسے مرد بنانے کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ حق پرست شہری بن کر دوسروں پر مہربانیوں کا اصول اپنائیں۔

شہر سری نگر میں بڑے لوگوں کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ اگر ایسا کوئی مرد راہ چلتا ہو تو آگے چلنے والی عورت کو سڑک کے ایک طرف ہٹ کر اس کے لیے راستہ چھوڑنا ہوگا۔ یہ عورتیں ہی ہیں جنھیں اپنے سروں پر مٹی کے بھاری بھرکم گھڑوں میں پانی بھر بھر کے اور انھیں سر پر اٹھائے گھر پہنچانا ہوگا۔ عورتوں کو ہر حال میں اس لیے رسوائی کا سامنا ہوتا ہے کہ وہ عورتیں ہیں اور غریب نوکرانیاں تو رات کو ان لوگوں کے جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔

اسی طرح مشرق میں حیوانوں کے ساتھ جو سلوک روا ہے اس کا بھلا کون مشاہدہ کر سکتا ہے؟ بوجھ سے ارے، بھوکے اور پیٹھ پر زخموں کے داغ لے کر ان سے سخت سے سخت کام لیا جاتا ہے اور موسم سرما کے دنوں میں گدھے اور گائیں سڑکوں پر وحشی کتوں سے لڑتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ رات کی تاریکی میں غیر اخلاقی اعمال کا سلسلہ جاری ہوتا ہے جس سے کئی لوگ دور ہی رہتے ہیں کیونکہ وہ کیچڑ میں کنکر ڈال کر اپنے کپڑے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔ بہر حال یہ کسی بھی اسکول کے سربراہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو اس بداعمالی سے بچا کر رکھے۔

سوال یہ ہے کہ ان خرابیوں سے کس طرح لڑکوں کو بچایا جا سکتا ہے؟۔ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ لڑکوں کو کشتی سکھا کر اور ان کے پٹھوں کو مضبوط بنا کر اپنی حفاظت خود کرنے کے گُر سکھائے جائیں۔ یہ سارا ہمیں خدا کی طرف راغب ہونے کا درس دیتا ہے جس نے ہمیں سماجی خدمات سرانجام دینے کی ہدایت کی ہے۔ اس لڑائی میں انھیں حریف کو نہ صرف یہ کہ اسکول میں اُس وقت ہرانا ہوگا جب وہ نوجوان ہوں بلکہ یہ لڑائی انھیں اسکول سے باہر بھی کشمیر جیسے ملک میں

آخر دم تک لڑنا ہوگی۔ خدا کے فضل وکرم سے وہ یہ جنگ جیت کر بدکار قوتوں پر غالب آئیں گے۔

یہ فن حاصل کرنے کی خاطر پہلے نیچے لیٹنے کی عادت اولین تربیت کہلائے گی۔ ایک انگریزی اسکول میں پڑھنے والا فاتح کھلاڑی اس کے مقابلے میں جھوٹا کہلائے گا جو اس ملک میں ایسے اسکول کا طالب علم نہ ہو۔ مجھے اس دن کی حیرت اور خوشی یاد ہے جب ایک برہمن لڑکے نے مجھ سے اس وقت سچ بولا جب اسے سزا ملنے کا ڈر تھا۔ اس اسکول میں میرے پانچ سال گزارنے کے بعد یہ پہلا ایسا واقعہ تھا۔ اگلے تین سال میں بھی لڑکے سچ ہی بولتے رہے جبکہ انھیں جھوٹ بولنے کی لت پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد مشکل سے میں نے کسی طالب علم کو دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے دیکھا۔ اس سے قبل سچائی سے وہ ہمیشہ دور ہی رہتے تھے۔

میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ لڑکوں سے براہِ راست سوال نہ کیے جائیں۔ میں ان سے صرف یہ کہتا ہوں کہ وہ آدھے گھنٹے میں میرے سوال کا جواب دیں۔ اس دوران وہ اپنے حواس پر قابو پاتے ہیں۔ اگر میں نے پہلے ایسا کیا ہوتا تو میرے خیال میں اس سے ان کے جھوٹ ہی کو تقویت ملتی اور اس جھوٹ کو ثابت کرنے کی خاطر کئی گواہوں کو بھی سامنے لاتے۔

آپ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کریں کہ طلبا نے جھوٹ کا سہارا لینا مکمل طور پر ترک کیا ہے۔ لیکن وہ اس عیب پر نازاں نہیں ہیں۔ انھیں احساس ہوا ہے کہ اسکول میں سچ بولنا جھوٹ سے بدرجہا بہتر ہے۔ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ اب میں ایسے کئی سابق طلبا کو جانتا ہوں جن کی بات پر میں اسی طرح اعتبار کروں گا جس طرح مجھے کسی برطانوی شہری کی بات میں سچائی دکھائی دیتی ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں اگر کسی لڑکے نے جھوٹ بولا بھی تو اُس وقت اس کا چہرہ لال ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ضمیر جاگ اٹھا ہے جو ایک کشمیری کے لیے بڑی دریافت کہلائی جاسکتی ہے۔

فٹ نوٹ:

(1) مصنف کی یہ توضیح غلط ہے۔ سفید پوش دراصل اس لیے ایک غریب شخص کو کہتے ہیں کہ اس کے پاس دیدہ زیب رنگین لباس خریدنے کی طاقت نہیں ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کے طبقے کا فرد سفید پوش نہیں کہلاتا ہے۔

(2) میں نے بچشم خود ہزاروں مکھیوں اور دوسرے مکوڑوں کو گائے کے گوبر پر بھنبھناتے دیکھا ہے۔

بائیسواں باب

کشمیر مشن اسکول (2)

ایک دوسرے کی غیبت کرنا بھی تکلیف دہ تھا اگرچہ یہ عادت ساری دنیا میں موجود ہے۔ یہ ناگفتہ بہ سلسلہ نہ صرف طلبا میں بلکہ اساتذہ نے بھی اپنایا تھا۔ سرکاری دفاتر میں اور دوسری ہر جگہ آپ کسی نہ کسی کو دوسروں کی چغل خوری کرتے دیکھیں گی جس کا مدعا اپنے فائدے کی خاطر اپنے ہی ہمسائے کو نیچا دکھانا تھا۔

ایک برطانوی افسر نے، جو ایک بہت بڑے سرکاری دفتر کا سربراہ تھا، مجھے بتایا کہ ایک بار صرف ایک دن میں اسے اپنے کلرکوں کی طرف سے چالیس گمنام خطوط ملے جن میں ایک دوسرے کی برائی کی گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وبالِ جان صورت حال سے کیسے نپٹ لے؟ اس بات نے مجھے کچھ کرنے کی شہہ دی اور میں نے تہیہ کرلیا کہ مجھے اسکول میں اسے ہر قیمت پر ختم کرنے کے لیے کوئی راست قدم اٹھانا چاہیے جہاں کے طلبا مستقبل کی امید تھے۔ لہٰذا میں نے ایسی کسی بھی حرکت کو قابلِ سرزنش بتایا کہ کوئی طالب علم کسی اور کے خلاف کوئی بات لے کر میرے پاس آئے بشرطیکہ وہ چغل خور اپنے نام نہاد دشمن سے کھیل کے میدان میں ڈنڈے لے کر نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو۔ اس نسخے نے فوراً ہی اپنا مثبت اثر دکھایا اور اس طرح غیبت ایک تکلیف دہ

بات بن کے رہ گئی۔

یہ جو میں نے میدان میں دنگل کرنے کی سزا سنائی اس سے بعض اوقات کچھ دلچسپ واقعات دیکھنے کو ملے۔ اسکول میں فٹ بال ٹیم کا ایک جسیم برہمن لڑکا تھا۔ وہ ایک دن میرے پاس یہ شکایت لے کر آیا کہ ایک پٹھان عیسائی لڑکے نے اس پر اور اس کے دوستوں پر چاقو سے وار کیا ہے۔ لہٰذا اسے میری طرف سے حفاظت مطلوب ہے۔ میں نے پہلے ایک برہمن استاد کو بلا کر پوچھا کہ کیا اسے اس واقعے کا علم ہے؟ اس نے کہا ہاں یہ صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ تیس طلبا کی جماعت میں لڑکے اس واحد پٹھان کو ستاتے ہیں اور اسے عیسائی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ جب وہ کلاس سے نکلتا تو لڑکے اس پر پتھر برساتے اور کیچڑ پھینکتے۔ اپنے آپ کو بے بس پا کر اس لڑکے نے اصل پٹھانی انداز میں چاقو نکالا اور انھیں للکارا۔ میں نے پھر پٹھان لڑکے کو بھی بلایا اور اس سے سچائی معلوم کی۔ وہ نہایت صاف گوئی سے بولا کہ یہ صحیح ہے کیونکہ اسے ان بدخواہوں سے بچاؤ کا یہی ایک راستہ نظر آیا۔ میں نے بہر حال اس سے یہ کہا کہ اسکول کے لڑکوں کا ہتھیار اُن کے مکے ہیں چاقو نہیں۔ میں نے اس سے یہ چاقو لے کر اسے کھڑکی کے باہر دریا میں پھینک دیا۔ پھر میں نے الزام تراشنے والے کو بلا کر کہا کہ اسے پٹھان سے بذات خود لڑنا چاہیے۔

ہم نے انھیں لکڑی کے پتلے ڈنڈے فراہم کیے۔ میں نے جب ایک ڈنڈا پٹھان کو دے کر اس سے پوچھا کہ کیا وہ اس پنڈت سے دو دو ہاتھ ملانے کو تیار ہے؟(1) اس نے ڈنڈا زور سے زمین پر مارتے ہوئے کہا: ''جی ہاں، میں بالکل تیار ہوں''۔ پھر اسی طرح پنڈت کے ہاتھ میں بھی ڈنڈا تھما کر یہی پوچھا۔ وہ بولا: ''میں ایک عیسائی نہیں ہوں لہٰذا مجھے لڑنا نہیں آتا''۔ وہ چونکہ اس مبارزت کے لیے تیار نہیں ہوا لہٰذا اسے سبھی کی موجودگی میں اس طرح سے معافی مانگنی پڑی کہ اس کے سر سے پگڑی اُتر دا کر اس نے پٹھان کے قدموں پر اپنا سر جھکایا۔

اس سے یہ بیہودگی آئندہ کے لیے ختم ہوگئی۔ پٹھان کو کلاس میں پھر کبھی عیسائی ہونے کا طعنہ نہیں دیا گیا۔ ایک چھوٹی سی لکڑی نے یہ کرشمہ کر دکھایا کہ اخلاقی طور پر تفاوت اور تفرقات کو ختم کرنے کے لیے یہ علاج تیر بہ ہدف ثابت ہوا۔

اس کے علاوہ ایک اور بیہودگی کو لڑکوں کے ذہنوں سے مٹانا تھا جسے یاوہ گوئی یا بدزبانی کہا

جاتا ہے۔اس لعنت کو دور کرنے کے لیے کوئی علاج نظروں میں نہیں تھا۔ پھر بھی ایک ابتدا کے طور پر میں نے ایک لڑکے سے کہا: "کیا تم چاہو گے کہ تمھارا باپ تمھاری گالیوں سے بھری زبان سنے؟"

لڑکے نے ایک مسکراہٹ سے گویا مجھے بتایا کہ تم تو خود نا واقف ہو اور کہا: "کیوں نہیں؟ میرا باپ تو خود بھی اسی زبان میں بات کرتا ہے"۔

"پھر بھی تمھاری ماں ایسے گفتار کو پسند نہیں کرے گی؟"

"کیوں نہیں؟ یہ تو میری ماں ہی ہے جس نے ایسی زبان میں بات کرنا میرے باپ کو سکھایا ہے"

"کیا تمھارا مذہب ایسی بدکلامی کی تمھیں اجازت دیتا ہے؟"

"ہمارے پجاری تو ہمیشہ یہی زبان استعمال کرتے ہیں"۔ برہمن لڑکے کے اس بیان کی ایک برہمن پجاری نے تصدیق کی۔ جب میں نے اس سے ماضی میں کئی پجاریوں کی بدکاریوں کا ذکر کیا اور اس سے کہا کہ انھیں تو سزا ہونی چاہیے تھی۔ تو پجاری دریدہ دہنی سے بولا: "مسٹر بسکو! آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندو قانون کسی حد تک غیر اخلاقی کام کی اجازت دیتا ہے"۔ پھر میں نے اُس سے وضاحت کرنے کو کہا تو اس نے جواب دیا کہ اس سے ہندو دھرم کی وسیع القلبی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ میں نے اسے مبارکباد دی۔

میں چونکہ ہندو طلبا کی زبان شائستہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔ جس سے ان کی اخلاقیات بھی صحت بخش بن سکتی تھی لہٰذا اس میں ہمیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ ہم نے کس طرح اس بری عادت کو ختم کیا۔

برہمن لوگ دوسروں کے مقابلے میں مغرور ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے بقول انھوں نے دوسری بار جنم لیا ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ وہ بھگوان ہی کا ایک جزو ہیں۔ برہمن لڑکوں نے مجھ سے کہا کہ وہ گناہ نہیں کر سکتے اور جب انھیں ایسا کرتے ہوئے پکڑا گیا تو ان غیر اخلاقی حرکتوں کے جواز میں ان کا کہنا تھا کہ وہ محض اپنے والدین اور اجداد کے نقش قدم پر چلتے تھے لہٰذا انھیں کسی قسم کی شرمندگی نہیں ہے۔

اب انھیں کس طرح شرمندہ کیا جاسکتا تھا؟۔انھیں اپنے گندے کپڑوں، بدبودار جسم، بزدلی، دروغ گوئی اور بدزبانی پر کوئی خفت نہیں تھی۔ چونکہ وہ برہمن تھے لہٰذا وہ ان ساری خباثتوں کو جائز سمجھتے تھے۔

جب میں نے ایک بار اُن سے کہا کہ پہلے جن طلبا نے کلاس میں سب سے زیادہ مرتبہ حاصل کیا ہے ان کی عمر اٹھارہ سے چوبیس سال کی تھی تو ان میں سے اکثر لڑکوں نے کالی داڑھی رکھی۔ان کی شادیاں ہوئیں اور بالآخر وہ اپنے اچھے خیالات کے مالک بن گئے۔ان میں غرور کا یہ گمان دیکھا گیا جو نا قابل برداشت تھا کہ انھیں اعلیٰ ترین علم پر عبور حاصل تھا۔ میں انھیں یہ باور نہیں کرا سکا کہ وہ ان باتوں کو نہیں جانتے جن کی جانکاری انھیں حاصل نہیں تھی۔ وہ بات بات پر دلیلیں پیش کرنے کے خواہاں تھے اور جب بھی کسی حقیقی واقعے کا مظاہرہ ان کے سامنے کیا گیا تو وہ اس سے بھی منکر ہی رہے۔میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند پڑا۔ میں نے کشتی کے دستانے انھیں دکھا کر خاموش کر دیا۔پھر ایک دن ان میں سے ایک کالی داڑھی والے نے کہا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ کشتی جانتا ہے؟اس نے کہا وہ اس کھیل کو اچھی طرح جانتا ہے۔پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اگر میں نے اس کی ناک پر چوٹ لگانے کا ارادہ کیا تو کیا وہ اپنی ناک کو بچا سکتا ہے؟جواب آیا کہ ہاں،وہ ایسا کرسکتا ہے۔میں نے کہا کہ چلو اپنی بات کو ثابت کرو!۔کشتی کے دستانے لائے گیے اور مجھے فوراً پتہ چلا کہ جو دعویٰ اُس نے کیا تھا وہ سراسر غلط تھا۔

میرے اس داؤ سے وہ اس قدر ہوش میں آچکا تھا کہ جب میں نے اس کھیل کو جاری رکھنا چاہا تو اس نے عاجزی سے کہا کہ وہ اپنی ناک نہیں بچا سکا کیونکہ اسے اس تکلیف دہ کھیل کا بالکل علم نہیں ہے۔

مجھے لگا کہ اس بار میری فتح ہوئی ہے کیونکہ اس کے بعد اگر کالی داڑھی والا کوئی بھی لڑکا مجھ سے حجت کرتا تو میں اس سے پوچھتا۔''کیا تم کشتی لڑ سکتے ہو؟''

روم ایک دن میں نہیں بنا۔یہ برہمن لڑکے بھی ایک ہی دن میں اپنی عزت کرنے کی خاطر پیدا نہیں ہوئے تھے۔جس بات کی سب سے پہلے ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ ان میں خودستائی

کے برعکس خود شناسی کا عنصر پیدا کیا جائے۔ باتوں سے یہ معاملہ طے نہیں ہوسکتا تھا بلکہ اس کے لیے عملی اقدام کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں کھیل کا ایک بنیادی حصہ بنتا تھا جس کی بدولت ان میں خود شناسی کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا اور وہ خود غرضی کے خول سے بھی باہر آ جاتے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ان لوگوں کو کس طرح اس پر عمل پیرا ہونے کی طرف مائل کیا جائے جو کھیلوں سے جان بچانا ہی دانائی سمجھتے تھے۔

اُن کا کہنا تھا کہ اگر انھوں نے فٹ بال کھیلا یا ناؤ چلانے میں حصہ لیا تو ان کے جسموں پر پٹھے ابھر آئیں گے اور پھر وہ نچلی ذات کے مانجی اور قلی کہلائیں گے۔ پھر یہ کہ اگر انھیں کھیلوں میں شرکت کے لیے دوڑ نا پڑے تو لوگ ان پر ہنسیں گے کیونکہ شریف لوگ دوڑ دھوپ میں یقین نہیں رکھتے۔

ہم نے بالآخر فٹ بال کا کھیل شروع کیا اور اس میں بھی کئی دقتیں آئیں جن پر دھیرے دھیرے قابو پالیا گیا۔

یہ 1891 کے موسم خزاں کی بات ہے کہ میں مسز ڈنڈیل ہسکو کے ساتھ بمبئی سے لوٹ آیا۔ ہمارے سامان میں ایک فٹ بال بھی تھا۔ جسے ہمارے اسکول کے لڑکوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ لڑکے مغرب کا یہ کھیل سیکھنے کے لیے بیتاب نظر آتے تھے۔ میں نے اسکول میں اس بال کی نمائش کی مگر افسوس! کہ اس نے ان میں کوئی جوش یا جذبہ پیدا نہیں کیا۔

انھوں نے مجھ سے سوال کیا: ''یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''فٹ بال''۔ ان کا دوسرا سوال یہ تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ یہ ایک شاندار کھیل ہے جسے کھیلنے سے انھیں جسمانی قوت حاصل ہوگی۔ وہ پوچھنے لگے: ''کیا اسے کھیلنے سے ہمیں کچھ پیسے ملیں گے؟'' ''نہیں''۔ ''چھوڑیے پھر ہم اسے نہیں کھیلیں گے۔ یہ کس چیز کا بنا ہے؟'' میں نے کہا کہ اسے چمڑے سے بنایا گیا ہے۔ اُن کا جواب تھا کہ پھر وہ ہرگز اس سے نہیں کھیلیں گے کیونکہ ان کے لیے چمڑے کو چھونا حرام ہے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ معاملہ میرے اندازے کے مطابق آگے نہیں بڑھا تھا۔

میں نے کہا: ''چلو ٹھیک ہے۔ پیسے تمھیں ملیں یا نہ ملیں، کھیل پاک ہے یا نجس، ہم بہر حال آج بعد دوپہر ساڑھے تین بجے فٹ بال کھیلیں گے۔ لہٰذا تم لوگ جلد از جلد اس کے قوائد سیکھ لو!'' پھر اس کے فوراً بعد بلیک بورڈ کی مدد سے میں نے انھیں میدان میں اپنی اپنی جگہ اور دیگر ضوابط کی تعلیم دی۔

اسکول کے اوقات کے بعد مجھے خدشہ تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوگی۔ لہٰذا میں نے اساتذہ کو بلا کر انھیں بھی ان باتوں سے آگاہ کیا۔ انھیں اپنے آپ کو چھڑیوں سے لیس کرنا تھا اور ان راستوں کی نگہبانی کرنی تھی جو اسکول سے میدان تک جاتے ہیں تا کہ کوئی لڑکا راستے ہی میں بھاگ نہ جائے۔ اب ہر بات طے ہو چکی تھی۔ تین بجے قلی کو ہدایت دی گئی کہ وہ اسکول کا دروازہ کھول دے۔ لڑکے سامنے آئے اور میں ان کے پیچھے پیچھے ایک چابک لے کر چلتا رہا۔ اسی وقت انھوں نے سوچا کہ وہ بھاگ سکتے ہیں لیکن یہ ان کا خیال خام تھا۔ ہم نے انھیں گویا بھیڑ بکریوں کی طرح قصائی کی طرف ہانکا۔ میں نے آج تک ان جیسے بزدل، بدبودار اور غلیظ نوجوان نہیں دیکھے ہیں۔ وہ سبھی لمبے لمبے چغوں میں ملبوس تھے جن کا میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں۔ وہ سب ان چغوں کے اندر کانگڑیاں لیے ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں زیادہ تیز دوڑنے پر مجبور نہیں کیا کیونکہ یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ کانگڑی سمیت گر پڑیں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کئی دنوں تک فٹ بال کھیلنے کے قابل نہیں رہ سکتے۔

آخر کار ہم کھیل کے میدان تک پہنچ ہی گئے اور ایک ہجوم ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میدان صاف ہے، اس کی ضروری صفائی کی گئی ہے اور بس اب کھیل شروع کروانے کے لیے سیٹی بجنے کا انتظار ہے۔

سیٹی بجائی گئی لیکن بال نہیں ہلی۔ میں نے سمجھا کہ لڑکوں نے سیٹی کا مطلب نہیں سمجھا ہے۔ میں نے انھیں پھر ہدایت کی کہ سیٹی سنتے ہی وہ بال کو لات ماریں۔ میں نے پھر سیٹی بجائی مگر بے سود۔ میں نے دیکھا کہ لڑکے ایک دوسرے کی جانب اور تماشہ بینوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کے چہروں پر ایک خوف اور ویرانی نمودار تھی۔

جب میں نے ان سے اس بے اعتنائی کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ وہ بال کو چھو نہیں سکتے کیونکہ بال نجس ہے اور یہ کہ وہ پاک برہمن ہیں۔ میں نے اپنی گھڑی کلائی سے اتار کر انھیں پانچ منٹ کا وقت دیا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ پانچ منٹ گزرنے پر میں نے کہا: ''دیکھو اگر بال اب بھی نہیں ہلی تو کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا''۔ لیکن وہ بُت بنے ایک ناشائستہ خاموشی کے ساتھ کھڑے رہے۔ جن اساتذہ کو لاٹھیاں لے کر تعینات کیا گیا تھا وہ ان کے پیچھے تیار کھڑے

تھے۔وقت اب ختم ہو رہا تھا۔صرف پانچ سیکنڈ باقی تھے۔بال وہیں پر جوں کی توں تھی۔اب میں نے اپنا آخری پتا کھیلا: ''تین، دو، ایک، اور بال کو ہلا دو!'' پھر میں دائیں بائیں دیکھ کے چلایا: ''لاٹھیاں''۔

اس دھمکی نے کام کیا کیونکہ جب لڑکوں نے لاٹھیاں گھومتی دیکھیں، بال خود بخود ہلنے لگی۔خاموشی کا وقفہ ختم ہوا۔پگڑی پہنے اساتذہ نے لڑکوں کی ٹانگوں، جوتوں اور لباس پر لاٹھیوں کی برسات کی۔انھوں نے جوتے میدان ہی میں چھوڑ دیے اور وہ ایک عالم اضطراب میں بال کو ادھر اُدھر گھماتے رہے۔یہ دیکھ کر تماشہ بینوں نے زبردست جوش وخروش کا اظہار کیا۔کیونکہ انھوں نے اپنی ہمسائیگی میں کبھی کسی برہمن کو ایسا فٹ بال کھیلتے نہیں دیکھا تھا جس میں وہ ایک دوسرے پر گر پڑتے اور ہاتھ اور پاؤں دونوں کو چمڑے کی بنی بال پکڑنے کے لیے استعمال کرتے نظر آرہے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ سب کچھ شور اور ہنگامے پر مشتمل تھا کہ یکا یک ماحول کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔کھیل بند ہو گیا۔برہمن کھلاڑی اور تماشہ بین سبھی دانتوں تلے انگلیاں دبانے لگے۔یہ ایک کشمیری کے لیے حیرانی کے اظہار کا طریقہ ہے۔ان سبھوں کی آنکھیں ایک ایسے لڑکے کی طرف مرکوز تھیں جو دکھ کی تصویر بنا ہوا تھا۔کیونکہ یہ ناپاک فٹ بال اس کے پاک چہرے سے بری طرح ٹکرایا تھا۔اس سے پہلے اس نے کبھی فٹ بال کی بو محسوس نہیں کی تھی۔نہ ہی اس نے ایسی مصیبت کا تصور کیا تھا۔اس نے سوچا کہ اس کے سبھی دانت اکھڑ چکے ہیں اور اس کی ناک بھی کٹ چکی ہے۔اس نے اپنی بگڑے ہوئے چہرے کو چھونے کی کوئی کوشش نہیں کی۔اس کا چہرہ مسخ ہوا تھا لہٰذا جو کچھ وہ کر سکتا تھا وہ نہیں کیا اور جو اسے کرنا تھا وہ نہیں کر سکا۔پھر اس نے خالص مقامی انداز میں اپنا چہرہ اوپر کی طرف کیا اور زور زور سے رونے لگا۔یہ صورت حال خاص کر میرے لیے خاصی پریشان کن تھی اور ہم سبھی اس کی تہہ تک جانے کے خیال میں مگن تھے۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟۔ایک ناپاک چہرے کو کس طرح پاک کر سکتا تھا؟ خوش قسمتی سے میرے ذہن میں پانی کا خیال آ گیا۔میں نے کہا ''اس بیوقوف کو نالے پر لے جا کر اسے اچھی طرح صاف کرو''۔میری ہدایت سنتے ہی سبھی کی توجہ صاف پانی کی طرف گئی جس کے معجزاتی اثر نے کام کر دکھایا۔ان کی واپسی پر میں نے پھر سیٹی بجائی اور لڑکوں نے پھر پورے شوق اور دلچسپی

کے ساتھ تب تک کھیل کھیلا جب میں نے کہا کہ وقت ختم ہو چکا ہے۔

ہر ایک میدان سے نکل کر شہر میں اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوا تا کہ وہ اپنے گھر والوں اور ہمسایوں کو اس تماشے کا حال بتائیں جو انھوں نے دیکھا تھا یا جس میں انھوں نے حصہ لیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے رات کو دال چاول کھاتے وقت میرے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہوگی وہ میرے حق میں نہیں بلکہ اُس کے برعکس ہی ہوگی۔

مجھ سے کئی بار کہا گیا کہ میں نے غیر عیسائیوں جیسا سلوک کیا۔ اور یہ کہ مجھے ان کی مرضی کے خلاف لڑکوں پر فٹ بال یا کوئی اور کھیل ٹھونسنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بہر حال، ہم ایک ہی طرح کی سوچ نہیں رکھ سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو روم ایک دن میں نہیں بن جاتا۔

اس کھیل کی بدولت سری نگر اور اس میں رہنے والے برہموں میں چمڑے کی بال متعارف ہوئی۔ اگرچہ پہلے سال ہر کھیل کے لیے میری موجودگی ضروری تھی لیکن فٹ بال کا کھیل بدستور قائم رہا۔

وادی کے ان تمام اسکولوں کی اپنی فٹ بال ٹیمیں ہیں اور شہر کے ہر علاقے میں آپ کو بچے فٹ بال اور دوسرے کھیل کھیلتے نظر آئیں گے۔

سالِ رواں میں مَیں نے ایک بین الجماعتی میچ دیکھا جسے نہایت ہی مقابلے کے جذبے کے ساتھ کھیلا گیا۔ اس میں ریفری کوئی اسکول ٹیچر نہیں بلکہ ایک طالب علم تھا۔ اس کا کوئی فیصلہ متنازعہ فیہ نہیں بنا۔ نہ ہی کھلاڑیوں کے مابین تو تو میں میں ہوئی۔ یہ واقعی ایک حقیقی کھیل تھا۔

اب ہم کھیلوں سے زیادہ ایک اور اہم بات کی جانب اپنا روئے سخن کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ کشمیر میں سماجی خدمات انجام دینے کے لیے بے شمار مواقع موجود ہیں۔ لہٰذا ہم نے سب سے پہلے گھروں کی آتش زنی کی وجہ سے مالکان کی جائدادوں کی بربادی کا مسئلہ ہاتھ میں لیا۔ جن دنوں کے بارے میں یہ تحریر قلم بند ہو رہی ہے اُن کے دوران ایک سال میں جتنے دن ہوتے ہیں، شہر میں آگ لگنے کی اُتنی ہی وارداتیں ہوئیں۔

آگ کی پہلی واردات کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کشمیر میں سماجی خدمات کو قلیوں اور مزدوروں کا کام سمجھا جاتا ہے۔ مشرق میں لڑکے اسکول سے چمٹے رہتے ہیں

جبکہ مغرب میں کھیلوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں والدین بھی اپنے لڑکوں کے کھیلوں کے خلاف تھے جسے وہ سراسر تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ ان کا مطمع نظر صرف یہی تھا کہ لڑکا اسکول جا کر امتحان میں کامیاب ہو جو ان کی نظروں میں تعلیم کا مدعا و مقصد تھا۔ کئی مقامی مدرس بھی یہی ذہن رکھتے تھے۔ وہ بھی کھیلوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ کھیل ان کے لیے محض ایک بے کار شغل تھا۔

یہ سب کچھ مجھے عجیب و غریب لگتا ہے کہ تعلیم کے ارباب حل و عقد نے ہندوستانیوں کے لیے مناسب نظامِ تعلیم وضع نہیں کیا ہے۔ اس نظام نے ایک ایسی خلیج پیدا کی ہے جس کی وجہ سے جسمانی مشقت کو برا سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ سبھی کی نظریں سرکاری نوکریوں کی طرف لگی ہیں جہاں آگے بڑھنے کے قلیل مواقع موجود ہیں۔ لہٰذا ملک ان نیم خواندہ بیزار لوگوں سے بھرا پڑا ہے جو اسی سرکار کے لیے مصیبت کا باعث بنے ہیں جس نے انھیں عملی طور پر بے سود مدرسے اور کالج دیے۔ میں یہ بدزیب نظارہ دیکھتا رہا ہوں جو لڑکوں اور ان کے والدین کو اچھا لگتا ہے۔ اس پس منظر میں مجھے ایک راستہ نظر آیا کہ لڑکوں کو سماجی خدمات کی طرف راغب کیا جائے۔ انھیں اپنے ملک اور شہریوں کے لیے اپنے فرائض سے آگاہ ہونا چاہیے۔ میں اب آتش زنی کی پہلی واردات کے بارے میں کہوں گا۔

ہم نے جب کھڑکیوں سے باہر دیکھا تو نظر آیا کہ لوگ جوق در جوق اُس طرف دوڑ رہے ہیں جہاں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایسے حادثوں کے دوران ہمسایوں کے نقصان سے فائدہ اٹھانے کے مواقع زیادہ نصیب ہوتے ہیں۔ ہم نے آتش زدہ مکان کی چھت پر ایک وردی پوش کو دیکھا جو اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے ڈھول بجا رہا تھا اور آس پاس کے تماشہ بین چیختے اور ساتھ ساتھ ناچتے بھی تھے۔ ان موقعوں پر یہ یہاں کا دستور ہے۔ تعلیم گاہوں کے اساتذہ چونکہ ایسے حادثات بار بار دیکھتے رہے ہیں لہٰذا ان کی نظروں میں ان کے ساتھ جذباتی لحاظ سے وابستہ ہونے کے برعکس پڑھائی میں مشغول رہنا زیادہ اہم ہے جو ان کے لیے ایک درجن آتش زدگیوں سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن ہم مغربی باشندے ایسے حادثات کے بارے میں ذرا مختلف انداز میں سوچتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خدا نے ہمیں طاقت اور دماغ دیا ہے۔ اور ایسے حالات میں جسمانی قوت کے استعمال کی ضرورت کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کتابوں کو ایک طرف رکھوا کر چھوٹی چھوٹی

لاٹھیوں کے استعمال کی ہدایت دیتے ہیں۔ ہم تیس یا چالیس افراد آتش زدہ مکان کا رخ کرتے ہیں۔ میں اس منظر کو کبھی نہیں بھول سکتا جو پھر میں نے وہاں دیکھا۔ اس سے میرے ذہن پر ایک مثبت اثر مرتب ہوا۔ ہمارے بالکل سامنے ایک گھر جل رہا تھا جس میں صرف خواتین موجود تھیں اور مرد گھر سے باہر تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اس جگہ ایک بوڑھی عورت جوش اور جذبات سے پاگلوں کی طرح ناچ رہی تھی اور چلا چلا کر فریاد کر رہی تھی کہ اس کی بچی کھچی جائداد کو بچایا جائے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ شہر میں کسی بھی مکان کا بیمہ نہیں کیا گیا ہے جس کے مارے آگ لگنے کا مطلب ساری متاع کو گنوانا ہے۔ وہاں پگڑیاں باندھے لوگ ہر طرف موجود تھے جن میں سے اکثر اس حادثے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کے ردعمل میں تماشہ بین اپنی آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کیے آگ کی حدت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے ہوئے تھے۔

عورت انھیں مدد کے لیے آگے آنے کی مسلسل التجا کر رہی تھی۔ اپنی فریاد کو زیادہ پُر اثر بنانے کی غرض سے اس نے گردن میں پہنے زیور کے دو حصے کر کے انھیں دور پھینکا لیکن یہ گونگے بہرے تماشائی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ بس اسے دیکھتے رہے۔ پھر اس حواس باختہ عورت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچے اور ان کی دو لٹیں ڈرامائی انداز میں لوگوں کو دکھائیں تاکہ اب وہ اس پر رحم کھا کر اس کی مدد کو آئیں لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پھر عورت نے ان سے کہا کہ وہ ہر اُس برتن کے لیے انھیں پیسے دے گی جسے وہ بحفاظت آگ سے بچا کر باہر نکالیں۔ اس سے ان بے حس تماشہ بینوں میں حرکت سی پیدا ہوئی اور انھوں نے پوچھا: ''تم ہمیں کتنا دے سکتی ہو؟'' اس نے جواباً کہا

''بہت کچھ''۔ اس کے باوجود وہ بس اپنے ہی حال میں مگن رہے۔ عورت پھر چلائی، ناچتی رہی اور چیختی رہی اور ساتھ ہی اس نے کہا کہ وہ آگ بجھانے کے لیے پانی کے ایک برتن کے عوض رقم دُگنی کرے گی۔ اس پیش کش نے ان کے ضمیر کو کسی حد تک جگایا۔ وہ وہاں سے بکھر گئے۔ غالباً وہ برتن حاصل کرنے اور پیسہ کمانے کے لیے چل پڑے تھے۔

یہ سب کچھ اُس دورانیہ سے کم وقت میں ہوا جتنی دیر مجھے اسے قلم بند کرنے میں لگی۔

میں دیکھتا رہا کہ آگ کی حرارت بڑھ رہی ہے، شعلے بلند ہو رہے ہیں، عورتیں واویلا کر

رہی ہیں، لوگوں کا ہجوم خوشی سے پھولے نہیں سما رہا ہے۔ میں برابر یہی سوچتا رہا کہ کس طرح برتن حاصل کر کے قریبی نالے سے پانی لایا جائے جو جلتی ہوئی عمارت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم نے برتنوں سے لدے ایک ڈونگے کو دریا کی اوپری سمت کی طرف چلتے دیکھا۔ میں نے لڑکوں کے ہاتھ میں چند سکے تھما دیے تا کہ وہ ڈونگے والے سے برتن خرید سکیں لیکن وہ خالی ہاتھ لوٹ کر کہنے لگے کہ مانجھی برتن بیچنے سے انکاری ہے۔ غالباً وہ ان کی قیمت بڑھانے کا بہانہ کر رہا تھا لیکن ہماری تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ ڈونگا کنارے لگا تھا اور اسی موقعے کا فائدہ اٹھا کر ہم اس پر ٹوٹ پڑے اور اتنے ڈھیر سارے برتن چھین لیے جتنوں کی ہمیں ضرورت تھی۔ ڈونگے والے نے اپنے غصے کا اظہار ہر قسم کی مغلظات کے استعمال سے کیا۔ اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ وہ شہر میں سارے اکابرین کے سامنے ہماری شکایت کرے گا۔ ہم نے اس سے کہا کہ وہ بالکل صحیح کہتا ہے لیکن اس وقت ہمیں اس کے برتنوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ ہم نے دریا کے کنارے سے چلتے ہوئے گھر کی جانب ایک قطار بنائی اور برتنوں میں پانی بھر بھر کر آگ بجھانے لگے۔

لڑکے اپنے کام میں مصروف تھے اور میں نے تماشہ بینوں کی طرف رخ کر کے ان سے کہا کہ وہ بھی لڑکوں کا ہاتھ بٹائیں مگر یہ ہجوم ہمیں بس دیکھتا ہی رہا۔ وہ بے حد خوش تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ ان میں جو برہمن موجود تھے انھوں نے بھی ہمارے لڑکوں سے کہا کہ وہ یہ کام فوراً چھوڑ دیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے رتبے کو زک پہنچا کر برہمن ذات کی توہین کر رہے ہیں۔ البتہ میں نے اس سارے مجمعے میں گورکھا رجمنٹ کے ایک ہندو افسر کو دیکھا جس نے اپنے پیچھے آنے والے سپاہیوں کو بھی بلایا اور کہا: ''میں اسی کو عیسائیت کہتا ہوں''۔ اس نے پھر لڑکوں کی پیٹھ تھپتھپا کر انھیں شاباشی دی۔

برہمن تماشائیوں کے کہنے پر کچھ لڑکے تو تذبذب میں پڑ کر بتوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور وہ بھی وہی تھے جو نام نہاد مرتبے کو انسانیت سے افضل سمجھتے تھے۔ میں چونکہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا اور وہ بھی اسی دوران کھسک کر آتش زنی کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ بالآخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے کئی اساتذہ کو اکٹھا کر کے انھیں بھی قطار میں کھڑا کر کے ان سے کہا کہ

وہ برتنوں کو آگ بجھانے کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ میں نے چند لڑکوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں دیں تاکہ وہ دوسروں پر نظر رکھیں۔ خوش قسمتی سے میرے یہاں دو بنگالی، دو پارسی عیسائی اور ہز ہائی نیس کی فوج کے ایک ملازم کا بیٹا بھی تھا جو کشمیریوں کے لیے مختلف الخیال لوگ تھے لیکن انھوں نے اپنے مرتبے کا پورا لحاظ کر کے برتنوں کو جائے واردات تک پہنچانے میں اچھا خاصا حصہ ادا کیا۔ کچھ دیر کے بعد شہر کا گورنر چند افسروں اور ایک چھوٹے دستی پمپ کے ساتھ وارد ہوا۔ وہ ہمیں یہ کام کرتے دیکھ کر ہنسنے لگے لیکن انھوں نے ہمارا حوصلہ بھی بڑھایا جس سے لڑکوں کا کام گویا آسان بن گیا۔ ہمارا ایک فریضہ یہ تھا کہ ہم اس جائداد کو بچائیں جسے سر رابرٹ ریل کے نام نہاد رشتہ دار لوٹنے اور اسے ایک نزدیکی خالی ڈونگے میں ڈالنے کے لیے آئے تھے۔ وہ اس ناؤ میں بھی منقولہ اشیا چرا کر اور اسے کسی محفوظ جگہ تک پہنچانے کی کوشش میں لگے تھے۔

اس دنیا میں ہر چیز بہر حال اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ یہ آگ بھی رفتہ رفتہ بجھنے لگی۔ وہ عورت اور لوگ بھی ناچ ناچ کر چور ہوئے تھے۔ اب وہ بیٹھ کر راکھ کی طرف دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے۔ ہمارے لڑکے جو پانی سے بھیگ چکے تھے آخر کار گھروں کو لوٹے جہاں انھوں نے گھر والوں کے سامنے اپنی بہادری کے اس کارنامے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہوگا اور بدلے میں والدین کی لمبی چوڑی تقریریں سنی ہوں گی جن میں انھیں یہ جھاڑ ملی ہوگی کہ انھوں نے کس طرح اپنے خاندانوں اور عزت دار برہمن ذات کی تحقیر کی ہے۔ بہر حال اُس دن ان کے ذہنوں میں وہ بیج بوئے گئے تھے جو جماعتوں اور کتابوں میں نہیں ملتے ہیں۔ اس درس و تدریس کے باوجود بھی وہ یہ بات دل میں نہیں بٹھا سکے تھے کہ خدا کے تئیں فرض اور ہمسایوں کی خبر گیری کس طرح کرنی چاہیے جو منہ اور کان سے نہیں سکھائی جا سکتی۔ عقیدے کو عمل سے ظاہر کیا جانا چاہیے۔ ہمارا یہی کام ہونا چاہیے کہ ہم لڑکوں کو وہ سبق سکھائیں جس سے خدا نے ان کو صحیح انسان بننے کے لیے اس دنیا میں لایا ہے۔

میں نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے کیونکہ یہ اس خوبصورت مگر گندے شہر کے ایسے واقعات میں شامل ہے جنھوں نے تاریخ بنائی ہے۔ سماجی خدمت کے لیے اسکول ایک دن بند رکھنا میرے لیے باعث مسرت تھا۔ کیونکہ میں نے ساتویں دہائی میں خود اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ایک فارم ہاؤس میں آگ بجھانے کی خاطر اسی طرح بالٹیوں میں پانی لے جا کر تب تک یہ

کام انجام دیتا رہا جب تک کہ دس میل کی دوری سے آگ بجھانے کا انجن نہیں پہنچا۔ ہم نے اسکول میں گھنٹی سنی کہ ہم اس سماجی خدمت کو ہاتھ میں لیں۔ جب انجن آ گیا، ہم واپس اسکول پہنچے جہاں اساتذہ نے ہماری پٹائی کی پھر بھی ہم مایوس نہیں ہوئے۔ اُس دن سے لے کر آج تک میں نے اساتذہ کی طرف سے اس سزا کو ایک غلط اقدام تصور کیا ہے۔

ہمیں، جو اس ملک میں رہتے ہیں، ایسے مواقع حاصل ہیں کہ ہم اپنے ساتھیوں کے خون میں حرارت بھر کے ان کا ضمیر کو جگا کر سماجی خدمت کی طرف مائل کریں۔ اس کی طرف خدا ان سبھی کی توجہ پھیرتا ہے جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے گئے ہیں۔ جو لوگ عیسائی ممالک میں رہتے ہیں ان کے پاس ایسے مواقع نہیں ہیں جو غیر عیسائی ملکوں کے باشندوں کو حاصل ہیں۔ عیسائی ممالک میں مظلوموں کے ساتھ فوری طور پر ہمدردی کا عنصر جاگ اٹھتا ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ یک جہتی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ خواہ کچھ بھی کہیں، یہ جذبہ عیسیٰ اور صرف عیسیٰ کی روح سے پیدا ہوا ہے۔

میں یہ بات یونہی نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس سر زمین پر قدم رکھنے سے پہلے میں لندن کے ایسٹ اینڈ میں غریبوں کے لیے جان توڑ خدمت کرتا رہا جس میں میری رہنمائی پادری اے۔ جے۔ رابنسن نے کی۔ کیا شاندار دن تھے وہ جن کی طرف میں آج بھی بار بار شکرانے کے ساتھ نظریں اٹھاتا ہوں۔ اس وقت میں نے پچھڑے ہوئے طبقے کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ ان کی نکبت کے باوجود میں نے ان کے دلوں میں زندگی کا جذبہ موجزن دیکھا۔ جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ امید کا دامن کسی بھی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اگر چہ ان میں سے کئی ایک خدا کے وجود سے منکر تھے لیکن اُن میں وہ احساس موجود تھا جو بذاتِ خود خدا کی طرف سے ہی نازل ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس عیسائی ملک میں خدمات کی بہت گنجائش تھی لیکن وہ اُس قدر محتاج نہیں تھے جیسا کہ میں نے یہاں دیکھا۔ مثال کے طور پر مغرب میں ایک غریب شخص ہی کسی امیر یا طاقتور شخص پر ڈاکہ ڈالے گا۔ لیکن مشرق میں دولت مند ہی بے کسوں کو لوٹتے ہیں۔ اس کے باوجود جو خاموشی ہمیں یہاں دیکھنے کو ملتی ہے اس سے گمان ہوتا ہے جیسے کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔

اس حقیقت سے میں اُس وقت پوری طرح واقف ہوا جب میں نے سری نگر کے

باسیوں کی رسموں اور رواجوں کا مطالعہ کیا۔ مثلاً موسم سرما میں جب راستے برف پوش ہوتے ہیں اور سڑکوں پر صرف ایک فردِ واحد کے چلنے کی گنجائش ہوتی ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ مرد وزن اور بچے بھی راستوں پر نکل کر برف کو ہٹانے میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح سال در سال کشمیری عورتیں مٹی کے برتن سروں پر اٹھا اٹھا کر پھسلن والے گھاٹوں پر کام میں لگی ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب لوگ اپنی مقدس درگاہوں کی طرف زیارت کے لیے رخ کرتے ہیں تو یہی عورتیں پیتل کے برتن اور بستر اٹھائے مشکل راستوں کا سفر طے کرتی ہیں۔ مرد آگے آگے چلتے ہوئے بار بار پیچھے کی طرف اپنی عورتوں کی طرف دیکھ کر انھیں جلد جلد قدم اٹھانے کو کہتے ہیں۔ اس قسم کا غیر انسانی طرز کار روز دیکھنے میں آتا ہے مگر اسے یہاں بالکل صحیح تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مشرق کی رسم ہے۔ یہاں میرے کچھ عرصے تک رہنے کے بعد ہی مجھے چند ایسی بری باتوں کا پتہ چلا جو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہی ہیں۔ ان میں بچوں کی شادی اور کئی بدعتیں شامل ہیں جن سے بے چاری عورتیں مصائب میں مبتلا کی جاتی ہیں۔ یہ سبھی اعمالِ بد عورتوں کی طرف سے عورتوں کو بہترین صلاح دیے جانے سے ہی دور کی جا سکتی ہیں اور یہ کام صرف مغرب سے آئی ہوئی خواتین ہی کر سکتی ہیں۔ یہ خواتین اپنی مشرقی ہم جنسوں کی بد حالی میں ان کی ہمدرد ہیں، جس کے لیے وہ اپنی زندگیاں بھی وقف کرتی ہیں خواہ اس کے لیے انھیں کتنی ہی تکالیف برداشت کیوں نہ کرنی پڑیں۔

فٹ نوٹ:

(1) کشمیری میں پنڈت پڑھے لکھے شخص کو کہتے ہیں۔ یہ اسمِ صفت عام طور پر کشمیری برہموں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جنھیں کشمیری زبان میں بٹہ کہا جاتا ہے۔

تیسواں باب

کشمیر مشن اسکول (3)

اس ملک میں قیام پذیر ہونے کے بعد مجھے یہ بات جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ ہمارے لڑکوں کو بداخلاق آوارہ گردوں سے کتنا خطرہ ہے۔ میرے پاس شہر کا ایک نقشہ تھا جس پر میں نے سرخ روشنائی سے ان جگہوں پر نشان لگایا جہاں یہ لفنگے چھپے ہوئے تھے۔

یہ نقشے ہم نے ہر اسکول میں لڑکوں کی واقفیت کے لیے لگائے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ تھا کہ ان بدمعاشوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ ہمیں اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک دن بعد دوپہر جب لڑکے شہر کے مضافات میں فٹ بال کے میدان سے باہر آرہے تھے تو ان بدمعاشوں کی ایک جماعت لڑکوں کو لے جانے کے لیے نمودار ہوئی۔ خوش قسمتی سے چند اساتذہ قریب ہی تھے جو انھیں بچانے کے لیے دوڑ پڑے۔ اس دوران ہاتھا پائی میں بدمعاشوں کے سرغنہ کو نیچے گرایا گیا۔ اس کی جیب سے ایک کتاب برآمد ہوئی جس میں کلب کی اطلاعات درج تھیں۔ اس میں صدر، سیکریٹری، خزانچی اور کمیٹی کے ممبران کے نام درج تھے۔ ان کے ساتھ 170 لڑکوں کے نام مع ان کے گھروں اور جماعت کے لیے کارآمد معلومات درج تھیں۔ یہ

کتاب ہمارے لیے مفید ثابت ہوئی کیونکہ ہم نے اسی کی مدد سے ملزموں کو سزا دلوانے کی سہولت حاصل کی۔ لیکن یہ سلسلہ ہمارے اندازے سے کہیں طویل اور مشکل ثابت ہوا کیونکہ ہمیں پتہ چلا کہ اس گروہ کی حمایت کچھ طاقتور عناصر کر رہے ہیں۔

میں جب دوسرے دن اسکول پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ گروہ کا سرغنہ جیل میں ہے جسے اساتذہ نے پولیس کے حوالے کیا تھا۔ میں فوراً قیدی کا منہ دیکھنے اور اس کا حال معلوم کرنے تھانے میں پہنچ گیا۔ مگر میری حیرانی کی کوئی حد ہی نہ رہی جب مجھے بتایا گیا کہ قیدی رات کی تاریکی میں بھاگ چکا ہے اور سپاہی اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہم نے اس بدمعاش کو پکڑنے کی ٹھان لی۔ جیسا کہ اب واضح ہو چکا تھا کہ پولیس ہماری مدد کرنے پر تیار نہیں تھی۔ اس کے تین مہینے بعد اسے پکڑا گیا اور پھر پولیس کے سپرد کیا۔ چونکہ شام کا وقت تھا اور میرے ساتھیوں کو یقین تھا کہ پولیس اسے دوسری بار بھاگنے نہیں دے گی۔ مجھے اس گرفتاری کی خبر اگلے دن دی گئی جب میں اسکول میں پہنچا۔ میں پھر تھانے کی طرف روانہ ہوا جہاں مجھے بتایا گیا کہ ملزم پھر اندھیرے میں بھاگ گیا ہے۔ مجھے اس خبر سے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری کیونکہ انسان اگر ہمت کرے تو وہ اپنی مراد پا سکتا ہے۔ پھر دو ماہ بعد یہ بدمعاش میرے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس وقت بھی اندھیرا تھا جب اسے پولیس کی تحویل میں دیا گیا۔

میں تیسری مرتبہ تھانے پہنچا اور مجھے کہا گیا کہ ملزم قانون کے رکھوالوں کے ہاتھ سے پھسل کر نکل چکا ہے۔ میں نے پولیس افسر سے کہا کہ میں جرم کے لیے تیسری بار معاف نہیں کرتا اور یہ کہ مجھے کشمیریوں اور خاص کر پولیس کی حرکات کا پورا علم ہے۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔ میں نے اسے صرف دو گھنٹوں کا وقت دیا تاکہ وہ ملزم کو پکڑ لے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بارہ بجے پھر آؤں گا اور قیدی اس کے تھانے میں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اسے برطانوی ریذیڈنٹ کے پاس لے جاؤں گا۔ یہ میرا آخری پتا تھا جسے میں کھیلنا چاہتا تھا تاکہ برطانوی افسروں کو بار بار ہراساں نہ کیا جائے۔ پولیس افسر نے کہا کہ میں ایک ناممکن بات کر رہا ہوں۔ میں پورے بارہ بجے وہاں پہنچا اور افسر نے کہا کہ وہ اپنے کام میں کامیاب ہوا ہے اور قیدی تھانے کے اندر موجود ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ قیدی کو کس جرم میں نظر بند کیا گیا ہے؟ اس نے

جواب دیا کہ اسے ایک میز کا کپڑا چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے جس پر مجھے ہنسی آ گئی۔ بہر حال اس الزام نے کوئی اثر نہیں دکھایا البتہ ہمیں اطمینان ہوا کہ اب ہم اسے عدالت میں اصلی جرم کی شکل میں پیش کریں گے۔

میں اس معاملے کو مزید طول نہیں دوں گا۔ اگر چہ میں ان باتوں کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں کیونکہ اس کے بعد بھی ایسے ہی تفریحی اور مزاحیہ واقعات پیش آئے۔ بہر حال آخر میں کہنا چاہتا ہوں کہ مجرم کو دو سال قید سخت کی سزا ہوئی جبکہ جج نے کہا کہ اسے سات سال کی قید ہونی چاہیے تھی۔ اس کے ساتھیوں کو قدرے کم سزا سنائی گئی۔

جب اس قیدی کی سزا کی مدت ختم ہوئی وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے معافی کا طلبگار ہوا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ میرا اس لیے بھی شکر گزار ہے کہ میں نے اسے جیل بھجوا دیا۔ اس نے میرا نوکر بننے کی بھی التجا کی اور اس بات کا اعتراف کیا کہ اسے جیل ہی میں معلوم ہوا کہ وہ کس طرح ایک حیوان بن چکا تھا۔

اپنی بات کو ثابت کرنے کی خاطر وہ ہمارے ساتھ اس بدعت کے خلاف لڑنے میں ہمارے ساتھ رہا ہے۔ اس کی واقفیت اور مدد بہت کار آمد ثابت ہوئی ہے۔ اسے ان بدمعاشوں کے ہاتھوں سخت تکلیف اٹھانی پڑی ہے جو اس کے سابقہ دوست اور ایک غلیظ طرز زندگی میں اس کے حامی تھے۔ اس طرح کی سماجی اصلاح کے لیے ہندوستانی باشندوں کو چاہیے کہ اسکول کے امتحانات سے زیادہ ایسی ہی عملی تربیت مفید ثابت ہوتی ہے اور یہ کہ خود حفاظتی کا اچھا فن سیکھنا بھی بہت ضروری ہے۔

مجھے یہ کہہ کر خوشی ہو رہی ہے کہ اس حوالے سے شہر میں معاملات بہتر ہوئے ہیں اور اب پہلے کی طرح چھپنے کی جگہوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس بتدریج ارتقا میں لڑکوں کی پیش قدمی قابل ستائش تھی۔ پہلے تو کوئی لڑکا دستانے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا اور وہ خوش تھے کیونکہ برہمن چمڑے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ لیکن میں نے ایک دن ایک کالی داڑھی والے برہمن کو اپنی کتابیں چمڑے کے ایک تھیلے میں اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے حیرانی سے اس سے پوچھا: ''تم اپنی کتابیں چمڑے کی تھیلی میں اٹھا رہے ہو؟ میرا خیال تھا کہ تم چمڑے کے دستانے استعمال نہیں کر سکو گے کیونکہ وہ بھی چمڑے کے بنے تھے؟'' اس نے جواب

دیا: ''ہاں صاحب! یہ صحیح ہے۔ لیکن دیکھئے یہ کتابوں کا چمڑہ ہے اور وہ دستانے کا چمڑہ تھا۔ اس کے بعد ہم نے چمڑے کے دستانے پہننا شروع کیا اور اس میں پہل اسی کالی داڑھی والے نے کی۔

پہلے پہلے تو لڑکے یہ دستانے پہنتے وقت رونے لگے۔ دستانوں کو زمین پر پھینکا گیا اور ایک لڑکا تیز تیز بھاگنے لگا۔ جب دستانہ اس کی ناک پر لگ گیا، کشتی رک گئی اور تماشہ بینوں نے ''ارے ارے'' کہہ کر اپنی کوفت کا اظہار کیا۔ لڑکا جس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا صرف رو رہا تھا اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ اپنے ہی خون کو بھی چھو نہیں سکتا تھا۔ بہر حال اس کی ناک پر سرد پانی چھڑکا گیا اور اسے راحت ملی۔ یہ لڑکے عام طور پر غصے ہوتے ہیں، زور زور سے چلاتے ہیں اور اسی اضطراب میں ایک دوسرے کے چہرے کو نوچتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اب انھیں پتہ چلا تھا کہ وہ کس طرح اپنے حریف کو زخمی کر سکتے ہیں۔ اب ان کا یہ گویا دستور ہی بن گیا کہ وہ جتنا خون دوسروں کا بہاتے تھے اتنا ہی وہ اسے اور مضروب کرنا چاہتے تھے۔ وہ حریف کو زمین بوس کرنے کے داؤ کھیلتے۔ اس کی چھاتی پر سوار ہو کر اس کے سر پر مکے مارتے اور دیکھنے والوں کا ہجوم جیتنے والے کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر چلاتے: ''مارو! اور زور سے اسے مارو!'' ''اسے مت چھوڑو'' اور ''اسے ختم کرو''۔

تیسرا مرحلہ طے کرنے میں کچھ وقت لگا۔ اب لڑکے میچ کھیلتے ہیں اور لوگ کسی غیر معروف کھلاڑی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے البتہ غریب کھلاڑیوں کی ہمت باندھتے ہیں اور اچھے میچ کے منتظر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کھلاڑی غلط داؤ چلتا ہے تو وہ اس پر آوازے کستے ہیں اور اسے تنبیہ کرتے ہیں۔ میری نظروں میں مکے بازی کھلاڑیوں میں کھیل کا وہ جذبہ ابھارنے میں ممد ثابت ہوتی ہے جس کی ہر ملک اور خاص کر کشمیر جیسے خوبصورت خطے کو ضرورت ہے جہاں خود آگاہی کا عنصر کم ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ مکے بازی حیوانیت کے برعکس بہادری اور ناجائز فائدے کے بدلے جائز فائدہ بخشتا ہے۔

شہر میں سماجی خدمات کے سلسلے میں مکے بازی سے جو خصوصیات حاصل ہوئی ہیں وہ مظلوموں کے حق میں حوصلہ افزا ثابت ہوئی ہیں۔ جن میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں جن کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک زخمی حیوان اسکول کے میدان میں محرابی دروازے سے اندر داخل ہوا ہے۔ اُس کا سر واقعی کسی گدھے کا سر تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ایک گدھا کس طرح اتنا بڑا ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے کان محراب کو چھوتے تھے۔ جب وہ نزدیک آ گیا تو میں نے دیکھا کہ دراصل ایک آدمی گدھے کو اٹھائے ہوئے تھا۔ گدھے کی چاروں ٹانگیں آدمی کے کندھوں سے دائیں بائیں لٹک رہی تھیں۔ دریں اثنا میرا ہیڈ ماسٹر آ گیا جس کے ساتھ سارا اسکول پیار کرتا تھا۔ شہر کے لوگ تقاضائے وقت کے مطابق اس کی عزت کرتے یا اس سے خوف بھی کھاتے۔ اس نے جب ایک آدمی کو گدھے کو اپنے اوپر سوار دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ گدھا چونکہ مریل اور چھوٹا تھا لہٰذا ہیڈ ماسٹر نے اس حرکت کو صحیح سمجھا۔ میں یہاں وضاحت کر دوں کہ ایک گدھے کو ہندو لوگ نجس مانتے ہیں۔ مگر ایک برہمن کے مشن اسکول میں تعلیم یافتہ ہونے سے اس کی انسانیت کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے بھی حیوانوں کے ساتھ عملی طور پر حسن سلوک کرنے کی تعلیم دی خواہ وہ ایک ناپاک گدھا ہی کیوں نہ ہو۔ اس شہر میں گدھوں کی ایسی حالت کوئی عجیب بات نہیں۔ یہاں یہ رواج ہی ہے کہ ان کے بالغ ہونے سے پہلے ہی ان پر بوجھ لادا جاتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے ہر گدھے کی ٹانگیں ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ ان کی کمر زخموں سے بھری ہوتی ہے۔ ان کے جسموں پر ہر اس جگہ ایسے ہی زخم ہوتے ہیں جہاں رسیاں ان کی کھال کو رگڑتی رہتی ہیں۔ کسی انسان کو ان کا فکر نہیں کیونکہ وہ خود گدھے نہیں ہیں۔

کشمیر میں جب شدید سردیاں سر پر آ جاتی ہیں تو شہر اور دیہاتوں میں گدھوں کو آوارہ کتوں کے ساتھ خود خوراک کی تلاش کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گاؤں سے حیوانوں کے مالک انھیں شہر کی طرف ہانکتے ہیں کیونکہ شہر میں دیہاتوں کے برعکس زیادہ غلاظت موجود ہوتی ہے۔ ان مالکوں نے مجھے بتایا کہ وہ موسم سرما میں ان کی شکم پری کیوں کریں جبکہ ان کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا لہٰذا ان بھوکے حیوانوں کی طرف دیکھ کر انسان خوف زدہ ہو جاتا ہے جو سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے برف میں بھی کسی گندی چیز کی تلاش میں ناک رگڑتے نظر آتے ہیں۔

لڑکوں سے جب کہا گیا کہ وہ ان حیوانوں کو اسکول میں لا سکتے ہیں تو انھوں نے شوق سے یہ کام انجام دینے کا بیڑا اٹھایا۔ مسلم اور ہندو دونوں اکٹھے ہو گئے اور سڑکوں سے انھیں لانے کی

شروعات کیں۔ ہندو چونکہ رواج کے مطابق نجس گدھوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتے لہٰذا انھوں نے اپنی پگڑیوں کو رسیاں بنا کر انھیں گدھوں کی گردنوں میں ڈال دیا اور انھیں اسکول کی طرف کھینچنے لگے۔ مسلم لڑکے جو ان حیوانوں کو چھو نہیں سکتے پیچھے سے دھکا دینے لگے۔ اس طرح سے اسکول کا میدان سردیوں میں گدھوں کی پناہ گاہ بن گیا۔

عملے کے اراکین اور طلبا انھیں کھلانے کے لیے ہر روز کھانا لے کر آتے تھے۔ جاڑے کے اس موسم میں ہمارے ان مہمانوں کی تعداد ایک سو تک پہنچ گئی۔ جب بہار آئی تو ان کے مالک انھیں لینے آگئے لیکن ہم نے گدھے واپس کرنے سے انکار کیا جب تک کہ وہ ان کو پناہ دینے اور انھیں کھلانے پلانے کے عوض ایک دن کے لیے دو دو آنے ادا نہ کریں۔ اس پر انھوں نے اعتراض کیا لیکن حیوان چونکہ ہمارے قبضے میں تھے جو قانون کی رو سے دس میں سے نو کی حد تک صحیح قبضہ مانا جاتا ہے، ہم اپنے موقف پر قائم رہے۔ جب انھوں نے ہمارے خلاف قانونی کارروائی کرنے کی دھمکی دی تو ہم نے ان سے کہا کہ بے شک ایسا کریں کیونکہ ہم حیوانوں پر انسانی ظلم کے خلاف عمل کرنے کی پاداش میں جیل جانے کو تیار تھے۔

اس کے بعد سرکار نے حیوانوں پر ظلم ڈھانے کے خلاف ایک قانون پاس کیا اور ایک انسپکٹر کو اس پر عمل آوری کے لیے مقرر کیا۔ گزشتہ ایک دو سال میں یہ قانون مکمل طور پر نافذ العمل ہو چکا ہے۔ اب ہمارے طلبا کو جاڑے میں کسی گدھے کے لیے کھانے کا انتظام نہیں کرنا پڑتا۔ ہم نے صرف کوئی نصف درجن شکایات حکام کے پاس درج کیں جن میں حیوانوں پر مظالم ڈھانے کا ذکر کیا گیا تھا۔ اب یہ قانون نہ صرف سری نگر بلکہ جہلم ویلی روڈ پر بھی نافذ ہے جہاں سرکاری انجینئر مسٹر ڈبلیو۔ پی۔ اینل فورڈ اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ حیوانوں پر زور زبردستی تو نہیں کی جارہی ہے؟

اہلِ مشرق کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کرنا ذرا مشکل ہے کہ وہ کیوں حیوانوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرتے ہیں؟۔ میں نے ایک شخص کو شاہراہ پر دیکھا جو ایک ایسے چھوٹے ٹٹو پر سوار تھا جس کی اگلی ٹانگ کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ چکی تھی۔ اُس کی ٹانگ کا اوپری حصہ اس کی کھال سے باہر نکلا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا اور نچلا حصہ لڑکھڑا رہا تھا۔ یہ ٹٹو سوار ظاہری طور پر خوش تھا کیونکہ وہ اس دوران سیٹیاں بجا رہا تھا۔ مجھے اس بات کا واقعی دکھ ہے کہ اس دلدوز منظر کو دیکھنے

والے ہزاروں لوگوں میں سے کسی نے اس حیوانی حرکت پر انگلی نہیں اٹھائی اور نہ ہی اس ظالم شخص کو حیوان کی پیٹھ سے نیچے پھینک دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ اشخاص ذرا مختلف الخیال ہوتے ہیں لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی ناخواندہ لوگوں کی طرح بدتر مخلوق ہیں۔ میری نظروں میں کہیں پر کوئی غلطی موجود ہے اور اسے دور کرنا اُن کا فرض بن جاتا ہے جو چاہتے ہیں انھیں دور کیا جائے اور ان کے بجائے بہتر سلوک متعارف ہو۔

کشمیر دریاؤں، جھیلوں اور ندی نالوں کی سرزمین ہے جہاں سماجی خدمات کے گوناگوں مواقع موجود ہیں۔ اہل کشمیر مشاق تیراک نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ تیرنے کے دوران ان میں سے کئی ایک پانی میں ڈوب جائیں گے پھر بھی ہم نے انھیں تیراکی سکھانے میں کوئی لیت ولعل نہیں کی۔

اس پس منظر میں کئی نادیدہ مشکلات نے ہمیں گھیر لیا۔ والدین نے اپنے بچوں کو تیرنے سے سخت منع کیا تھا۔ برہمن طلبا کے والدین کہتے تھے کہ ان کے بیٹے ذی عزت شہری ہیں اور وہ اپنے آپ کو ذلیل نہیں کرنا چاہتے۔ اس رکاوٹ پر قابو پانے کے لیے میں نے یہ قانون نافذ کیا کہ ہر طالب علم کے لیے تیرہ سال کی عمر میں پانی میں تیرنا سیکھنا لازمی ہوگا۔ ایسا صرف اسی صورت میں نہیں ہوگا جب مشن ہسپتال کا کوئی ڈاکٹر یہ تصدیق کرے کہ لڑکا جسمانی لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ والدین ہندوستانی ڈاکٹروں کو غلط رائے دینے کے لیے انھیں راغب کریں گے یا اسکول کی زیادہ فیس ادا کریں گے جو طالب علم کے چودہ سال کی عمر تک پہنچنے پر فیس کا چوتھائی اضافی حصہ ہوگا۔ پندرہ سال کے لیے نصف رقم کی مزید ادائیگی کی جائے گی۔ سولہ سال کے لیے فیس دوگنی ہوگی اور سترہ برس کے لڑکے کے لیے چوگنی فیس کی ادائیگی ہوگی۔ اس فیصلے کا یہ خاطر خواہ نتیجہ نکلا کہ اضافی فیس دینے کے برعکس ہر طالب علم تیراک بن گیا۔ اس طرح ہم ہر سال دو سو لڑکوں کو تیرنا سکھاتے ہیں جن میں سے ایک سو ساڑھے تین میل تک جھیل ڈل میں، بیس کے قریب ولر جھیل میں چار پانچ میل تک اور چند ایک سات میل تک تیر سکتے ہیں۔

اس کے نتائج ہماری امیدوں سے کہیں بڑھ کر نکلے۔ جو لڑکے ہر سال ڈوبنے والے طلبا کو بچاتے ہیں ان کی تعداد اب بیس تک پہنچی ہے۔ ان میں سے کچھ واقعات کے لیے زبردست چستی

اور سرعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس سے مدارس میں سرگرمیوں کو بڑھاوا ملا ہے اور دوسرے اسکول ہماری مثال کی تقلید کر رہے ہیں۔ تیراکی کا گر سیکھنے کا سلسلہ زور و شور سے جاری ہے اور اب شہر کے لوگوں نے بھی مان لیا ہے کہ شریف زادے اپنا مرتبہ کھوئے بغیر تیراکی سیکھ سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک وزیرِ اعلیٰ کا بیٹا، جو لاہور یونیورسٹی کا انڈر گریجویٹ تھا، میرے پاس یہ کہنے کے لیے آ گیا کہ وہ کیمبرج جانے سے پہلے انگریزی پڑھنا چاہتا ہے۔ جب مجھے پتہ چلا کہ وہ تیرنا نہیں جانتا، میں نے اس سے کہا جب تک کہ وہ تیراک نہ بن جائے میں اسے انگریزی نہیں پڑھاؤں گا۔ اُس نے نفی میں جواب دے کر کہا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

میں نے اس سے ایک سوال کیا کہ اگر وہ اندھیرے میں دریا کے کنارے اپنی ماں کے ساتھ چل رہا ہو اور وہ خاتون پانی میں گر جائے تو وہ کیا کرے گا؟ کیونکہ اسے تیرنا نہیں آتا۔ اس نے جواباً کہا کہ وہ ایک قلی کی خدمات حاصل کرے گا اور اسے ماں کو بچانے کی ہدایت دے گا۔ میں نے کہا اگر قلی اس وقت موجود نہ ہو تو؟ اس بات سے اُس کی دلیل ختم ہو گئی۔ بہر حال میں نے اس سے کہا کہ انگریزی سیکھنے سے پہلے اسے میرے ساتھ جھیل پر آنا ہو گا۔ ہم سائیکلوں پر چل پڑے کہ اس نے راستے میں چلا کر کہا کہ اس کی سائیکل میں پنکچر ہوا ہے لہٰذا وہ چل نہیں سکتا۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں، ہم پیدل چلیں گے۔ پھر ہم تیز تیز چلنے لگے۔ اسی دن مجھے پتہ چلا کہ اس نے سائیکل کے ٹائر میں سوئی چبھو کر اس میں چھید کیا تھا۔

اس کے بعد اس کی سائیکل میں کبھی کوئی پنکچر نہیں ہوا۔ وزیرِ اعلیٰ کے اس صاحب زادے نے نہ صرف تیرنا بلکہ کشتی کھینا بھی سیکھ لیا اور پھر اسے اُن آٹھ طلبا میں شامل کیا گیا جو جانے پہچانے تیراک بن گئے تھے۔

تیراکی کے معاملے میں ہم ابھی تک والدین کو دعویٰ اور دلیل سے ہرا نہیں سکے تھے۔ اس میں اگرچہ اب ایک سو سے لے کر ڈیڑھ سو تک اساتذہ اور طلبا حصہ لیتے ہیں۔ لیکن میں نے صرف دو بار والدین کو اپنے بچوں کو تیرتے ہوئے دیکھنے کے لیے جائے موقعہ پر آتے ہوئے دیکھا۔ ان

میں سے ایک عیسائی اور دوسرا سپاہی تھا۔ایک بذات خود آیا۔دوسرا برہمن تھا جو پانیوں کے بالکل قریب ہی رہتا تھا۔اس کا بیٹا سات میل تک تیرنے کی جدوجہد کر رہا تھا مگر وہ صرف چھ میل ہی تیر سکا۔اس وقت اس کا باپ پانی میں کود کر ایک کشتی میں سوار ہوا تا کہ بیٹے کو بحفاظت کنارے پر لائے۔باپ صرف میری طرف دیکھتا گیا اور اس نے اپنے بیٹے کی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔جب لڑکے تیراکی کے بعد اس لڑکے کو مبارک باد دے رہے تھے تو اس کا باپ میرے سامنے آیا۔پہلے اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا میرا مزاج سرتازہ ہے جس کی بنا پر یہ لمحہ اس کے لیے بھی خوش کن ہوگا۔پھر اس نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک بڑا بیٹا بھی ہے جو بے روزگار ہے۔اسے واقعی چھوٹے بیٹے نے شادمانی بخشی ہے۔دراصل اس کا سوال یہ تھا کہ کیا میں اس کے بڑے بیٹے کے لیے کسی سرکاری محکمے میں روزگار کے حصول میں اس کی مدد کر سکوں گا؟ یہاں میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ایک تیندوا اپنے جسم کے نشانات یا ایک حبشی اپنی جلد کا رنگ بدل سکے گا؟

مجھے ایک ایسے ہی باپ کی طرف سے ایک خط موصول ہوا، جس کا متن یوں ہے:

''محترم جناب والا! میں نہایت ادب اور احترام سے آپ کے حضور میں التجا کرتا ہوں کہ میرے بیٹے، سری بھان، کو جو نچلے درجے کے اسکول کا طالب علم ہے، نجومیوں نے سخت ہدایت کی ہے کہ اسے کسی بھی صورت میں کھیلوں میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ایسا انھوں نے اس کا زائچہ دیکھ کر کہا ہے۔لہٰذا میری آپ سے سودبانہ گزارش ہے کہ اسے کھیل کود سے دور ہی رکھیں جس میں کشتی رانی وغیرہ شامل ہے۔''

چوبیسواں باب

کشمیر مشن اسکول (4)

ایک ایسی ہی حقیقت کو بھی وہ لوگ غالباً تسلیم نہیں کریں گے جو کشمیریوں کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ وہ یہ کہ اگرچہ ہمارے لڑکوں نے کم از کم ایک سو لوگوں کی جان بچائی ہے، پھر بھی صرف دو افراد یا رشتہ داروں نے ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ صرف ایک شخص نے ایک لڑکے کو اس کی بہادری کے لیے انعام دینا چاہا۔ بہر حال یہ بات اب واضح ہے کہ نوجوان نسل اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی لا رہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنا بھی چاہتے ہیں اور وہ ایسا انعام کے لیے نہیں بلکہ عزت کے لیے کرتے ہیں۔

1891 کے موسم گرما میں جو زبردست دکھ مجھے ہوا، اُسے میں شاید ہی بھول سکوں۔ میری نگہداشت میں تیار ہونے پر جب میں ایک انگریزی ناؤ کو اسکول کی طرف لے گیا تاکہ لڑکوں کو اس کے کھینے والے بنا سکوں تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ میرے بارے میں ایسا سوچیں گے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ایک نچلے طبقے کا صاحب ہوں کیونکہ صرف ایک ایسا شخص ہی چپو ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ ان سبھی نے یک زبان ہو کر کہا کہ ان کا میرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں اور اس رائے میں اسکول کا عملہ بھی شامل ہوا۔

خوش قسمتی سے میرا مستحکم ارادہ اور میرا جسمانی استحکام میرے لیے نعمت ثابت ہوا اور میں نے اسی دن انگریزی چپوؤں سے ناؤ کو کھینے کی تربیت کا آغاز کیا۔ میرے لڑکے اپنے اساتذہ کی طرح یہ کام کرنے کے لیے رضامند نہیں تھے۔ دریں اثنا ایک نوجوان برطانوی افسر نے، جو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، مجھ سے کہا: ''آپ کبھی کشمیریوں کو ناؤ چلانا نہیں سکھائیں گے۔ آپ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟''۔ اُس وقت بھی لڑکے اپنے لمبے چغوں میں ملبوس تھے اور وہ ابھی ایک عجیب سی مخلوق دکھائی دے رہے تھے۔

ایک سال بعد میں نے ان چار کشتی رانوں کو چپو چلانے کی تربیت دی جو اب اچھی طرح اس کام میں دلچسپی لے رہے تھے اور انھوں نے لمبے چغے پہننے کی عادت بھی ترک کر دی تھی۔ اس موقعے پر ایک اور نوجوان افسر نے کہا: ''بے شک اب آپ انھیں انگریزی طریقے سے کشتی کھینا سکھا سکتے ہیں کیونکہ ایسا طریقہ انھیں پسند ہے لیکن انھیں ان کی مقامی کشتیوں میں کبھی نہیں بھیجنا نہ ہی انھیں عام آدمی کی طرح چپو چلانا سکھانا چاہیے''۔

چند سال بعد میں ایک کشمیری کشتی میں سوار تھا جسے پندرہ برہمن لڑکے چلا رہے تھے جن کے چپو کشمیری ساخت کے تھے۔ اُس وقت پھر ایک برطانوی افسر بولا: ''ہاں، ایسا کرنا ان کے لیے آسان ہے کیونکہ یہ ان کے اپنے ملک کا رواج ہے''۔ میں مسکرایا، کیونکہ مجھے برہمن لڑکوں کو کشتی میں اتارنے اور کشمیری چپوؤں سے اسے چلانے میں چھ سال کا عرصہ لگا تھا اور جب انھوں نے اس سرگرمی کی شروعات کیں تو انھوں نے اپنے سر کمبلوں سے چھپائے تاکہ ان کی شناخت پوشیدہ رہے اور وہ اپنے خاندانوں کے لیے ذلت کا باعث نہ بنیں۔

کہتے ہیں کہ وقت ہر چیز کو ٹھیک کرتا ہے۔ برہمن لڑکے بھی اسی طرح صحیح راہ پر آ گئے۔ پھر ہر سرما میں اسکول کی طرف کشتیوں کا ایک مقابلہ ہوتا تھا جس میں ڈیڑھ سو اساتذہ اور طلبا شریک ہوتے تھے۔ لڑکوں کا ہجوم جھیل کی طرف دو تین میل کا سفر طے کر کے ان کشتی ران لڑکوں کی اس سرگرمی کو شوق سے دیکھتا تھا۔ یہ کھیل ہمیشہ ایک جیسا ہے جس میں ایک خاص لمحے پر سیٹی بجائی جاتی ہے اور سبھی کشتیاں پانی میں ڈبوئی جاتی ہیں۔ پھر لڑکے تیرتے ہوئے ان کشتیوں کو دوبارہ پانی کی سطح پر لاتے ہیں۔ جب وہ پانی پر نمودار ہوتی ہیں تو لڑکے تیرتے ہوئے ایک ایک کر کے اپنی

کشتیوں پر سوار ہو جاتے ہیں۔ کشتی میں بھرا ہوا پانی چپوؤں سے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ لڑکے فتح کے نشان تک کشتیوں کو لے جاتے ہیں۔ جب آخری کشتی اس جگہ پہنچتی ہے تو بینڈ دو قومی ترانے بجاتا ہے۔ اس دوران لڑکے اپنے چپوؤں کو سر کی طرف اوپر اٹھا کر شاہِ برطانیہ اور مہاراجہ کے تئیں عزت کے لیے خاموش رہ کر واپس شہر کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

ان کھیلوں میں فتح یاب لڑکوں کو انعامات نہیں دیے جاتے کیونکہ ہمارے سبھی کھیل صرف توقیر کے لیے کھیلے جاتے ہیں اور جو کشتی ڈبونے کا منظر پیش کیا جاتا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ لڑکے طوفان میں تند و تیز لہروں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کریں۔ ایسے موقعوں پر جب کشتی ران کے لیے مخالف صورت حال پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے دماغ کا توازن برقرار نہ رکھ کر ڈوب بھی سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل واقعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے طلبا نے کس طرح طوفان کی باد مخالف میں معتدل مزاجی سے کام لے کر زندگیاں بچائی ہیں:

ایک امریکی خاندان، جس میں ایک مرد، اس کی بیوی، دایہ اور ایک چھوٹا بچہ شامل تھے، ایک رات اپنے کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ نصف شب کو ان کی کشتی الٹ گئی۔ یہ افرادِ خانہ اس وقت سو رہے تھے لہٰذا وہ سبھی حیران و ششدر رہ گئے۔ باپ نے چھوٹے بچے کو سنبھالا، دایہ کشتی کو ڈوبنے سے بچانے میں لگ گئی۔ وہ اس کے الٹے ہوئے کونے پر چڑھ گئی جس سے کشتی ران لٹک رہا تھا۔ بیوی کو پانی کی لہروں نے گھسیٹا اور وہ ہر حال میں جاں بحق ہوئی ہوتی اگر وہاں پر ہمارے طلبا ایک جماعت کی شکل میں موجود نہ ہوتے۔ وہ فوراً اسی خاتون کی جانب تیرنے لگے، اسے زور سے پکڑ کے رکھا، اس کے خاندان کو بھی سنبھالا اور اسے کنارے تک لے آئے۔ یہ سب کچھ دم زدن میں ہوا۔ ایسی خطرناک حالت میں کسی معتدل مزاج مددگار کی ضرورت تھی جس کا بہتر مظاہرہ ان لڑکوں نے کیا۔

کشتیوں کے کئی فوائد ہیں۔ اب شہر میں یہ رواج بھی ہے کہ بیمار طلبا کو کشتیوں میں ہی بٹھا کر ہسپتال لے جایا جاتا ہے۔ جو لڑکے اب کشتی رانی میں خاصا تجربہ حاصل کر چکے ہیں وہ ہر وقت ان کی امداد کرتے ہیں جنھیں یہ تجربہ ابھی حاصل نہیں ہوا ہے۔

کاش میں جون کے مہینے میں بعد دوپہر کا ایک واقعہ عکس بند کر لیتا۔ مجھے اجازت دیں کہ

میں یہاں یہ واقعہ بیان کروں۔

میں جھیل کے کنارے ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ میں نے موسیقی کی صدا سنی اور میں اسی طرف چل نکلا۔ میری جستجو مجھے ایک ایسی پتھریلی جگہ پر لے گئی جہاں ایک جلوس کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس کے آگے باجا اور بین بجانے والے تھے۔ اس اجتماع میں ایسے بیس لوگ تھے جن کے اعضا پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ بیمار تھے۔ اس جلوس کی رہنمائی پچاس کے قریب لڑکے کر رہے تھے جو ہسپتال میں مریضوں کی دیکھ بھال کے بعد لوٹے تھے۔ اسی جلوس میں ایک لنگڑا بھی تھا جس کے جسم پر سفید پٹیاں بندھی تھیں۔ اُسے دو لڑکے سہارا دے رہے تھے تاکہ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا سکے۔ اسی طرح ایک مضبوط جسم کا مالک ایک اپاہج کو کندھے پر اٹھائے چل رہا تھا۔ یہاں ایسے لوگ بھی تھے جن کی آنکھوں پر پٹیاں تھیں اور انھیں راستہ دکھانے میں لڑکے مدد کر رہے تھے۔ وہ ان سے دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے کہ وہ کس جگہ قدم رکھیں۔ گاؤں کے باشندے حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جن میں سے چند ایک تو ہنس بھی رہے تھے۔ کیا ان کی ہنسی غم زدگی کا ردعمل تھی یا وہ خوش تھے؟ غالباً وہ یہ منظر دیکھ کر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انھوں نے تعجب سے یہ بھی دیکھا کہ جلوس میں اگر چہ زیادہ تر لڑکے ہندو برہمن تھے لیکن وہ مسلمان بیماروں کو سہارا دے رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ زیادہ تر تماشائی اس واقعے کو کبھی بھول نہیں پائیں گے۔ کم از کم میرے ذہن پر تو اس کے نقوش ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اکثر لڑکے کیوں بیماروں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے ہیں اور جو اپنی زندگی میں خوشیاں دیکھنے کو ترستے ہیں ان میں ایک حیات بخش حرارت بھر دیتے ہیں؟ کیا انھیں اس کے لیے کوئی معاوضہ دیا جاتا ہے؟ بالکل نہیں۔ یہ سب کچھ وہ میری نظروں میں بلند مقام پانے کے لیے انجام دیتے ہیں۔

ایسی سرگرمیاں مشن اسکول کی کوششوں کا ایک لازمی جز ہیں۔ بے شک اس میں ملے جلے مقاصد بھی شامل ہوں گے لیکن جب ایسا ہو رہا ہو تو اس میں مزید بہتری لانے کی راہ خود بخود ہموار ہوگی۔

ان طلبا نے سیکھا ہے کہ جو لوگ تکلیف میں مبتلا ہوں ان کے ساتھ ہمدردی روا رکھی جائے۔ وہ اسکول کے زندہ دل ماحول اور شہر کی مردنی میں تفاوت کو محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے

اب سیکھا ہے کہ توہم پرستی، جہالت اور بے ہودہ رسوم و رواج نے ان کے جذبے کو پامال کیا تھا۔ انھیں احساس ہے کہ ان کا ملک پسماندہ ہے اور اسے رفعت بخشنے کی ضرورت ہے لہٰذا ان کا مصمم ارادہ ہے کہ وہ فرسودہ رواجوں کو بدل کر ہی دم لیں گے۔

ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہیں جو ان حالات کا جائزہ زیادہ دلچسپی سے لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ بات ذہن نشین کر لی ہے کہ صحائف کی تعلیمات کو عمل کے ذریعہ بروئے کار لانا زیادہ اہم ہے۔ حضرت عیسیٰ کی زندگی ان سے ہم کلام ہے جو ان سے وہی اپیل کرتی ہے جو وہ ہر وقت اور ہر ایسی قوم سے کرتی ہے جس کے پاس سننے کے لیے کان اور دیکھنے کے لیے آنکھیں ہوں۔

کشمیر میں وقتاً فوقتاً زبردست سیلاب آتے ہیں۔ ایسا عام طور پر زور کی بارشوں کے بعد ہوتا ہے جب برف پگھل کر دریاؤں میں طغیانی لاتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب ملک آٹھ فٹ سے دس فٹ تک پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اونچائی تک نہیں پہنچ پاتے وہ مکانوں کی چھتوں اور درختوں پر چڑھ کر مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ اس وقت مانجھیوں کی چاندی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ سیلاب زدگان کو بچانے کے لیے، بہت زیادہ رقم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس دوران کشتیوں کی قیمتیں بھی آسمان کو چھوتی ہیں۔ اسی ناخوشگوار صورت حال میں اسکول کے لڑکے سامنے آ کر اپنی بے مثال خدمت انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔

سیلاب کے دوران میں نے دیکھا کہ ایک قلی رات بھر ایک درخت پر چڑھا ہوا کھڑا تھا اور نیچے ایک مانجھی اس سے ایک موٹی رقم مانگ رہا تھا تا کہ وہ اسے گھر پہنچائے۔ اس کے برعکس اسکول کی ایک ناؤ وہاں آ جاتی ہے اور پھنسے ہوئے شخص کو کسی رقم کے تقاضے کے بغیر اس کے گھر پہنچاتی ہے۔ مانجھی گالیاں بکتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ہمارے اسکول کی ایک ناؤ متواتر پانی میں خواتین اور بچوں کی امداد کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے جو زیادہ تر چماروں کی نزدیکی بستی میں رہتے ہیں۔ ان لڑکوں نے ان باشندوں کے گھر غائب ہوتے ہوئے دیکھے ہیں اور انھیں اب یہ خطرہ ہے کہ کہیں ان کی ساری بستی سیلاب کی لہروں کی نذر نہ ہو جائے۔ انھوں نے وقت وقت پر قریب سے گزرتی ہوئی کشتیوں کو مدد کے لیے آوازیں دی ہیں لیکن چند ایک کشتیوں میں برہمن سوار تھے جو چماروں کو اپنے نزدیک دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ دوسری کشتیاں زیادہ پیسے کمانے کی غرض سے یہ

چیخ وپکار ان سنی کر دیتی ہیں۔ اسکول کے کشتی رانوں کو ایسے مصیبت زدگان کو بچانے پر ناز ہے اگر چہ مانجھی کے سوا سبھی برہمن سواریاں ہیں۔

مدرسے کا عملہ چلتے ہوئے ایک چھوٹے سے جزیرے پر کئی عورتوں کو دیکھتا ہے۔ یہ جزیرہ رفتہ رفتہ چھوٹا ہوتا جارہا ہے۔ وہ ایک کشتی بان کو اس طرف راغب کرتے ہیں جو اپنی ناؤ کو قریب لایا ہے۔ وہ اس کی منتیں کرتے ہیں کہ وہ انھیں جزیرے پر اترنے میں مدد کریں کیونکہ خود وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ ان سے بہت زیادہ رقم طلب کرتا ہے۔ اسکول کا مدرس اُس سے کہتا ہے کہ وہ خواتین کو اپنی ناؤ میں بٹھا لے مگر وہ یہ نہیں کرتا۔ پھر مدرس تیزی سے پانی میں ڈبکی لگا کے ناؤ کے پاس پہنچتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے مدرس نے کشتی میں خواتین کو بٹھانا شروع کیا اور انھیں محفوظ جگہ پر پہنچایا۔ اس شخص نے کھیلوں میں یونہی دلچسپی نہیں لی تھی اگر چہ وہ بھی ایک برہمن تھا۔

کشتیوں کی ضرورت کو ہر وقت محسوس کیا گیا ہے اور ان کا ہونا مفید ثابت ہوا ہے۔

ایک برطانوی خاتون مصیبت میں تھی اور وہ مندرجہ ذیل معاملے میں مدد کے لیے ہمارے پاس آئی:

جس ہاؤس بوٹ میں وہ قیام پذیر تھی اس کا فرش جگہ جگہ اکھڑ چکا تھا۔ اس کی مرمت بوٹ کو کنارے پر لیے جانے کے بعد ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ اس نے بوٹ کے مالکوں سے کہا کہ اس کے لیے دریا سے باہر کسی بوٹ کا انتظام کیا جائے جس کے عوض اس سے ایک بھاری رقم مانگی گئی۔ وہ ہمارے پاس مدد کے لیے آئی تھی اور ہمارے اساتذہ اور طلبا خوشی خوشی اس کا مسئلہ حل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

ایک دن بعد دوپہر ہمارے ایک سوبڈر اساتذہ اور لڑکے دریا کے کنارے ہاؤس بوٹ کے قریب پہنچے۔ وہ اپنی جسمانی طاقت آزمانے پر تیار تھے۔ بوٹ کے نیچے لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر رکھے گیے تھے۔ جن پر پھسل کر ہاؤس بوٹ کنارے پر آ سکتا تھا۔ بوٹ کو سفیدے کے دو درختوں سے رسیوں کے ذریعہ باندھا گیا تھا۔ اسی طرح ایک مضبوط طناب کو دو چرخیوں کے درمیان گزار کر ان میں سے ایک سرا بوٹ کے ساتھ بندھا تھا اور دوسرے کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ اساتذہ اور طلبا کو ہدایت دی گئی: ''کیا تم تیار ہو تو چلو!''۔ انھوں نے اپنا سارا وزن بوٹ پر ڈالا

جس سے ایک زوردار آواز آئی۔ یہ ایک سو افراد رسی کو کھینچ رہے تھے۔ بوٹ کے مالکوں نے جو بھاری رقم طلب کی تھی وہ اس صورت حال کو دیکھ کر اسوقت کھلکھلا کر ہنس پڑے جب انھوں نے ایک سو لڑکوں اور ان کے استادوں کو زمین پر گرتے دیکھا۔ ہم نے پھر بوٹ کے ساتھ دو طنابیں باندھ لیں اور ان کے دونوں طرف پچاس پچاس افراد کو اپنی طرف کی رسی کھینچنے کو کہا۔ پھر ان سے کہا گیا چلو تو پھر ایک زور کی آواز آئی اور پھر وہ زمین پر لڑھکتے نظر آئے۔ یہ دیکھ کر تماشائی بے حد خوش ہو رہے تھے جنھوں نے اپنی خوشی کا اظہار جمائیوں اور عجیب حرکتوں سے کیا۔ رسیوں کو بل دیے گئے اور پچیس لوگ ایک ایک رسی پر تعینات کیے گیے۔ تیسری بار جب ان سے کہا گیا کہ چلو تو اس وقت ہم نے دیکھا کہ بوٹ رفتہ رفتہ شہتیروں پر کھسک کھسک کر کنارے پر آرہا تھا۔ اب ہمارے لیے خوشیاں منانے کی باری تھی۔ اسکول فتح یاب ہوا تھا اور بوٹ والے شکست کھا چکے تھے۔

سری نگر میں رہنے والوں کو آتش زنی اور سیلابوں سے جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی بات تو میں نے کی ہے لیکن ان سے بھی زیادہ ایک اور جان لیوا مصیبت ان پر نازل ہوتی رہتی ہے اور وہ ہے وبا جو ہر چار پانچ سال بعد نازل ہوجاتی ہے۔ یہ بیماری گویا شہر کو اپنے لیے تیار پاتی ہے اور اس طرح شہر باسیوں کو لقمۂ اجل بنا کر ہی چھوڑتی ہے۔ 1902 کی وبا میرے لیے اس شہر میں میرا پہلا خوفناک تجربہ تھا۔ لوگ بہت گھبرائے ہوئے تھے، دفاتر اور مدرسے بند کیے گئے تھے اور لوگ اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے رہے۔ ان کے بقول وہ موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس حالت میں وہ صرف حکیموں کی دوائی لیتے اور اولیا اور پیروں فقیروں پر بھروسہ کرتے۔ یہ پیر کاغذ کے ٹکڑوں پر کچھ تحریر کرتے جسے متاثرہ لوگوں کو پانی میں گھول کر پینا ہوتا۔ وہ کسی قسم کی احتیاط سے کام نہیں لیتے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے کوئی فائدہ ہونا بے معنی تھا۔

آپ ایک شخص کو دریا میں ایک ایسے فرد کے کپڑے دھوتے ہوئے دیکھیں گے جس کا انتقال وبا کی وجہ سے ہوا ہے اور اسی دریا میں چند قدم کے فاصلے پر کوئی اور شخص یہی پانی پیتا ہوا نظر آئے گا۔ انھیں اس بارے میں تنبیہ کرنا فضول ہے کیونکہ ایسی باتیں ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وبا خدا یا دیوتاؤں کی مرضی سے پھوٹتی ہے۔ لہٰذا پانی یا کسی اور چیز کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ شہر میں دس ہزار اموات ہوئیں اگر چہ یہ تعداد اس سے

کہیں زیادہ ہوسکتی ہے کیونکہ کئی اموات کو منظر عام پر نہیں لایا جاتا۔

مجھے یہ کہہ کر مسرت ہورہی ہے کہ اب توہم پرستی اور جہالت کی جگہ تعلیم لے رہی ہے۔ یہ تبدیلی اس حد تک عمل میں آئی ہے کہ ہمارے اساتذہ اور طلبا کو وبا سے متاثرہ اشخاص کے گھروں میں بلاکر ان سے انگریزی ادویات حاصل کی جاتی ہیں۔ اسی کے پیش نظر پچھلی وبا کے وقت ہمارے استادوں اور طالب علموں نے ان ایک سو تین مریضوں میں سے چھتّر افراد کی جانیں بچائیں جن کا انھیں علم ہوچکا تھا۔ جب بھی شہر میں کالرا کی بیماری پھیل جاتی ہے تو ہم فوراً اسکول میں دوائیوں کی بوتلیں جمع کرتے ہیں۔ اس دوران اساتذہ اور طلبا دن رات اسکول میں حاضر رہتے ہیں اور ہر طرف حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ لالٹین اور سائیکلیں تیار رکھی جاتی ہیں تاکہ کسی متاثرہ کی طرف سے اگر اطلاع ملے تو اس کی مدد کرنے میں کوئی تاخیر نہ ہو کیونکہ یہ بیماری صرف تین گھنٹوں کے اندر کسی کی جان لے سکتی ہے۔ اگر چہ بیمار عام طور پر نو سے بارہ گھنٹوں میں مرجاتا ہے۔

ہماری امدادی سرگرمی کے باوجود ہم ان لوگوں کا اعتماد فوری طور پر حاصل نہیں کرسکے۔ آپ کو یقین نہیں ہوگا کہ یہ مقصد پانے میں ہمیں سالہا سال لگ گئے۔ کئی بار والدین نے اساتذہ سے کہا کہ دوائی بیمار کو دینے سے پہلے وہ خود اسے پی کر دیکھیں۔ اس دوران ہمارے مدرس کو اتنی دوائی پینا پڑی کہ اسے خود بھی کالرا کے علاج کے لیے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ گزشتہ دو وباؤں میں ہم نے متاثروں کو صرف انار کا رس پینے کو دیا۔ یہ علاج تیر بہدف ثابت ہوا اور بیمار وبا کے دوسرے جان لیوا مرحلے میں پہنچنے سے پہلے ہی مرنے سے بچ گیا۔ مریض کے تیسرے درجے پر ہم نے اسے ہائپوڈرمک سرنج سے انجکشن دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے برخوردار وبا کو رفع کرنے کے کام میں کس قدر مصروف ہوجاتے ہیں۔

ہمارے عملے کا ایک رکن خود وبا میں مبتلا ہوا۔ لیکن اس کے والدین نے حکیم اور پیروں کو بلایا تاکہ وہ اپنا ہنر کام میں لائیں۔ بدقسمتی سے جب بیمار آخری مرحلے تک پہنچا جہاں اس کی موت یقینی تھی تبھی اس کے والدین نے ہمیں اس کی اطلاع دی۔ چونکہ ہمارے لڑکے گھروں میں تھے انھوں نے فوراً گروپوں میں بٹ کر اس کی نگہداشت شروع کی۔

دس بجے کے قریب میں وہاں گیااور دیکھا کہ ہمارے چار دوست اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر مالش کررہے تھے کیونکہ وہ اعضا کے اکڑ جانے سے زبردست تکلیف میں تھا۔اس کا یہ حال دیکھ کر میں نے تھوڑی سی برانڈی اس کے حلق میں اتاری۔ جو شخص اس کا سر پکڑے ہوئے تھااس نے میرے کان میں مجھ سے کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ میں نے سوچا کہ کمرے میں بہت سی خواتین بھی تھیں جو میرے دہاں موجود رہنے پر معترض تھیں۔لہٰذا میں باہر آیا۔

دوسری صبح وہی شخص میرے پاس یہ کہنے کو آیا کہ بیمار جاں بحق ہوا ہے۔میں نے پوچھا: ''کب؟'' اس نے کہا کہ اس نے اسی وقت آخری سانس لی جب تم نے اس کے منہ میں برانڈی ڈال دی۔ پھر میں نے اس سے سوال کہ اس نے مجھے کمرہ چھوڑنے کو کیوں کہااور اس نے مجھ سے بیمار کی موت کیوں چھپائی؟ وہ جواباً بولا: ''کیونکہ اگر کمرے میں موجود تیمار داروں کو پتہ چلتا کہ وہ مرگیا ہے تو وہ تم پر الزام لگاتے کہ تم نے اسے زہر دیا ہے۔اور یہ بھی کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ عورتوں کو اس کی موت کا علم ہو کیونکہ عورتیں دن کی روشنی میں بری خبر سہہ سکتی ہیں مگر اندھیرے میں ایسی خبر ان کے لیے جاں کاہ ہوتی ہے۔اسی لیے ہم رات بھر صبح تک لاش کی مالش کرتے رہے جب تک کہ سورج طلوع نہ ہوا۔ہم نے اسی وقت انھیں یہ خبر سنائی جسے انھوں نے قدرے کم عذاب کے ساتھ برداشت کیا''۔

ہم چند ہی لڑکوں اور اساتذہ کو کالراز دگان کے علاج کے لیے متعین کرسکتے ہیں البتہ ہم ان میں سے دوسروں کو مختلف طریقوں سے مدد کرنے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔

میں نے کہا ہے کہ جب وبا شہر پر نازل ہوتی ہے تو لوگ کس قدر ہراساں ہو جاتے ہیں۔یہ غلط ہے کیونکہ خوف وباؤں کو شہہ دیتا ہے۔لہٰذا اسکول ان کی توجہ کہیں اور پھیرنے کی کوشش میں لگتا ہے۔وہ اپنی کشتیاں جھیل سے دریا کی طرف لاتے ہیں اور پھر شہر کے اندرون کشتیوں کی دوڑ لگاتے ہیں۔اس سے بہت شور مچ جاتا ہے جس سے وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ انھیں مرنا نہیں ہے۔بے شک کئی تو مر بھی جاتے ہیں لیکن ان کی جگہیں ان سے بھر جاتی ہیں جو زندہ رہنے کے خواہاں ہیں۔لڑکے دوڑ میں محو ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ وہ اپنی توجہ موت اور چتاؤں سے ہٹا کر بھرپور زندگی کو خیالوں میں بسائیں۔اس عمل سے ہمارے لڑکے

خود بھی زندہ دل بن جاتے ہیں اور اپنے خاندانوں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔

میرا اندازہ ہے کہ میں نے پہلے ہی اپنے قارئین کو عملی تعلیم کے بارے میں تفصیلات سے تھکا دیا ہے لہٰذا میں اب اس موضوع پر مزید بات نہیں کروں گا۔

آخر پر میں اسکول کے ماٹو (نشان) پر بات کر کے اسے اختتام تک لاتا ہوں جس میں دل کی شکل کے دو چپو الٹی صورت میں دکھائے گئے ہیں اور ان کے بیچ میں یہ تحریر کندہ ہے کہ "ہر معاملے میں مردوں کی طرح عمل کرو!" یہ ماٹو حسن اور مزاح کے اس خوبصورت ملک میں بہت سے لوگوں کے لیے فیضان کا باعث بنا ہے۔

یہاں مرد سے مراد وہ شخص ہے جس نے اپنی فطرت میں قوت اور رحم دلی کو جگہ دی ہو۔ جس کا خیال اس کے عکس سے ہوتا ہے۔ چپو سخت جان کام یا طاقت کی نشان دہی کرتے ہیں اور دلوں کی شکل والے چپوؤں کے سرے ذاتی قربانی کے ترجمان ہیں اور ہر شخص کو اُس کی یاد دلاتے ہیں جس نے یہ عظیم سبق سکھایا اور جس کی صلیب اسی معنی کی حامل ہے۔ (اختتام)

''کشمیر: دھوپ اور چھاؤں میں'' مغرب کے ماہر تعلیم مسٹر سی ای ٹنڈیل بسکو کی انگریزی کتاب Kashmir : In Sunlight and Shade کا ترجمہ ہے۔

بسکو کا شمار مغرب کے ان ارباب قلم میں ہوتا ہے جنہیں کشمیر میں نہ صرف شہرت حاصل ہوئی بلکہ بے پناہ عزت ومحبت بھی ملی۔ انہیں کشمیر میں تعلیم کا ایک عظیم معمار کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ہی تعلیم کے شعبہ میں انقلاب بپا کیا اور کشمیریوں کی ناخواندگی اور پسماندگی دور کرنے کے لیے بہت سے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ مصائب ومشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے غریب کشمیریوں کے درمیان علم کا چراغ روشن کیا۔ کشمیر کی تاریخ، تہذیب وثقافت اور معاشرت پر ان کی گہری نظر تھی اس کتاب میں قدیم وجدید کشمیر کے سماجی رسومات سیاسی تعلیمی ثقافتی منظرنامہ کی بہت عمدہ اور حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے۔

کتاب کے مترجم غلام نبی خیال ایک معتبر قلمکار اور صحافی ہیں۔ ان کی تمیں سے زائد تصنیفات شائع ہوچکی ہیں۔ جن میں ساہتیہ اکادمی سے انعام یافتہ کشمیری کتاب درگاشری منار (1975) اور منظوم ترجمہ رباعیات خیام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے سر والٹر روپرٹ لارنس کی شہرہ آفاق کتاب The valley of Kashmir کا اردو ترجمہ کیا تھا جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ان کی ادارت میں انگریزی میں ہفت روزہ Voice of Kashmir گزشتہ 12 برس سے تواتر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

ISBN: 978-93-5160-091-6
9 789351 600916
NCPUL
New Delhi
₹ 132/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025